زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
اِبن الہوس
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

ابن الہوس

ایک طویل عرصے سے میں نے اپنا یہ معمول بنا رکھا ہے کہ عدالت کی سالانہ چھٹیاں میں ملک سے باہر گزارتا ہوں۔ عام طور پر میں ان دنوں یورپ یا امریکا کی طرف رخ کرتا ہوں لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔ کبھی کبھار ساؤتھ ایسٹ (سنگاپور' تھائی لینڈ یا ملائیشیا' ہانگ کانگ) کا نظارہ بھی مجھے اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ یہ مختصر تفریح نہ صرف ذہنی آسودگی مہیا کرتی ہے بلکہ نت نئے تجربات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ پورے سال کی تھکن اتارنے اور تعطیلات کا صحیح لطف اٹھانے کے لیے گوروں کے دیس انگلینڈ سے زیادہ بہتر اور کوئی غیر ملکی مقام نہیں ہے۔

ان دنوں میں اپنے انکل مرزا وارث بیگ کے پاس انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ انکل وارث لندن میں رہتے ہیں اور بیکر اسٹریٹ کے قریب ان کا ایک ذاتی ڈیپارٹمینٹل اسٹور ہے۔ وہ سن چھپن سے "یو۔ کے" میں سیٹل ہیں۔ اسٹور کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں ان کے بیٹوں کے علاوہ دو ملازم بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میری واپسی میں ایک دن باقی تھا جب انکل نے مجھ سے کہا۔

"امجد تم کل پاکستان جا رہے ہو اور میں مصروفیات کے باعث تمہیں بتا نہ سکا' آج رات ہمیں ایک ڈنر میں شرکت کرنا ہے۔" اس وقت ہم اسٹور ہی میں موجود تھے۔

"ڈنر میں شرکت!" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "یہ ڈنر کس کے اعزاز میں اور کہاں دیا جا رہا ہے؟"

"میرے ایک دوست ہیں نجم الدین باقری۔" انکل نے بتایا۔ "گزشتہ کئی سال سے لندن میں مقیم ہیں۔ ایک انگریز عورت سے انہوں نے شادی کر رکھی ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے اب تک شادی کو نبھائے ہوئے بھی ہیں۔ ہمارے ان سے فیملی ٹرمز بھی ہیں۔ یہ ڈنر وہی دے رہے ہیں۔ میں بھی ایک دوست کے طور پر مدعو ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔" ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے اضافہ کیا۔ "میں نے انہیں تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ انہوں نے تمہیں بھی انوائٹ کیا ہے۔"

یہ بات انکل نے اس لیے بھی کہی ہوگی کہ میں خود کو بن بلایا مہمان نہ سمجھوں۔ یورپ اور خصوصاً انگلینڈ میں ایٹی کیٹس اور نظم وضبط کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

میں نے کہا ”انکل! کیا آنٹی اور دیگر گھر والے بھی ہمارے ساتھ......“

”صرف ہم دونوں جائیں گے۔“ انہوں نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ”یہیں اسٹور سے ہم روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے تمہاری آنٹی کو انفارم کر دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کے یہ دوست نجم الدین صاحب کیا کرتے ہیں؟“

”ان کا رئیل اسٹیٹ کا بزنس ہے۔“

”ہمیں کہاں جانا ہوگا؟“

”رسل اسکوائر۔“ انکل نے بتایا۔ ”اور یہ سفر ہم ”انڈر گراؤنڈ“ میں کریں گے۔

”انڈر گراؤنڈ“ سے ان کی مراد وہ ”ٹیوب“ تھی جو پورے لندن میں زیر زمین دوڑتی رہتی ہے۔ اسے ٹیوب ٹرین بھی کہا جاتا ہے۔ لندن کا انڈر گراؤنڈ سسٹم سات لائنوں (بیکرلو، سنٹرل، سرکل، ڈسٹرکٹ، میٹروپولیٹن یا ”میٹرو“ ناردرن اور پکاڈلی) پر مشتمل ہے اور ان لائنوں پر دوڑنے والی ٹیوبز کو انہی لائنوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ایک دنیائے حیرت ہے۔

میں نے انکل سے پوچھا۔ ”رسل اسکوائر جانے کے لیے ہمیں کون سی ٹیوب پکڑنا ہوگی؟“

”ہم دو راستوں سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“ انکل نے بتایا۔ ”پہلے ہم بیکر اسٹریٹ سے میٹرو میں ”کنگز کراس“ جائیں اور وہاں سے پکاڈلی میں بیٹھ کر رسل اسکوائر پر اتر جائیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے اور دوسرا روٹ ہم یہ اختیار کر سکتے ہیں کہ پہلے بیکر اسٹریٹ سے ”بیکرلو“ کے ذریعے پکاڈلی سرکس پہنچیں اور پھر وہاں سے ”پکاڈلی“ میں بیٹھ کر رسل اسکوائر تک سفر کریں۔ ہم یہ آخر الذکر راستہ استعمال کریں گے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے استفسار کیا۔

”پکاڈلی سرکس پر رک کر ہم فلم دیکھیں گے۔“

”فلم!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کیونکہ فلم بینی کا مجھے کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔

”ہاں فلم۔“ انکل نے دہرایا۔ ”وہاں اوڈین سینما میں ایک بہت اچھی فلم لگی ہوئی ہے۔ کسی امریکن میئر کے قتل کی کہانی پر مبنی یہ فلم تمہارے لیے ایک وجہ سے بہت دلچسپ ثابت ہوگی۔“

”ایسی کیا بات ہے انکل؟“

”اس فلم کا زیادہ تر حصہ عدالتی کارروائی پر مشتمل ہے۔“

”اوہ آئی سی۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”اچھا پھر تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے اوڈین نام کا سینما تو ہمارے شہر کراچی میں بھی ہے!“ (شاید اب باقی نہیں رہا)“

”ارے بھئی، یہاں تو تین تین اوڈین ہیں امجد۔“ انکل نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”ہمارے پاکستان میں اکثر سینماز کے نام یہاں کے سینماز اور تھیٹرز کے نام پر ہی

رکھے گئے ہیں مثلاً ایروز، رٹز، اوڈین، پلازا، لیرک، اسکالا اور پیلس وغیرہ۔“ (اسکالا لیرک اور پیلس لندن کے معروف تھیٹرز ہیں)

میں نے پوچھا۔ ”ہماری مطلوبہ فلم کون سے ”اوڈین“ میں لگی ہے؟“

”پکاڈلی سرکس والے اوڈین میں۔“ انکل نے بتایا۔ ”دوسرے دو میں سے ایک تو چیئرنگ کراس روڈ پر لیسٹر اسکوائر میں واقع ہے اور دوسرا اوڈین سینما ماربل آرچ میں...... جہاں بے زواٹر روڈ اور آکسفورڈ اسٹریٹ آپس میں ملتی ہیں۔ ماربل آرچ کے سامنے روڈ کی دوسری جانب ہائیڈ پارک ہے۔ اگر آکسفورڈ سرکس سے ”سنٹرل“ میں بیٹھیں تو بانڈ اسٹریٹ کے بعد ماربل آرچ کا اسٹیشن آئے گا۔“

حسب پروگرام ہم بیکر اسٹریٹ سے بیکرلو میں بیٹھ کر پکاڈلی سرکس پہنچے۔ راستے میں ریجنٹس پارک اور آکسفورڈ سرکس کے اسٹیشن آئے۔ پکاڈلی سرکس سے آگے ”بیکرلو“ ٹریفالگر اسکوائر، چیئرنگ کراس اور واٹرلو سے ہوتے ہوئے اپنے آخری اسٹیشن ”ایلیفنٹ اینڈ کاسل“ تک جاتی ہے۔ چیئرنگ کراس اور واٹرلو کے درمیان یہ ٹیوب دریائے ٹیمز کے نیچے سے گزرتی ہے...... جی ہاں، نیچے سے۔

گوروں کے کارناموں پر حیرت زدہ ہونا پڑتا ہے۔ ”انڈر گراؤنڈ“ سسٹم سے بھی کہیں آگے کی چیز ”انگلش چینل ٹنل“ ہے۔ فرانس کو انگلینڈ سے ملانے والا اکتیس میل، ستر گز اور ایک فٹ طویل یہ انڈر واٹر سلسلہ انیس سو چورانوے میں وجود پایا جو کسی عجوبے سے کم نہیں۔

فلم واقعی دلچسپ اور معلوماتی تھی۔

پکاڈلی سرکس کے اسٹیشن سے ہم ”پکاڈلی“ میں سوار ہوئے جو ”لیسٹر اسکوائر“ کوینٹ گارڈن اور ہولبورن“ سے ہوتے ہوئے ہمیں رسل اسکوائر تک لے گئی جہاں انکل کے دوست نجم الدین باقری کے یہاں ہمیں ڈنر کرنا تھا۔ ہمارے علاوہ تقریباً ایک درجن مہمان وہاں موجود تھے۔

ڈنر بہت لذیذ اور مزے دار ثابت ہوا اور یہیں پر مجھے ایک کیس بھی مل گیا۔ گویا ڈنر کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔

نجم الدین باقری نے ایک پاکستانی مہمان سے بھی ہماری ملاقات کروائی۔ ان کا نام فاروق کشفی تھا اور ایک آدھ روز کے بعد وہ انگلینڈ سے امریکہ جانے والے تھے۔ پاکستان میں وہ ایک بہت بڑی شپنگ کمپنی کے مالک تھے اور ان کا بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔

کشفی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ایک وکیل ہوں تو وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگے۔ دراصل انکل وارث نے بہت کھل کھلا کر میری تعریف کر دی تھی۔ کشفی صاحب نے مجھ سے کہا۔

”برخوردار! آپ کس عدالت میں وکالت کرتے ہو؟“

وہ عمر میں مجھ سے پچیس تیس سال زیادہ تھے، اسی لیے ان کا مجھے برخوردار کہنا اچھا لگا۔ میں نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ”سٹی کورٹ میں۔“

"ویری گڈ۔" وہ زیرلب مسکرائے۔ "ینگ مین پھر تو تم سے ایک کام لیا جاسکتا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ایک لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے کہا "مسٹر امجد بیگ! قتل کے ایک مقدمے میں تمہیں وکیل صفائی کی ذمے داری نبھانا ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "کشفی صاحب! میں عموماً وکیل صفائی کے طور پر ہی وکالت کرتا ہوں۔ آپ کیس کی نوعیت بتائیں۔"

انہوں نے کہا۔ "اگر تم نے یہ کیس جیت لیا تو سمجھو تم نے میرا دل جیت لیا۔ پھر میں تمہیں اپنا قانونی مشیر مقرر کردوں گا۔"

وہ بہت محبت اور شفقت سے "تم" کا صیغہ استعمال کررہے تھے' اس لیے مجھے ناگواری کا ذرا بھی احساس نہ ہوا بلکہ اپنائیت اور ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں ہر کیس جیتنے کی نیت ہی سے لیتا ہوں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی سی پوری کوشش بھی کرتا ہوں۔ آپ کیس کی تفصیلات بتائیں۔"

انہوں نے کہا۔ "کیس تو ایک معمولی سے انسان کا ہے مگر سفارش اتنی تگڑی ہے کہ میں ملزم کے لیے اچھے سے اچھا وکیل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "میری مسز کے ڈرائیور کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کے قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے۔ ظاہر ہے' ڈرائیور نے بیگم صاحبہ سے سفارش کرنے کو کہا ہوگا اور انہوں نے میرا ناطقہ بند کررکھا ہے۔ اب جو کچھ بھی کرنا ہے' مجھے ہی کرنا ہوگا اور میں اس قدر مصروف ہوں کہ تم اندازہ نہیں لگاسکتے۔ ابھی دو روز بعد میں لندن سے ایمسٹرڈیم (نیدرلینڈ) سے ہوتے ہوئے امریکہ جاؤں گا۔ مجھے وہاں سے پہلے جاپان اور پھر فلپائن و ہانگ کانگ سے ہوتے ہوئے واپس کراچی پہنچنا ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں ایک ماہ صرف ہوجائے گا کیونکہ مجھے ان ملکوں کو محض چھونے ہی نہیں جانا بلکہ وہاں بہت سے کاروباری معاملات کو بھی نمٹانا ہے۔ میں چاہتا ہوں' اس دوران میں تم وہاں کیس کو سنبھال لو۔"

"آپ کی بیگم کے ڈرائیور کا ملزم بھائی کب سے جیل میں بند ہے؟"

کشفی صاحب کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا۔

انہوں نے بتایا۔ "میرا خیال ہے چھ سات ماہ تو ہوگئے ہیں۔"

"آپ نے پہلے کوئی وکیل نہیں کیا؟"

"کیا تھا مگر وہ بہت بودا ثابت ہوا ہے۔" کشفی صاحب نے کہا۔ "دراصل یہ معاملہ مجھ تک تو بہت بعد میں پہنچا ہے۔ پہلے بیگم صاحبہ ہی نے اس کے لیے کسی وکیل کا بندوبست کیا تھا جو اب تک محض اپنی فیس بٹورنے کے سوا کچھ نہیں کرسکا۔ بس جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ ملزم اس وقت وہاں جوڈیشل کسٹڈی میں ہے۔ ابھی تک مقدمے کی باقاعدہ سماعت بھی شروع نہیں ہوئی جو وکیل کے "بوگس اور ڈھیلا" ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"

میں نے کہا۔ "کشفی صاحب! میں جب تک خود مطمئن نہ ہوجاؤں اس وقت تک قتل کے کسی ملزم کا کیس نہیں لیتا ہوں۔ میں نے اپنے پیشے کے بارے میں کچھ اصول بنا رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہونا چاہیے کہ میں جس شخص کا مقدمہ لڑ رہا ہوں' وہ واقعی بے گناہ ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ میں دوسرے وکیلوں سے ذرا مختلف ہوں۔"

"تمہاری یہ ادا مجھے پسند آئی ہے مسٹر بیگ۔" کشفی صاحب نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ملزم نصیب خان بے قصور ہے۔ ویسے تم پہلے اپنی تسلی کرلینا۔ میں تمہاری فیس ادا کردیتا ہوں۔ تم کراچی جاکر ملزم کے بھائی افضل خان سے مل لو پھر تمام حالات سے آگاہ ہونے کے بعد اگر تم مطمئن ہوجاؤ تو چیک کیش کروالینا ورنہ میرا یہ چیک تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے پوچھا۔ "ابتدائی طور پر میں تمہیں کتنی رقم کا چیک دے دوں؟"

باقری صاحب نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ "بھئی کشفی صاحب! یہ ڈیل برطانیہ میں ہو رہی ہے اس لیے ادائیگی بھی پاؤنڈ اسٹرلنگ میں ہونی چاہیے۔"

کشفی صاحب یہ بات سنتے ہی ایک گھاگ کاروباری شخص نظر آنے لگے۔ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "کیس پاکستان میں لڑا جائے گا چنانچہ رقم کی ادائیگی وہاں کی مقامی کرنسی ہی میں مناسب ہوگی۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ انکل وارث نے کشفی صاحب سے کہا۔ "آپ ایک کامیاب بزنس مین ہیں۔"

کشفی صاحب نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے انہیں اپنی فیس اور دیگر عدالتی ابتدائی اخراجات کے بارے میں بتادیا۔ انہوں نے کل رقم کے برابر ایک چیک سائن کرکے میری جانب بڑھادیا۔ وہ ایک غیرملکی بینک کا کراس چیک تھا جس کی برانچ کراچی کے معروف کاروباری علاقے میں بھی تھی۔ مذکورہ چیک اسی برانچ کا تھا۔

میں نے چیک پر اطمینان بخش نظر ڈالنے کے بعد کشفی صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا۔ "مسٹر امجد بیگ! اب باقی کے معاملات آپ خود طے کریں گے۔ ملزم کے بھائی سے مل کر حالات و واقعات سے مکمل آگاہی حاصل کرنا اور پہلے وکیل کی چھٹی کرکے اس کی جگہ مقدمے کی پیروی کرنا آپ کے فرائض میں شامل ہے۔"

"ملزم کے بھائی افضل خان سے رابطہ کیسے ہوگا؟"

"میں اپنی بیگم صاحبہ کو فون پر مطلع کردوں گا۔" کشفی صاحب نے کہا۔ "ویسے آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔"

پھر انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دے دیا۔ وہ "سی برڈ" شپنگ کمپنی کا کارڈ تھا جس پر کشفی صاحب کے دفتر اور گھر کے تمام رابطہ نمبرز موجود تھے۔ جواباً میں نے بھی انہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔ وہ میرے کارڈ کے مندرجات کو دیکھنے کے بعد بولے۔

”میں ایسا انتظام کردوں گا کہ ملزم نصیب خان کا بھائی افضل خان خود آپ سے رابطہ کرے۔ آپ کو اس سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے کشفی صاحب سے اس کیس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن وہ اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ نصیب خان کسی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوکیدار تھا اور اس بلڈنگ میں کسی نوجوان لڑکی کا قتل ہو گیا تھا۔ قتل سے پہلے مقتولہ پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا تھا۔ پولیس نے نصیب خان کو مجرمانہ حملے اور قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ کورٹ میں نصیب خان کا وکیل اس کی ضمانت کروانے میں ناکام رہا تھا اور عدالت نے ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا تھا۔

اس سے زیادہ کشفی صاحب کو کچھ معلوم نہیں تھا اور یہ معلومات میرے لیے ناکافی تھیں لہٰذا اس وقت تک کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک افضل خان اور اس کے ملزم بھائی نصیب خان سے میری بھرپور ملاقات نہ ہو جاتی......اور میں مقدمے کی فائل کا تفصیلی جائزہ نہ لے لیتا۔

آئندہ روز میں وطن واپس آ گیا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

ایک روز میری سیکرٹری نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی کہ کوئی افضل خان مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت اپنے چیمبر میں موجود تھا۔ اس روز میرے دفتر میں کلائنٹس کا زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے سیکرٹری سے کہا کہ وہ افضل خان کو اندر بھیج دے۔ وہ ملزم نصیب خان کا بھائی تھا۔

مجھے انگلینڈ سے آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو چکا تھا۔ شاید کشفی صاحب نے تاخیر سے افضل کو فون کیا تھا یا پھر اسی نے مجھ سے رابطے میں سستی سے کام لیا تھا۔ میری توقع کے مطابق اسے بہت پہلے مجھ سے ملنے آنا چاہیے تھا۔

افضل خان کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قد اور صحت مند شخص تھا۔ اس وقت وہ پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ عام ڈرائیوروں سے خاصا مختلف اور ”معیاری“ دکھائی دیتا تھا۔ جب میں نے اس سے گفتگو شروع کی تو وہ اپنی بول چال سے بھی ایک سلجھا ہوا مرد معقول لگا۔ وہ بہت صاف لہجے میں بات کر رہا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ”افضل خان! تم نے مجھ تک پہنچنے میں اتنی دیر کیوں لگادی؟“

”جناب! یہ دیر بیگم صاحبہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ افضل خان نے بتایا۔ ”انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ آپ کے پاس آئیں گی مگر ان کو تو مصروفیت ہی بہت زیادہ ہے۔ میں نے کئی مرتبہ یاد دلایا۔ آخر آج انہوں نے کہا کہ میں خود ہی آپ سے مل لوں۔ وہ بعد میں فون پر آپ سے بات کرلیں گی۔“

اس کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے کہا۔ ”تمہاری بیگم صاحبہ سے تو ملتے ہی رہیں گے، تم

مجھے کیس کے بارے میں بتاؤ۔“

”وکیل صاحب! میرا بھائی بالکل بے گناہ ہے۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”کشفی صاحب کا بھی یہی موقف ہے لیکن عدالت زبانی کلامی باتوں کو نہیں مانتی۔ وہاں ہر بات ٹھوس ثبوت کے ساتھ ثابت کرنا ہوتی ہے۔ تمہارے پاس اپنے بھائی کی بے گناہی کے لیے کیا دلیل ہے؟“

وہ الجھ کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”افضل خان! تمہارے صاحب جی، کشفی صاحب کا دیا ہوا چیک میری دراز میں رکھا ہے۔ میں نے ابھی تک اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروایا۔ جب تک تم مجھے مکمل حالات سے آگاہ نہیں کرو گے، میں یہ کیس لینے یا چھوڑنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکوں گا۔“

اگلے ایک گھنٹے میں افضل خان نے وقفے وقفے سے مجھے جو کہانی سنائی، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تا کہ آپ پہلے اس کیس کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

نصیب خان اور افضل خان صرف دو بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور بوڑھا والد جمعہ خان سائٹ کے علاقے میں کسی فیکٹری میں چوکیدار تھا۔ افضل خان شادی شدہ اور ایک بچے صنوبر کا باپ تھا۔ وہ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت پٹیل پاڑا کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔

نصیب خان گارڈن کے علاقے میں ایک رہائشی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں چوکیداری کرتا تھا۔ مذکورہ بلڈنگ میں رات اور دن کی شفٹ کے لیے دو علیحدہ علیحدہ چوکیدار تھے۔ نصیب کی ڈیوٹی رات میں ہوتی تھی۔ شام سات بجے سے صبح سات بجے تک چوکیداروں کے لیے گراؤنڈ فلور پر ہی احاطے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جہاں وہ اپنی سہولت کو دیکھتے ہوئے تھوڑا بہت آرام کرلیتے تھے۔ اسی کمرے میں ایک جانب پانی کی موٹر بھی نصب تھی جو پوری بلڈنگ کو پانی سپلائی کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ موٹر کو چلانا اور اس کا خیال رکھنا چوکیدار کے فرائض میں شامل تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں مذکورہ بلڈنگ کے طرز تعمیر کا خاکہ بیان کردوں تا کہ بعدازاں کوئی الجھن آپ کو پریشان نہ کرے۔ یہ تفصیل نہایت اہم ہے۔

مذکورہ بلڈنگ دو بلاکس پر مشتمل تھی۔ بلاک ”اے“ اور ”بی“ ہر بلاک میں تیس فلیٹ تھے یعنی ایک فلور پر چھ فلیٹ۔ گراؤنڈ فلور کے علاوہ اس بلڈنگ کے مزید چار فلور اور تھے یعنی کل ملا کر پانچ منزلیں ہو جاتی تھیں (گراؤنڈ+فور) اس طرح دونوں بلاکس میں موجود فلیٹس کی کل تعداد ساٹھ بنتی تھی یعنی تیس+تیس۔

دونوں بلاکس کو پشت سے اس طرح ملایا گیا تھا کہ درمیان میں ایک چھوٹا سا ”ڈکٹ“ چھوڑ دیا گیا تھا تا کہ تازہ ہوا کی آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ مذکورہ ڈکٹ چھ بائی بارہ

فٹ سائز کا تھا۔ ڈکٹ کی لمبائی کے رخ یعنی ”بارہ فٹ“ والی سمت میں دونوں بلاکس کے فلیٹ نمبر دو آمنے سامنے پڑتے تھے۔ یعنی مذکورہ فلیٹس کا عقبی حصہ روبہ رو ہو جاتا تھا۔ (فلیٹ نمبر دو سے مراد ہر فلور کا فلیٹ نمبر دو ہے۔ بہ شمول گراؤنڈ مثلاً دو‘ ایک سو دو‘ دو سو دو‘ تین سو دو اور چار سو دو۔ گویا بلاک ”اے“ کے فلیٹ نمبر دو کا عقبی حصہ بلاک ”بی“ کے فلیٹ نمبر دو کے عقبی حصے کے سامنے پڑتا تھا۔ اسی طرح ایک سو دو اے‘ ایک سو دو بی کے سامنے......دو سو دو والے‘ دو سو دو بی کے سامنے...... تین سو دو اے‘ تین سو دو بی کے سامنے اور چار سو دو اے‘ چار سو دو بی کے سامنے۔ ڈکٹ کے چھ فٹ والی دونوں دیواریں چاروں فلیٹوں میں تقسیم تھیں اور ہر دیوار میں دو فلیٹوں کے باتھ روم کی کھڑکی کھلتی تھی۔ مثلاً ایک دیوار میں فلیٹ نمبر ”ایک اے“ اور ”ایک بی“ کے درمیان باتھ روم کی کھڑکیاں اور دوسری دیوار میں فلیٹ نمبر ”تین اے“ اور ”تین بی“ کے باتھ روم کی کھڑکیاں۔ اسی طرح یہ سلسلہ فورتھ فلور تک جاتا تھا۔ تاہم ڈکٹ میں داخلے کے لیے گراؤنڈ فلور پر ہی ایک جانب چھوٹا سا دروازہ بھی لگا ہوا تھا جس کا راستہ عمارت کے عقب سے تھا۔ باتھ رومز والی تمام کی تمام کھڑکیاں ایک ہی سائز یعنی ”دو ضرب ڈیڑھ فٹ“ کی تھیں اوران پر مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ ڈکٹ کی بارہ فٹ والی دیواروں میں پڑنے والے فلیٹس ”ڈیڑھ جیے“ تھے اوران کے اکلوتے کمرے کی عقبی دیوار میں ”پانچ ضرب ساڑھے تین فٹ“ کی ایک سلائیڈنگ کھڑکی موجود تھی جس پر باہر کی جانب یعنی ڈکٹ کے رخ پر مضبوط گرل لگی ہوئی تھی‘ تاہم اس گرل میں ایک دروازے والا موکھلا بھی رکھا گیا تھا جو گرل کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس موکھلے کا سائز ”ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ“ تھا۔ حسب ضرورت اسے کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا اور اس میں تالے لگانے کے لیے بکس بھی موجود تھے۔

اس قسم کے موکھلے عموماً ان کھڑکیوں کی گرل میں رکھے جاتے ہیں جو عمارت کی بیرونی سمت میں کسی گلی وغیرہ میں کھلتی ہوں تا کہ بہ وقت ضرورت اس موکھلے سے ایک رسی بندھا چھینکا نیچے لٹکا کر پھیری والوں سے مختلف اشیاء خریدی جاسکیں۔ جن اپارٹمنٹس بلڈنگ میں لفٹ سسٹم نہیں ہوتا وہاں ایسے مناظر بہت زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مگر گارڈن کے علاقے میں واقع ”نیلم آرکیڈ“ میں ہوا کی آمدوشد کے لیے موجود ڈکٹ میں کھلنے والی کھڑکیوں میں موکھلا اس لیے بنایا گیا تھا کہ کھڑکیوں کی گرل کے باہر کپڑے سکھانے والی الگنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کپڑے باہر الگنی پر ڈالنے اور اٹھانے کے لیے یہ موکھلا استعمال ہوتا تھا۔ دراصل ان تمام ڈیڑھ جیے فلیٹس کے داخلی دروازے کوریڈور میں کھلتے تھے اور درمیان میں پھنسے ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کپڑے سکھانے کو کوئی معقول جگہ نہیں تھی چنانچہ اس مقصد کے لیے ڈکٹ کو استعمال کیا جارہا تھا‘ جہاں ہوا کے ساتھ ساتھ دھوپ بھی وافر مقدار میں آتی تھی۔

ڈکٹ کے بارے میں اتنی زیادہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مقتولہ کی لاش اسی ڈکٹ میں سے ملی تھی...... اور گراؤنڈ فلور پر ڈکٹ میں آمدورفت کے لیے جو دروازہ لگا ہوا تھا‘ اس دروازے پر موجود تالے کی چابی ملزم نصیب خان کے پاس بھی تھی۔

مقتولہ کا نام فوزیہ اور عمر کم و بیش بائیس سال تھی۔ وہ ایک دھان پان لڑکی تھی۔ فوزیہ کی رہائش گلبہار میں تھی اور وہ مذکورہ اپارٹمنٹس میں‘ گھروں میں کام کرنے آتی تھی۔ فوزیہ کا والد ایک طویل عرصے سے مفلوج زندگی گزار رہا تھا اور گھر پر ہی پڑا رہتا تھا۔ اس کی والدہ بھی بنگلوں میں بطور ماسی کام کرتی تھی اور اپنی چھوٹی بیٹی نازیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ فوزیہ کا اکلوتا چھوٹا بھائی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ لوگ لیاری ندی کے کنارے ایک جھونپڑے نما مکان میں رہتے تھے۔ کہنے کو وہ علاقہ گلبہار ہی کہلاتا تھا‘ تاہم وہاں نہ تو گل نظر آتے تھے اور نہ ہی بہار۔ گل بہار بننے سے یہ پہلے گولی مار کہلاتا تھا۔

میں ابھی تک اس کیس کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا افضل خان نے بتایا تھا یعنی پچیس اکتوبر کی صبح جب ڈکٹ میں سے فوزیہ کی برہنہ لاش برآمد ہوئی تو پوری بلڈنگ میں کھلبلی مچ گئی۔ فوری طور پر پولیس کو فون کیا گیا۔ ساڑھے دس بجے پولیس موقع پر موجود تھی پھر گیارہ بجے پولیس والوں نے نصیب خان کو اس کے گھر واقع پٹیل پاڑا سے گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد وکیل صفائی کی کمزوری اور پولیس کی ہوشیاری سے معاملات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ آٹھ نو ماہ گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع نہیں ہوسکی تھی۔

افضل خان جب ادھوری معلومات مجھ تک پہنچا چکا تو میں نے کہا ”افضل خان! اس سے کام نہیں چلے گا۔ تم بتاؤ آئندہ پیشی کب ہے؟“

”بیس دن بعد۔“ اس نے حساب لگانے کے بعد بتایا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے پہلی فرصت میں نصیب خان سے ملنا ہوگا۔“

”وکیل صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں۔“ افضل نے کہا۔ ”جب چاہیں‘ جیل جا کر اس سے مل سکتے ہیں۔ ہمیں تو جیل والے کبھی ملنے نہیں دیتے اور کبھی دھتکار دیتے ہیں۔ اب تو میرے بھائی کی زندگی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

”ہر انسان کی زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے افضل خان۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور موت پر بھی صرف اسی ذات کو اختیار ہے۔ میں تو تمہارے بھائی کی رہائی کے لیے صرف جدوجہد ہی کرسکتا ہوں۔“

”وکیل صاحب! میرا بھائی بہت معصوم اور سیدھا ہے۔“ افضل نے کہا۔ ”مجھے پورا شک ...... بلکہ یقین ہے کہ اسے کسی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اپارٹمنٹس کے کسی رہائشی سے اس کی دشمنی تو نہیں تھی؟“

”وہ تو سب کا دوست ہے جناب۔“

”پھر اس کے خلاف سازش کون کرسکتا ہے؟“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے افضل خان! تم ترسوں میرے پاس آ جاؤ۔ ہم دونوں نصیب

سے ملنے جیل جائیں گے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جو حکم آپ کا وکیل صاحب!"

تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گیا۔

اسی رات میرے رہائشی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر دھیمی آواز میں "ہیلو" کہا۔ دوسری جانب کوئی خاتون تھیں۔

"کیا میں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ سے بات کر رہی ہوں۔"

"یس، دس از مجد بیگ۔"

"میں بیگم کشفی بول رہی ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "آپ کی ایفرٹس کہاں تک پہنچی ہیں؟ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

اگرچہ میں بیگم کشفی کا رخ نظر سمجھ گیا تھا، تاہم ان جان بنتے ہوئے کہا۔ "سوری، میں سمجھا نہیں آپ کن ایفرٹس کی بات کر رہی ہیں!"

"بھئی، وہ افضل خان آج آپ کے پاس نہیں گیا تھا!"

"ہاں! وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"میں اسی سلسلے میں پوچھ رہی تھی...... یعنی نصیب خان کیس کے بارے میں۔"

میں نے کہا۔ "جب تک میں جیل جا کر ملزم سے ایک بھرپور ملاقات نہ کرلوں اس وقت تک کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا۔"

"حالانکہ آپ ایڈوانس فیس لے چکے ہیں۔"

بیگم کشفی کا یہ جملہ مجھے ناگوار گزرا، تاہم میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ "بیگم کشفی! فیس تو میں ایڈوانس ہی لینے کا عادی ہوں، البتہ جہاں تک اس کیس میں پیش رفت کا سوال ہے تو کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ آٹھ ماہ گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک اس کیس کی باقاعدہ سماعت کیوں نہیں شروع ہوئی؟" ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے جواباً چوٹ کرنے والے انداز میں کہا "حالانکہ آپ ایڈوانس فیس دے چکی ہیں...... ایک وکیل صاحب کو؟"

وہ میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے مصلحت آمیز انداز میں بولی۔ "شاید آپ برا مان گئے ہیں۔ میں تو بس ویسے ہی معلوم کر رہی تھی۔"

وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی کام کا معاوضہ ادا کرنے کے بعد سامنے والے کو اپنا زرخرید غلام سمجھنے لگتی ہیں۔ شاید "وکیل اول" ان کے "معیار" پر پورا اتر رہا تھا اور ٹال مٹول اور جھوٹی تسلیوں سے اسے اب تک بہلاتا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "بیگم کشفی! آپ کے شوہر کا دیا ہوا چیک ابھی تک میری دراز میں پڑا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے واپس لے سکتی ہیں۔"

"آپ یقیناً ناراض ہو گئے ہیں۔" اس کے لہجے میں چہک تھی۔

"آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔"

"چلیں جانے دیں۔" بیگم کشفی نے خوش دلی سے کہا۔ "کل دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں پھر باتیں ہوں گی۔"

"سوری بیگم کشفی! میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کل کے دن میں بہت مصروف ہوں۔ آپ کی دعوت ادھار رہی۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔ پھر پوچھا۔ "آپ نصیب خان کا کیس تو ہینڈل کر رہے ہیں نا؟"

"دو روز بعد میں آپ کے سوال کا جواب دے سکوں گا۔"

"یعنی؟"

"مطلب یہ کہ ملزم نصیب خان سے ملاقات کے بعد۔"

"آل رائٹ۔" ایئر پیس میں بیگم کشفی کی سریلی آواز سنائی دی۔ "مجھے تابندہ کشفی کہتے ہیں۔ میں دو روز بعد آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔"

میں نے "اللہ حافظ" کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

بیگم تابندہ کشفی، مجھے عجیب سی عورت لگی تھی۔ پل پل میں رنگ بدلنے والی۔ ابھی میں اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا پہلی مرتبہ ٹیلی فونک رابطہ ہوا تھا۔ ممکن ہے، بالمشافہ ملاقات پر اس کے بارے میں میرا تاثر تبدیل ہو جاتا۔

دو روز بعد حسب وعدہ افضل خان میرے دفتر آ گیا پھر میں اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں نصیب خان سے ملنے جیل گیا۔ راستے میں افضل خان نے مجھے بتایا کہ وہ عرصہ دس سال سے بیگم کشفی کی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ فاروق کشفی کا ڈرائیور علیحدہ تھا۔ افضل کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بیگم کشفی دل کی بہت اچھی تھی، تاہم بظاہر وہ سخت گیر اور حاکمانہ مزاج رکھنے والی عورت تھی۔ یہ بات افضل مجھے نہ بھی بتاتا تو میں اس کا اندازہ لگا چکا تھا۔ افضل اپنی مالکن کا بہت شکر گزار تھا کہ اس کے کہنے پر کشفی صاحب نے اس کے بھائی کے کیس کے لیے ایک مہنگا وکیل کیا تھا۔ وہ بار بار مجھے بھی احسان مند نظر سے دیکھ رہا تھا۔

اس روز جیل میں نصیب خان سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ نصیب کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس اور پچیس سال کے درمیان لگایا۔ اس کے چہرے پر داڑھی نظر آ رہی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ داڑھی اس نے جیل میں قیام کے دوران میں ہی رکھ لی تھی۔

پہلی نگاہ میں نصیب خان مجھے خاصا مطمئن نظر آیا۔ اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کسی قتل کا ملزم جیل میں اتنا پرسکون اور بے فکر نظر نہیں آ سکتا بلکہ میں نے تو اس قسم کے لوگوں کو اکثر اداس اور مایوس ہی دیکھا ہے۔ بعد ازاں مجھے اس کے اطمینان اور سکون کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

میرے ایک نہایت ہی اہم سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

"وکیل صاحب! میں اور میرا خدا یہ بات جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔" اس نے امید بھری نگاہ سے آسمان کی طرف دیکھا۔ "پھر ڈر اور خوف کس بات کا؟" میں نے تو اپنا معاملہ کلی طور پر اپنے خدا پر چھوڑ دیا ہے اور میرا یہ ایمان ہے کہ کشفی صاحب نے جو آپ کو میرا وکیل مقرر کیا ہے تو اس میں بھی میرے خدا ہی کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ دیارِ غیر میں کشفی صاحب سے میری ملاقات خالی از مقصد نہیں ہوسکتی تھی۔ یقیناً اس میں قدرت کا کوئی راز پنہاں تھا۔

میں نے رشک بھری نظر سے نصیب خان کو دیکھا اور کہا۔ "اگر تم بے گناہ ہو تو خدا ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ تم مجھے شروع سے لے کر آخر تک کے واقعات تفصیلاً بتاؤ۔"

وہ دو گھنٹے تک میرے مختلف سوالات کے جوابات دیتا رہا اور بہت سی غیر واضح باتوں کی وضاحت کرتا رہا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں نے وکالت نامہ اس کے سامنے رکھا اور دستخط کے لیے اپنا قلم اس کی جانب بڑھا دیا۔

نصیب خان نے بائیں ہاتھ سے مطلوبہ مقام پر دستخط کر دیے۔ اس سے گفتگو کے دوران میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے مڈل تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ بھی اپنے بڑے بھائی افضل خان کی طرح بالکل صاف لہجے میں بات کرتا تھا۔ مجھے وہ ایک سلجھا ہوا شخص لگا۔

نصیب خان سے مجھے جو اہم باتیں معلوم ہوئیں، میں سر دست ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں، مناسب موقع پر آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ بہت سے کام میں نے افضل خان کے ذمے بھی لگا دیے تھے۔ خصوصاً "نیلم آرکیڈ" کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، نصیب خان کے ان دوستوں سے ملنا جو اس کیس میں معاون ہو سکتے تھے اور مقتولہ فوزیہ کے بارے معلومات جمع کرنا۔

آئندہ روز میں نے رسل اسکوائر کے ڈنر میں فاروق کشفی سے وصول کردہ "کراس چیک" اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا اور پوری تندہی سے اس کیس کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

☆☆.........☆☆.........☆☆

منظر پیش کورٹ کے ایک کمرے کا تھا!

جج نے پیش کار کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "بھئی! اس مقدمے کا وکیل صفائی کہاں ہے۔ خواہ مخواہ اس کیس کو لٹکایا کیوں جا رہا ہے؟"

"سر! وکیل صفائی تبدیل ہو گیا ہے۔" پیش کار نے جج کو مطلع کیا۔

"کیا مطلب!" جج کی خفگی بدستور قائم تھی۔ "رفیق سومرو کہاں گیا؟"

رفیق سومرو اس وکیل کا نام تھا جو اب تک اس کیس کو "ڈیل" کر رہا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک نالائق اور نکما وکیل تھا جس نے شاید ہی آج تک کوئی کیس جیتا ہو۔ جب اسے افضل خان نے بتایا کہ اب اس کیس کی پیروی میں کروں گا تو وہ بہ خوشی دست بردار ہونے پر

تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی حیل و حجت سے کام لیتا تو یہ اسی کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وہ میری شہرت اور مقبولیت سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ رفیق سومرو جیسے "فنکار" وکیل آپ کو عدالت کے برآمدے میں آتے جاتے مل جائیں گے جو سوچے سمجھے بغیر ہر قسم کا کیس لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ شکار پھانسنے کے لیے اپنی فیس میں ہر ممکنہ حد تک کمی کرنے پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں، اس لیے بھی سیدھے سادے افراد ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ ایسے وکلاء سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

پیش کار نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے جج کے سوال کا جواب دیا۔ "سر! اب اس کیس کو بیگ صاحب ڈیل کریں گے۔ انہوں نے اپنا وکالت نامہ داخل کر دیا ہے۔"

جج نے اطمینان بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "جناب عالی! مجھے دو روز پہلے ہی کیس کی فائل ملی ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے کیس کی اسٹڈی کے لیے کچھ مہلت دی جائے۔"

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

میں نے اس مدت میں بڑے بھرپور انداز میں کیس کا مطالعہ کیا اور اپنے لیے ایک لائن آف ایکشن تیار کر لی۔ آئندہ پیشی کا احوال بیان کرنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور پولیس کے چالان کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتولہ فوزیہ کی موت چوبیس اور پچیس اکتوبر کی درمیانی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہونا بتایا گیا تھا۔ رپورٹ میں یہ بات بڑی وضاحت سے لکھی ہوئی تھی کہ مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ مقتولہ کی گردن پر دائیں جانب کان سے ذرا نیچے انگوٹھے کے دباؤ کے آثار پائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں مقتولہ کی گردن کے نیچے دانت سے کاٹنے کے متعدد نشانات بھی موجود تھے۔ مقتولہ کا سر پاش پاش ہو چکا تھا۔ گردن اور کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ دائیں بازو اور بائیں ٹانگ کی ہڈیاں بھی سلامت نہیں بچی تھیں۔ سب سے قابل ذکر بات یہ تھی کہ موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے مقتولہ پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا تھا اور یہ حملہ اس پر نیم بیہوشی کی حالت میں ہوا تھا۔

پولیس نے اپنی رپورٹ میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ملزم، مقتولہ کو بری نظر سے دیکھتا تھا اور آتے جاتے گاہے بہ گاہے اس پر جملے کستا رہتا تھا۔ ایک آدھ بار تو اس نے مقتولہ کے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی جس پر مقتولہ کی ماں نے اپارٹمنٹس کے یونین انچارج سے اس کی شکایت بھی کر دی تھی۔

پولیس کے مطابق وقوعہ کے روز ملزم کسی طرح بہلا پھسلا کر مقتولہ کو اپنے کوارٹر تک لے گیا، پھر اسے بے بس کر کے اس نے اپنی ہوس کی تکمیل کی۔ بعد ازاں پکڑے جانے اور راز فاش ہونے کے خوف سے اس نے مقتولہ کی جان لے لی۔ پھر اس کی بے حرمتی کے بعد اسے برہنہ تن ڈکٹ کے اندر پھینک دیا۔ قریب ہی مقتولہ کے کپڑوں کی گٹھڑی بھی پائی گئی تھی۔

واردات کی اطلاع ملنے پر پولیس موقع پر پہنچی۔ پھر لوگوں کی فراہم شدہ معلومات کی روشنی میں نصیب خان کو اس کے گھر سے اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ سو رہا تھا۔

اس کے علاوہ بھی پولیس رپورٹ میں بہت سی باتیں تھیں جن میں قارئین کے لیے دلچسپی نہیں ہے' اس لیے میں ان کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

استغاثہ کی جانب سے دس گواہوں کی فہرست دائر کردی گئی تھی۔ میں عدالتی کارروائی کے دوران میں صرف اہم گواہوں اور اپنی جرح کا احوال بیان کروں گا۔ استغاثہ میں بعض باتیں ایسی تھیں جو بظاہر میرے موکل کے خلاف جاتی تھیں' تاہم ان کی گہرائی میں مجھے نصیب خان کی موافقت نظر آرہی تھی۔ بس ذرا محنت کی ضرورت تھی اور وہ میں کررہا تھا۔

آئندہ پیشی پر میں نے اپنے موکل کی درخواست ضمانت دائر کردی۔ جج پہلے ہی اس مقدمے سے خاصا برہم ہو چکا تھا۔ پھر قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں میرے موکل پر مجرمانہ حملے کا بھی الزام تھا لہٰذا......درخواست ضمانت رد ہوگئی۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے دی اور وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ آئندہ پیشی پر گواہوں کے بیانات اور جرح کا سلسلہ ضرور شروع ہوجانا چاہیے۔

میں افضل خان کے ساتھ عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو اس نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! میں ایک خاص بات نوٹ کررہا ہوں۔''

''وہ کیا افضل خان؟''

''جب سے آپ نے یہ کیس لیا ہے' وکیل استغاثہ مجھے خاصا پریشان دکھائی دے رہا ہے۔'' افضل خان نے بتایا۔

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔ ممکن ہے' یہ تمہارا وہم ہو۔''

''ہوسکتا ہے۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''افضل خان! تمہاری بیگم صاحبہ کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہیں جناب۔''

''کیس کے بارے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی؟''

''وہ اکثر پوچھتی رہتی ہیں لیکن میں نے انہیں پکی تسلی دے دی ہے کہ ہم یہ کیس جیت جائیں گے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے' اس کیس پر ہماری گرفت مضبوط ہے نا؟''

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو ڈول ڈالا ہے خان صاحب۔ دیکھتے جائیں' آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ ویسے ایک بات کی میں تعریف کروں گا' تم نے میری مرضی کے مطابق تمام اہم اور ضروری معلومات مجھے فراہم کردی ہیں۔ تم پوری سرگرمی سے اس سلسلے میں میری

مدد کررہے ہو۔''

''نصیب خان میرا اکلوتا بھائی ہے وکیل صاحب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں اس کے لیے اپنی جان تک بھی دے سکتا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے اس کے برادرانہ جذبے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ تمہارا بھائی باعزت بری ہوجائے گا۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔'' وہ دعائیہ لہجے میں بولا۔ پھر پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو اور رقم کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا' وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ بات بیگم صاحبہ نے پوچھی تھی۔ وہ اس معاملے میں پوری دلچسپی لے رہی ہیں۔''

''تم اس حوالے سے خوش قسمت ہو افضل خان کہ تمہیں بہت ہمدرد اور نیک فطرت 'صاحب اور بیگم صاحبہ' ملے ہیں ورنہ آج کل کون اپنے ملازموں کا اتنا خیال رکھتا ہے۔''

''واقعی وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔'' وہ تعریفی لہجے میں بولا۔ پھر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سلسلے میں بے فکر ہوجاؤ۔ جب بھی اور جتنی بھی رقم کی ضرورت پیش آئے گی' میں تمہیں بتادوں گا...... اور تمہارے ہاتھ ہی سے دلواؤں گا۔''

وہ مطمئن ہوکر رخصت ہوگیا۔ میں پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی میں ابھی دس دن کا وقت باقی تھا۔ اس عرصے کے دوران میں' میں مزید تیاری کرسکتا تھا۔ ویسے میں نے اب تک ایک مخصوص لائحہ عمل تیار کرلیا تھا۔ بس فائنل ٹچنگ کا کام باقی تھا۔

☆......☆......☆

استغاثہ کا پہلا گواہ مقتولہ کی والدہ سلطانہ بیگم تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ ''میں مسماۃ سلطانہ بیگم زوجہ فرید حسین' ساکن گل بہار' ضلع کراچی...... پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ بیان دیتی ہوں کہ میری معصوم بچی کا قاتل یہی شخص ہے۔'' اس نے انگلی سے کٹہرے میں کھڑے ہوئے میرے موکل کی جانب اشارہ کیا اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اس نامراد نے چہرے پر داڑھی سجا کر خود کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرنے کا ایک نیا ناٹک شروع کیا ہے' لہٰذا اس کی ظاہری صورت پر توجہ نہ دی جائے اور اس بدباطن شخص کو جلد از جلد پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔''

"یہی وہ بدبخت ہے جس نے جانے کیسے میری پھول سی بچی کو بہلا پھسلا کر اپنے کوارٹر تک پہنچایا اور پھر......" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ "میری بچی کی عزت کا لٹیرا اور اس کا قاتل یہی شخص ہے۔ کاش میں اس کی ابتدائی حرکتوں سے ہی کان پکڑ لیتی اور اپنی بچی کو کام سے ہٹا دیتی......اسے اس بلڈنگ تک جانے بھی نہ دیتی مگر یہ داغ تو میری قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔ ہائے میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میں برباد ہو گئی......"

سلطانہ بیگم کا بیان خاصا رقت انگیز اور متاثر کن تھا۔ اس نے جذبات کی رو میں اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں لیکن انہیں غیر ضروری سمجھتے ہوئے یہاں بیان نہیں کیا جا رہا۔

سلطانہ بیگم بیان ریکارڈ کرا چکی تو وکیل استغاثہ سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"سلطانہ صاحبہ! آپ نے اپنے بیان میں ذکر کیا ہے کہ ملزم اکثر و بیشتر آپ کی بیٹی پر جملے کستا رہتا تھا؟"

سلطانہ نے ملزم کی "ابتدائی حرکتوں" کے ذیل میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ ملزم مقتولہ کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ وکیل استغاثہ کا اشارہ اسی جانب تھا۔

سلطانہ نے جواب دیا۔ "جی! وہ فوزیہ کو آتے جاتے' کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا۔ بیہودہ اور فضول باتیں۔"

"آپ ان بیہودہ اور فضول باتوں کی وضاحت کریں گی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ ضروری ہے؟"

جج نے کہا۔ "بی بی! یہ عدالت کا کمرہ ہے۔ تمہیں وکیل استغاثہ کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ یہ تمہاری حمایت ہی میں مقدمہ لڑ رہے ہیں۔"

سلطانہ نے بتایا۔ "وہ فوزیہ سے کہتا تھا کہ وہ اسے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"اور؟" وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

"اور یہ کہ وہ فوزیہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔" سلطانہ نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "اس کے علاوہ؟"

"وہ فوزیہ کی جانب معنی خیز نظر سے دیکھتا تھا۔"

"بولتی جائیں۔" وکیل استغاثہ نے اس کی ہمت بندھائی۔

"اور جب بھی فوزیہ اس کے پاس سے گزرتی' یہ اس کی طرف دیکھ کر لوفرانہ انداز میں مسکراتا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا کیا اس سلسلے میں؟"

"میں نے یونین انچارج سے اس کی شکایت کی تھی۔"

"اس شکایت کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

"وقتی طور پر بلا ٹل گئی۔"

"وقتی طور پر آپ کی کیا مراد ہے؟"

سلطانہ نے جواب دیا۔ "ملزم نے فوزیہ سے زبانی چھیڑ چھاڑ ختم کر دی تھی لیکن......"

"لیکن کیا؟" وکیل استغاثہ نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔ "آپ کھل کر بتائیں۔ زبانی چھیڑ چھاڑ کو ترک کر کے ملزم نے کون سا وتیرہ اپنایا تھا؟"

"وہ بس نظر ہی نظر میں میری بچی کو گھورتا رہتا تھا۔" سلطانہ نے کہا۔ "کچا چبا جانے والی نظر سے......اس کی آنکھوں میں ایک دھمکی ہوتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر......پھر اس نے اپنی پوشیدہ دھمکی پر عمل کر ڈالا۔" وہ سسکی بھرتے ہوئے بولی۔ "اس شیطان نے میری بچی کو برباد کر دیا۔ ہائے میری فوزیہ......" وہ کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے کراہی۔

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ نظر سے میری جانب دیکھا اور اپنی جرح ختم کرنے کے بعد مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

وکیل استغاثہ کے بعد معزز عدالت کی اجازت سے میں جرح کے لیے گواہ سلطانہ بیگم کے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمدردی آمیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سلطانہ صاحبہ! آپ کی بچی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا' مجھے اس کا دلی صدمہ ہے لیکن میں اپنی ذمے داری کو نبھاتے ہوئے آپ سے سوالات کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر آپ کو میری کوئی بات تلخ یا ناگوار گزرے تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ عجیب سی خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پہلا سوال کیا۔

"سلطانہ بیگم! آپ نے معزز عدالت کو جو بیان دیا ہے اس میں ملزم کی "ابتدائی حرکتوں" کا بھی خاصا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں ان حرکتوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا؟"

وکیل استغاثہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ سلطانہ بیگم بھی میرا سوال سن کر الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے بس اتنا نکلا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی!"

میں نے کوئی پیچیدہ سوال نہیں کیا تھا' تاہم سوال کا انداز خاصا گھماؤ دار تھا' شاید اسی لیے سلطانہ بیگم الجھ کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلتے ہوئے کہا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں' آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ میرا موکل آپ کی بیٹی سے کچھ نازیبا حرکات کا مرتکب ہو رہا تھا؟"

وکیل استغاثہ بیچ میں کود پڑا۔ "یور آنر! وکیل مخالف کا سوال بے معنی ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی

پوچھنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے، گواہ کو یہ بات مقتولہ ہی نے بتائی ہوگی۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میرے فاضل دوست! پہلی بات تو یہ کہ میرا سوال بے معنی نہیں ہے۔ اس کے واضح معنی ہیں جو میرے اور آپ کے علاوہ معزز عدالت اور اس کے کمرے میں موجود تمام سامعین بہ خوبی جانتے ہیں۔ آپ کا دوسرا اعتراض کہ...... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے کا جواب یہ ہے کہ...... ہاں، یہ پوچھنے کی بات ہے پھر آپ کا اظہار خیال کہ...... ظاہر ہے، گواہ کو یہ بات مقتولہ ہی نے بتائی ہوگی...... بھی بے محل ہے کیونکہ آپ کو اظہار خیال کرنے کو نہیں کہا گیا تھا۔ میں نے گواہ سے ایک سیدھا سادہ سوال کیا تھا جس کا جواب گواہ ہی کو دینا چاہیے۔" پھر میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایم آئی رائٹ سر؟"

جج نے وکیل استغاثہ کو مداخلت بے جا سے باز رہنے کی تاکید کرنے کے بعد کٹہرے میں کھڑی سلطانہ بیگم سے کہا۔ "بی بی! آپ وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیں۔"

سلطانہ نے کہا۔ "مجھے یہ بات فوزیہ نے بتائی تھی۔"

"کیا فوزیہ نے سرسری ساذکر کیا تھا یا وہ ملزم کی ان حرکات پر برہم بھی تھی؟"

"وہ بہت ناراض تھی۔"

"مقتولہ نے آپ سے اس قسم کی شکایت کتنی مرتبہ کی تھی؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تین یا چار مرتبہ۔"

"آپ نے اس مسئلے کے سلسلے میں کیا قدم اٹھایا تھا؟"

"میں نے بلڈنگ کے یونین انچارج سے ملزم کی شکایت کی تھی۔" سلطانہ نے بتایا۔

میں نے کہا۔ "اور آپ کے بیان کے مطابق یونین انچارج نے ملزم کو سمجھایا تھا لیکن اس سمجھانے کا اس پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اب اس کی چھیڑ چھاڑ کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔"

"جی بالکل...... بالکل۔"

"اس کے باوجود بھی آپ اپنی بیٹی کو وہاں بھیجتی رہیں؟"

"کیا کریں، یہ ہمارا ذریعہ روزگار ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "کام نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟"

میں نے کہا۔ "کیا یہ ضروری تھا کہ مقتولہ اسی بلڈنگ میں کام کرتی رہتی۔ اسے اور کہیں بھی کام مل سکتا تھا؟"

"یہ آپ کتنی آسانی سے کہہ رہے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "آپ سوٹ بوٹ والوں کو ہم غریبوں کی مشکلات کا کیا اندازہ۔ ہم پتا نہیں کس کس طرح کام حاصل کرتے ہیں۔ فوزیہ کو اس بلڈنگ میں آٹھ دس گھر ملے ہوئے تھے۔"

میں نے سوال کیا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ بھی گھروں میں کام کرتی ہیں۔ کیا وہ بھی کوئی اپارٹمنٹس بلڈنگ ہے۔"

"نہیں میں بنگلوں میں کام کرتی ہوں۔" سلطانہ نے بتایا۔ "وہاں پیسے اچھے مل جاتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ چھوٹی بیٹی پندرہ سالہ نازیہ کو بھی لے جاتی ہوں۔"

"آپ نے مقتولہ کو اپنے ساتھ کام پر کیوں نہیں لگا رکھا تھا۔" میں نے پوچھا۔ "جبکہ وہاں پیسے زیادہ اچھے مل جاتے ہیں، بقول آپ کے؟"

"وہاں اگر پیسے زیادہ ملتے ہیں تو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "جبکہ فوزیہ "نیلم آرکیڈ" میں صرف چار گھنٹے کے لیے جاتی تھی اور کم وبیش دس گھر اس نے سنبھال رکھے تھے۔ وہ آدھے گھنٹے میں ایک گھر کو نمٹا دیتی تھی جبکہ میں صبح کی گئی شام کو ہی لوٹتی تھی۔ صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک مجھے مختلف بنگلوں میں کام کرنا پڑتا ہے جہاں نازیہ برابر میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مقتولہ نیلم آرکیڈ میں کام کرنے کتنے بجے جاتی تھی؟"

"دوپہر دو بجے تقریباً۔"

"وہاں اس کے کام کی نوعیت کیا تھی؟"

"کپڑے دھونا، برتن دھونا اور جھاڑو پونچھا۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ تینوں الگ الگ کام ہیں۔ بعض لوگ صرف ایک ہی کام کرواتے ہیں اور بعض ایک سے زیادہ، دو یا تین۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ نے بتایا تھا کہ مقتولہ صرف چار گھنٹے کے لیے نیلم آرکیڈ میں جاتی تھی، اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ چھ بجے تک وہاں سے فارغ ہو جاتی ہوگی۔"

"جی ہاں، کم وبیش چھ بجے۔"

"وہ گھر کتنے بجے پہنچتی تھی؟"

"ساڑھے چھ یا پونے سات بجے۔"

"اور آپ کی واپسی کا کیا وقت ہے؟"

"لگ بھگ یہی وقت ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وقوعہ کے روز جب مقتولہ اپنے معمول کے وقت پر گھر نہیں پہنچی تو آپ نے کیا کیا؟"

"فوری طور پر تو ہم پریشان ہو گئے تھے۔"

"پریشان ہونے کے بعد آپ نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے ساڑھے سات بجے تک فوزیہ کا انتظار کیا تھا۔" سلطانہ بیگم نے بتایا۔ "کیونکہ گھنٹے آدھے گھنٹے کی دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے لیکن جب وہ ساڑھے سات بجے تک بھی نہیں آئی تو میری تشویش بڑھنے لگی۔ فوزیہ کے والد ایک طویل عرصے سے اپاہجی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ فرید حسین کو پانچ سال قبل فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان ہو چکا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں خود جا کر نیلم آرکیڈ سے فوزیہ کے بارے میں معلوم کروں۔"

"پھر آپ نے نیلم آرکیڈ سے مقتولہ کا پتا کیا تھا؟"

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں' مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

''وہاں آپ نے کس سے فوزیہ کے بارے میں معلوم کیا تھا؟''

''فلیٹ نمبر تین سو پانچ اے والوں سے۔'' سلطانہ نے بتایا۔ ''وہاں سبحان صاحب اور عشرت جہاں رہتے ہیں۔''

''ان سے پوچھنے کی کوئی خاص وجہ؟''

''وہ آخری گھر ہے جہاں فوزیہ کام کرتی تھی۔'' وہ بولی۔ ''وہاں سے کام ختم کر کے وہ سیدھی گھر آتی تھی۔''

''تین سو پانچ اے والوں نے آپ کو کیا بتایا تھا؟''

''انہوں نے بتایا کہ فوزیہ ٹھیک چھ بجے ان کے گھر سے نکل گئی تھی۔''

''اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟''

''میں سیدھی گھر آگئی۔''

''آپ نے بیگم آرکیڈ میں اور کسی سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''مثلاً یونین انچارج وغیرہ سے۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''اس وقت یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔'' سلطانہ نے کہا۔ ''شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ فوزیہ عبدالرزاق صاحب کے ہاں کام نہیں کرتی تھی۔''

''کون عبدالرزاق صاحب؟''

''میں یونین انچارج عبدالرزاق کا ذکر کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تو تین سو پانچ اے والوں نے جب آپ کو یہ بتایا کہ مقتولہ حسب معمول کام ختم کر کے گھر جا چکی ہے تو آپ نیلم آرکیڈ سے سیدھی اپنے گھر آگئیں؟''

''جی ہاں' میں نے ایسا ہی کیا تھا۔''

''حالانکہ آپ کو اسی وقت پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے تھی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''بس جی ہم غریب لوگ ہیں اس لیے غلطی ہوگئی۔''

''غریب اور غلطی میں کیا قدر مشترک ہے؟'' میں نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔

وہ بولی۔ ''غریب آدمی پولیس سے ڈرتا ہے بلکہ یوں کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ پولیس صرف غریبوں کو ہی ڈراتی ہے۔ یہ دولت مندوں کے منہ نہیں لگتی کیونکہ وہ بہت بااختیار ہوتے ہیں' بڑے بڑے پولیس افسروں کے تبادلے کروا دیتے ہیں۔ ہم بھی اس ڈر سے پولیس کے پاس نہیں

گئے کہ وہ الٹا ہمیں پریشان کریں گے۔ آج کل یہی ہو رہا ہے وکیل صاحب' آپ مانیں یا نہ مانیں۔''

میں نے طنزیہ نظر سے اس کیس کے انکوائری افسر کو دیکھا اور سلطانہ بیگم سے کہا۔ ''سلطانہ صاحبہ! اگر آپ بروقت اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کروا دیتیں تو ممکن ہے' اسے وہ اندوہناک حادثہ پیش نہ آتا۔''

''بس جی' جو غلطی ہونا تھی' ہوگئی۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی۔ ''اب کیا کیا جاسکتا ہے!''

میں نے پوچھا۔ ''سلطانہ صاحبہ! ذرا سوچ کر بتائیں' جب آپ نیلم آرکیڈ میں مقتولہ کو تلاش کرنے گئی تھیں' اس وقت ملزم اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا؟''

''میں نے غور نہیں کیا۔ اس وقت میں بہت پریشان تھی۔''

''اور جب آپ نیلم آرکیڈ سے واپس جا رہی تھیں تو؟''

''اس وقت تو میں اور بھی زیادہ پریشان تھی۔''

''اس لیے آپ کو یاد نہیں یا آپ نے خیال نہیں کیا کہ ملزم اس وقت اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا یا نہیں؟''

''جی' بالکل یہی بات ہے۔''

''دیٹس آل یور آنر۔'' میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اگلا گواہ نیلم آرکیڈ کا یونین انچارج عبدالرزاق تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان نوٹ کرایا۔ ''میں مسمی عبدالرزاق ولد عبدالغفار ساکن نیلم آرکیڈ فلیٹ نمبر ایک سو ایک' کراچی بلاجبر و اکراہ یہ بیان دیتا ہوں کہ......''

یونین انچارج کے بیان میں کوئی خاص بات نہیں تھی' تاہم میں یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ استغاثہ نے اسے گواہوں کی فہرست میں کیوں شامل کیا تھا۔ لیں' آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔ وکیل استغاثہ کی جرح آپ پر سب کچھ واضح کردے گی۔

یونین انچارج کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے ایک دو سوالات میں اپنی جرح ختم کردی۔ مثلاً اس نے گواہ سے پوچھا۔

''عبدالرزاق صاحب! اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔ ملزم کے سلسلے میں آپ کے پاس کوئی شکایت آئی تھی...... میرا مطلب ہے' مقتولہ کے حوالے سے؟''

''جی ہاں' آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' عبدالرزاق نے جواب دیا۔ ''میں اس ضمن میں پولیس کو بھی بتا چکا ہوں اور اب ایک مرتبہ پھر دہراتا ہوں کہ مقتولہ کی والدہ نے مجھ سے ملزم کے رویے کے بارے میں شکایت کی تھی۔''

''یعنی یہ کہ ملزم مقتولہ کو بری نگاہ سے دیکھتا تھا اور آتے جاتے اسے نازیبا الفاظ کہتا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

یونین انچارج نے جواب دیا۔ ''جی ہاں' کچھ اسی نوعیت کی شکایت تھی اور میں نے ملزم کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔''

''لیکن اس کے باوجود بھی وہ باز نہیں آیا تھا؟''

''اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''مقتولہ کی والدہ کا یہی خیال ہے۔''

''ہوگا مگر میرے پاس دوبارہ کوئی شکایت نہیں آئی۔''

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کردی اور اپنی باری پر جج سے اجازت لینے کے بعد میں گواہ والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے گواہ پر جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''عبدالرزاق صاحب! آپ نے اپنے بیان میں خود کو ''نیلم آرکیڈ'' کے فلیٹ نمبر ایک سو ایک کا رہائشی بتایا ہے لیکن اس سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ آپ کا فلیٹ کون سے بلاک میں ہے۔ ''اے'' یا ''بی''؟''

''جی میں ایک سو ایک بی میں رہتا ہوں۔''

''یعنی بلاک ''بی'' فرسٹ فلور اور فلیٹ نمبر ایک؟''

''بالکل جناب۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہر فلور پر اس کے نمبر کے لحاظ سے فلیٹ نمبر کے ساتھ سینکڑوں کا اضافہ کردیا جاتا ہے مثلاً فرسٹ فلور کے فلیٹ نمبر ایک سو کے اضافے سے شروع ہوں گے۔ اسی طرح سیکنڈ فلور کے فلیٹ نمبر دو سو کے اضافے سے...... چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو کے اضافے سے مثلاً چار سو ایک' چار سو دو' چار سو تین...... وغیرہ وغیرہ۔''

''اس وضاحت کا شکریہ عبدالرزاق صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ کیا میں آپ کو یونین انچارج بھی کہہ سکتا ہوں؟''

''بالکل کہہ سکتے ہیں جناب۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''جب میں یونین انچارج ہوں اور لوگ مجھے ''یونین انچارج'' کہتے بھی ہیں تو آپ کے کہنے میں کیا حرج ہے۔''

''شکریہ یونین انچارج صاحب۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے کب سے ''نیلم آرکیڈ'' کی یونین انچارجی سنبھالی ہے۔''

''سال ہا سال سے۔'' وہ بولا۔ ''مجھ سے پہلے والد صاحب یہاں کے یونین انچارج تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''آپ کو ''نیلم آرکیڈ'' میں رہائش اختیار کیے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''جب سے اس بلڈنگ کا وجود ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم نے یہاں فلیٹ بک کرایا ہے۔ کم و بیش بیس سال پہلے۔''

''آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کہیں کونے کھدرے میں سوئے ہوئے وکیل استغاثہ کو اچانک ہوش آیا' کراری آواز میں بولا۔ ''آبجیکشن یور آنر۔ فاضل وکیل ایک غیر متعلقہ سوال کر رہے ہیں۔ گواہ کے ذریعہ معاش کا موجودہ مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! اگر گواہ کو جواب دینے میں اعتراض ہو تو میں سوال واپس لیتا ہوں۔''

جج نے سوالیہ نظر سے گواہ کو دیکھا۔ یونین انچارج نے کہا۔ ''میرے خیال میں اس سوال کا جواب دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''

وکیل استغاثہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ گواہ نے مجھے بتایا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا' تاہم اس نے محکمے کا نام ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

میں نے پوچھا۔ ''یونین انچارج صاحب! وکیل استغاثہ آپ سے' ملزم کے خلاف موصول ہونے والی شکایت کے بارے میں سوال و جواب کر چکے ہیں' میں صرف اتنا پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی نصیحت کا اس پر کیا اثر ہوا تھا؟''

''خاصا مثبت اثر ہوا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرے خیال میں ملزم ایک معقول انسان ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا کہ اس نے کبھی بھی مقتولہ سے کوئی لچر بات نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ ہاں' اس نے یہ تسلیم کیا تھا کہ مقتولہ اسے اچھی لگتی ہے' اس لیے وہ اسے دلچسپی سے دیکھتا تھا۔''

''گویا وہ پسندیدگی کی نظر سے مقتولہ کو دیکھتا تھا۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا پھر میں گواہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''یونین انچارج صاحب! ملزم آپ کی بلڈنگ میں کب سے کام کر رہا ہے؟''

''تقریباً پانچ سال سے۔''

''اس دوران میں آپ نے اسے کیسا پایا؟''

''مناسب ہی پایا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز ملزم کتنے بجے ڈیوٹی پر آیا تھا؟''

''اس کی ڈیوٹی رات سات بجے سے صبح سات بجے تک ہوتی ہے۔'' عبدالرزاق نے بتایا۔ ''وقوعہ کے روز یعنی ہفتہ چوبیس اکتوبر کو بھی وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی آیا تھا۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''یونین انچارج صاحب! چوبیس اکتوبر کو جب مقتولہ حسب معمول اپنے گھر نہیں پہنچی تو اس کی والدہ اس کو دیکھنے آپ کی بلڈنگ میں آئی تھی۔ کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟''

''نہیں جناب' میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''وہ لگ بھگ آٹھ بجے وہاں پہنچی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کا بیان ہے کہ اس نے ملزم کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔ کیا مذکورہ وقت پر ملزم بلڈنگ میں نہیں تھا؟''

''میرا خیال ہے وہ اس وقت گیٹ پر موجود تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے کم و بیش اسی وقت ملزم کو گیٹ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یونین انچارج صاحب! جس ڈکٹ میں مقتولہ کی لاش پائی گئی ہے' اس کے دروازے کی چابی ملزم کے علاوہ اور کس کس کے پاس ہوتی ہے؟''

''اس دروازے کی تین چابیاں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک میرے پاس ہوتی ہے اور باقی دو دونوں چوکیداروں کے پاس۔ میں نے چوکیداروں کو اس لیے چابیاں دے رکھی ہیں کہ اگر کسی مکین کے کپڑے یا کوئی اور چیز وہاں گر جائے تو وہ اسے واپس اس چیز کے مالک تک پہنچا سکیں۔ اس کے علاوہ ہر اتوار کی صبح ڈکٹ کی صفائی بھی کروانا ہوتی ہے۔ ویسے تو پوری بلڈنگ کو پانی کی فراہمی اور اس کی صفائی میری ذمے داری ہے۔ ہر گھر سے سویپر کچرا اٹھاتا ہے لیکن جن مکینوں کی کھڑکیاں ڈکٹ کی جانب کھلتی ہیں' وہ کچرا اٹھانے کی سہولت موجود ہونے کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ ڈکٹ میں پھینک دیتے ہیں' اس لیے ہر اتوار کو ڈکٹ کی صفائی بھی کروانا پڑتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے فلیٹ کی کھڑکی بھی ڈکٹ کی جانب کھلتی ہے؟''

مجھے اس سوال کا جواب معلوم تھا' تاہم میں اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے باتھ روم کی ایک چھوٹی کھڑکی جو وینٹی لیشن کے لیے ہے' وہ پچھلی جانب کھلتی ہے۔ پوری کھڑکیاں صرف دو نمبر فلیٹ والوں کی کھلتی ہیں۔ ہر فلور کا فلیٹ نمبر دو۔''

''شکریہ عبدالرزاق عرف یونین انچارج صاحب۔''

اس کے بعد میرے ایک دو سرسری سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ اپارٹمنٹس کے ہر رہائشی سے یونین چندے کے طور پر ایک سو روپیہ ماہانہ وصول کرتا ہے۔ دونوں چوکیداروں کو وہ دو دو ہزار تنخواہ دیتا تھا۔ سویپر کو ایک ہزار روپے۔ اس طرح ساٹھ فلیٹس سے جو چھ ہزار روپے جمع ہوتے تھے' ان میں سے پانچ ہزار تو تنخواہوں میں نکل جاتے اور باقی ایک ہزار دیگر معمولی قسم کے اخراجات کے لیے رہ جاتے تھے۔ یہ کوئی پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے۔

میں نے عبدالرزاق پر اپنی جرح ختم کی تو عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں معزز عدالت سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''یور آنر! اب تک کی جرح کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ''نیلم آرکیڈ'' میں فلیٹ نمبر ''تین سو پانچ اے'' کے رہائشی وہ افراد ہیں جنھوں نے سب سے آخر میں مقتولہ کو زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ وہ ان کے گھر سے وقوعہ کے روز ٹھیک چھ بجے شام کام ختم کر کے

رخصت ہوئی تھی...... یعنی مسٹر سبحان اور ان کی بیگم عشرت جہاں۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ ان لوگوں کو گواہی اور جرح کے لیے عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کیے جائیں بلکہ آئندہ پیشی پر انہیں بلایا جائے۔ میں ان سے بھی چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو خصوصی ہدایات دینے کے بعد اس ضمن میں انکوائری افسر اور وکیل استغاثہ کو بھی تاکید کر دی۔ اس کے بعد ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

عدالت کے برآمدے میں افضل خان نے مجھ سے کہا: ''بیگ صاحب! آپ نے مجھے جو کام بتائے تھے' وہ تو میں نے کر دیئے ہیں اب آئندہ کیا حکم ہے؟''

''اب تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بیوی کا بھی کام شروع ہو گا۔''

''میری بیوی کا؟'' اس نے الجھن آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں' تمہاری بیوی کا۔ اب وہ بھی تمہارے ساتھ میدان عمل میں اترے گی۔ ہمیں اس کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔''

''وکیل صاحب! گل ریز تو ایک مکمل گھریلو عورت ہے۔'' افضل خان نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہمارے کس کام آ سکتی ہے؟''

اس وقت میں ایک دوسری عدالت میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''میں جس قسم کی مدد چاہتا ہوں وہ کوئی گھریلو عورت ہی کر سکتی ہے۔ تم نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ تمہاری بیوی کے چند رشتے دار گل بہار میں رہتے ہیں!''

''گل بہار؟'' وہ الجھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے' گولی مار۔''

''ہاں ہاں۔'' وہ جلدی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہاں اس کا چاچا اور چاچی رہتے ہیں۔''

''بس تو پھر کام بن گیا۔'' میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بدستور الجھا ہوا تھا۔

''میں نے اس کی الجھن اور پریشانی رفع کرتے ہوئے اسے تفصیل سے سمجھایا کہ میں اس کی بیوی گل ریز سے کس نوعیت کا کام لینا چاہتا ہوں۔ پوری بات سننے کے بعد وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! قسم سے آپ تو ایک وکیل سے زیادہ کوئی جاسوس لگتے ہیں۔ بالکل جیمس بانڈ زیرو زیرو سیون۔''

میں نے کہا۔ ''افضل خان! اس دنیا میں اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے سو سو پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ یہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ”بیگ صاحب! گل ریز اپنے دیور سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ نے تو معلومات حاصل کرنے کا بہت آسان سا کام بتایا ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں‘ آپ کی مطلوبہ معلومات دو تین روز میں آپ تک پہنچ جائیں گی۔“

”مجھے تم سے یہی امید تھی افضل خان!“ میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔ ”تمہارے تعاون نے اس کیس میں پہیے لگا دیے ہیں۔“

وہ پورے وجود سے خوش ہو گیا۔ میں اس سے رخصتی مصافحہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

☆☆............☆☆............☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا!

اسی پیشی پر سب سے پہلے ”نیلم آرکیڈ“ کے سویپر (خاکروب) مائیکل کا بیان ہوا۔ اس کا بیان بہت مختصر تھا۔ مقتولہ کی لاش سب سے پہلے مائیکل ہی نے دیکھی تھی۔ وہ معمول کے مطابق اتوار کی صبح چوکیدار اسلم سے ڈکٹ کے دروازے کی چابی لے کر صفائی کی غرض سے اس طرف گیا تھا۔ محمد اسلم دن کی شفٹ کا چوکیدار تھا جو صبح سات بجے سے رات سات بجے تک ڈیوٹی دیتا تھا۔ مائیکل اتوار کے روز اپنی صفائی کا آغاز ڈکٹ ہی سے کرتا تھا‘ کیونکہ وہاں ہفتے میں صرف ایک بار صفائی کرنا ہوتی تھی۔

اتوار پچیس اکتوبر کی صبح لگ بھگ نو بجے مائیکل نے ڈکٹ کا دروازہ کھولا تو اندرونی منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر اسلم چوکیدار بھی عمارت کی عقبی سمت ڈکٹ کے دروازے کی جانب دوڑا‘ پھر تھوڑی ہی دیر بعد پوری بلڈنگ میں اس ہولناک واقعے کی خبر سنسنی بن کر پھیل چکی تھی۔

مائیکل کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد اس کی جان چھوڑ دی۔ میں اپنی باری پر آگے بڑھا اور سوالات کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”مسٹر مائیکل! آپ وہ شخص ہیں جس نے مقتولہ کی لاش کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ ذرا وضاحت سے بتائیں اس منظر نے آپ پر کیا اثر چھوڑا تھا۔“

وہ ایک جھرجھری لینے کے بعد بولا۔ ”میں آج بھی جب اس منظر کا تصور کرتا ہوں تو میرے پورے بدن میں ایک کپکپی سی سرایت کر جاتی ہے۔ میں خود کو لرزتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات تو میرے رونگٹے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اس منظر کی ہولناکی اور وحشت انگیزی کو آج تک بھول نہیں سکا ہوں حالانکہ اب تو اس واقعے کو ایک سال ہونے کو آ رہا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”مسٹر مائیکل! وقوعہ کے روز جب آپ نے صفائی کی غرض سے ڈکٹ کا دروازہ کھولا تو آپ کی آنکھوں نے کیا دیکھا؟“

”ایک ننگی لڑکی جو بے ترتیبی سے ڈکٹ کے فرش پر پڑی تھی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اس کی کھوپڑی کا کچومر نکلا ہوا تھا اور سینے پر تازہ زخموں کے نشانات تھے۔ اس کے

علاوہ بھی اس کے بدن پر چھوٹے موٹے زخم موجود تھے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ منظر دیکھتے ہی آپ چیخ اٹھے تھے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کی چیخ پر سب سے پہلے چوکیدار اسلم وہاں پہنچا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”پھر آپ دونوں نے کیا کیا؟“

”ہم بلڈنگ کے دیگر مکینوں کو مطلع کرنے دوڑ پڑے تھے۔“

”سب سے پہلے آپ نے کس کو مطلع کیا تھا؟“

اس نے بتایا ”ہمیں عمارت کے احاطے میں امتیاز شیخ مل گیا تھا۔ وہ بلاک ”اے“ میں فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہتا ہے۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا اور چوکیدار اسلم بلاک ”بی“ میں یونین انچارج کی طرف دوڑ پڑا۔“

”آپ نے امتیاز شیخ سے کیا کہا؟“

”میں نے مختصر الفاظ میں اسے ڈکٹ کی صورت حال سے آگاہ کیا۔“ مائیکل نے بتایا۔ ”وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر اپنے فلیٹ میں لے گیا اور بتایا کہ وہ قتل رات والے چوکیدار نصیب خان نے کیا ہے‘ پھر اس نے میری موجودگی ہی میں اپنے فلیٹ سے پولیس کو فون کر کے فوراً موقع واردات پر پہنچنے کی درخواست کی تھی۔“

میں نے اپنی جرح ختم کر دی۔

امتیاز شیخ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود تھا اور میری اطلاعات کے مطابق وہ استغاثہ کا سب سے اہم گواہ تھا۔ اس نے پولیس کو گواہی دیتے ہوئے یہاں تک بتایا تھا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے ملزم کو ڈکٹ میں نصف شب کے قریب کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔

اگلی گواہی دن کو شفٹ والے چوکیدار محمد اسلم کی تھی۔ اس کا بیان مائیکل کے بیان سے ملتا جلتا تھا۔ اسلم کی عمر لگ بھگ اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو میری باری آئی۔

میں نے چوکیدار اسلم سے پہلا سوال کیا۔ ”اسلم صاحب! آپ کو ”نیلم آرکیڈ“ میں نوکری کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”پورے دس سال۔“

میں نے اس سے مقتولہ کی لاش کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا‘ کیونکہ مجھے پوری امید تھی کہ اس کے جوابات مائیکل سے مختلف نہ ہوتے میں خواہ مخواہ عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسلم سے پوچھا۔

”اسلم صاحب! میری اطلاعات کے مطابق ملزم عرصہ پانچ سال سے تمہاری جوڑی میں

کام کر رہا ہے۔ ان پانچ سالوں میں تم نے اسے کیسا پایا تھا؟"

"مجھے اس سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔"

میں نے پوچھا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ ملزم مقتولہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا اور گاہے بہ گاہے اس پر آوازے کستا رہتا تھا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارا ایک ساتھ بہت کم وقت گزرتا تھا۔ میں صبح سات بجے جب آتا تھا تو وہ چھٹی کر جاتا تھا۔ اس طرح ہمیں بس پانچ دس منٹ ہی بات چیت کا موقع ملتا تھا۔ میں اس کی دیگر مصروفیات کے بارے میں تو نہیں جانتا' تاہم یہ مجھے معلوم ہے کہ ملزم مقتولہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "اسلم صاحب! کیا آپ ہمیشہ دن ہی کی شفٹ میں چوکیداری کرتے ہیں؟"

"نہیں جناب! ہماری شفٹیں بدلتی رہتی ہیں۔" اسلم نے جواب دیا۔ "وہ ایک ماہ دن کی ڈیوٹی کرتا ہے اور ایک ماہ رات کی۔"

اسلم کی وضاحت نے بہت سے الجھے ہوئے پہلو سلجھا دیئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ شفٹ تبدیل کرتے وقت تم دونوں کی پانچ دس منٹ مختصر سی بات ہو جاتی تھی۔ کیا وقوعہ کے روز بھی تمہاری ملزم سے گفتگو ہوئی تھی؟"

"جی بالکل ہوئی تھی۔"

"تم دونوں میں کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

"وہی معمول کی۔" اسلم نے کندھے اچکاتے ہوئے بتایا۔ "فلاں بلب فیوز ہو گیا ہے۔ "چار سو پانچ" والے صاحب کی گاڑی گیراج میں گئی ہوئی ہے۔ کل رات پانی نہیں آیا۔ اس لیے موٹر چلاتے وقت ٹینک میں پانی کی سطح ضرور چیک کرلوں وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے درمیان اس قسم کی باتیں اکثر ہوتی ہی رہتی تھیں۔ میں اسے پورے دن کے اہم قسم کے واقعات مختصراً بتاتا تھا اور وہ رات کے واقعات۔ جب ہماری ڈیوٹی اس کے برعکس ہوتی تھی تو واقعات کا تسلسل بھی الٹ جاتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "وقوعہ کے روز رخصت کے وقت ملزم کا روّیہ کیسا تھا؟"

"نارمل ہی تھا۔"

"خوفزدہ یا نروس تو نہیں تھا؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی تھی۔"

"وہ کتنے بجے بلڈنگ سے نکل گیا تھا؟"

"حسب معمول سوا سات کے لگ بھگ۔"

"میں جرح ختم کرکے جج کی جانب مڑا اور نہایت ہی مودب لہجے میں کہا۔ "جناب عالی میں معزز عدالت کی اجازت سے اس مقدمے کے تفتیشی افسر سے چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے اجازت دیتے ہوئے انکوائری افسر کو کٹہرے میں آنے کا حکم دیا۔ میں نے گواہوں والے کٹہرے کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ "انکوائری افسر صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟"

"سرفراز نقوی۔" اس نے جواب دیا۔ "انسپکٹر سرفراز نقوی۔"

"رینک تو آپ کے کندھوں ہی سے نظر آ رہا ہے۔" میں نے پھر پوچھا۔ "آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے ملی تھی؟"

"تقریباً دس بجے صبح۔"

"یعنی پچیس اکتوبر بروز اتوار کی صبح دس بجے؟"

"درست فرمایا آپ نے۔"

میں نے کہا۔ "نقوی صاحب! آپ جائے واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"ساڑھے دس بجے۔"

"وری گڈ۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "ملزم کو آپ نے کتنے بجے گرفتار کیا تھا؟"

"میرا خیال ہے گیارہ بجے۔"

"آپ نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ جب آپ پٹیل پاڑا میں واقع ملزم کے گھر پہنچے تو وہ سو رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے اسے جگا کر گرفتار کرلیا۔"

"جی ہاں! بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

"کیا ملزم کی گرفتاری کے لیے آپ خود گئے تھے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس وقت موقع کی کارروائی نمٹا رہا تھا۔ ملزم کی گرفتاری کے لیے میں نے ایک اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلو کے ساتھ بھیجا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! مقتولہ کی لاش کو آپ نے اپنی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوایا تھا؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"آئی او صاحب!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے' آپ نے لاش کا طبی معائنہ کیا تھا؟"

"یہ تو میرے فرائض کا حصہ اول تھا۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی کھوپڑی پاش پاش ہو چکی تھی؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی کو بعد میں چٹخایا گیا تھا۔"

"چٹخایا نہیں بلکہ پاش پاش کیا گیا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کے خیال میں یہ بربریت کا مظاہرہ کس نے کیا تھا؟"

"ظاہر ہے' یہ ملزم ہی کا "کارنامہ" تھا۔ انکوائری افسر نے عام سے لہجے میں کہا۔ "ی
اس ظالم شخص نے اس معصوم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ پھر افشائے راز کے ڈر سے اس کی گردن دبا
اسے ہلاک کر ڈالا۔ جب اس پر بھی ملزم کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے مقتولہ کی کھوپڑی کا حشر خرا
کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ مقتولہ کی گردن ا
کمر کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ علاوہ ازیں دائیں بازو اور بائیں ٹانگ کی ہڈیاں بھی سلامت نہیں ر
تھیں۔ آپ کے خیال میں یہ سب کچھ ملزم ہی کا کیا دھرا تھا؟"

"جی بالکل! بھلا اور یہ کام کون کر سکتا تھا!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "اور ملزم یہ کام کیوں کر سکتا تھا؟"

"اس لیے کہ وہ اپنے جرم کو چھپانا چاہتا تھا۔" انکوائری افسر نے دلیل پیش کی۔ "مجر
ایک جرم کو چھپانے کے لیے سو جرم کر سکتا ہے جس طرح ایک دروغ گو شخص اپنے ایک جھوٹ
چھپانے کے لیے سو جھوٹ بول سکتا ہے۔ ملزم نے پہلے مقتولہ پر مجرمانہ حملہ کیا' پھر جرم کی پردہ پوشی ک
لیے مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت سے ہمکنار کیا اور جب اس پر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو مقتولہ ک
ہڈی پسلی ایک کر دی۔"

میں نے کہا۔ "اس سے تو ظاہر ہوتا ہے ملزم ایک جنونی شخص ہے۔ اس نے وحشیانہ پن
مظاہرہ کیا ہے؟"

"آپ خود ہی حقیقت بیان کر رہے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں نے اپنی رائے نہیں دی بلکہ آپ سے ایک سوال کیا ہے آئی او صاحب!" میں نے
انکوائری افسر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور آپ سے میرا اگلا
سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے وہ "آلہ" قتل دریافت کر لیا ہے جس کی مدد سے میرے موکل اور اس
مقدمے کے ملزم نے مقتولہ کی ہڈی پسلی ایک کی تھی؟"

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "باوجود انتھک کوشش کے بھی ہم وہ "آہنی ہتھیار" تلاش
کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

"آپ نے یہ فیصلہ کیسے کیا کہ ملزم نے کسی آہنی ہتھیار ہی سے کام لے کر مقتولہ کا حلیہ
بگاڑا ہوگا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب کہ آلہ تباہ کاری آپ برآمد نہیں کر سکے؟"

"یہ ہمارا اندازہ ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "انشاء اللہ...... ہم ضرور اس تلاش میں
ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم نے ابھی ہمت نہیں ہاری۔"

"آپ کی ہمت قابل رشک ہے۔"

"جی! کیا فرمایا آپ نے!" وہ چونک کر بولا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے

مطابق مقتولہ کی گردن کے نچلے حصے پر دانتوں سے کاٹنے کے متعدد نشانات پائے گئے ہیں اور اسے
بڑی بے دردی سے بھنبھوڑا گیا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ بھی میرے موکل ہی کا کارنامہ ہے؟"

"جی بالکل! یہ اسی جنونی کے ستم کا شاخسانہ ہے۔"

میں نے اس کو گھیرنے کی خاطر کہا۔ "اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم ایک ایب نارمل انسان
ہے۔ وہ جنون میں مبتلا ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"ہاں' اس کے سابق کارنامے تو اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"

"آئی او صاحب!" میں نے انکوائری افسر کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔
"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور آپ کے چالان کے مطابق مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل
مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ کیا اس صورت میں آپ کا یہ فرض نہیں بنتا تھا کہ فوراً ملزم کا طبی معائنہ
کرواتے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔"

"ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اس کے برعکس آپ نے ایک "عینی شاہد" کی گواہی پر اعتبار کرنا زیادہ آسان سمجھا جس
نے وقوعہ کی رات ملزم کو ڈکٹ کا دروازہ کھول کر اندر کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا تھا؟"

میرا اشارہ استغاثہ کے گواہ امتیاز شیخ کی طرف تھا جس کی ابھی گواہی نہیں ہوئی تھی۔ شاید
استغاثہ نے اسے سب سے آخر کے لیے بچا رکھا تھا۔

تفتیشی افسر نے کہا۔ "ہم عینی شاہد کی گواہی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔"

"نقوی صاحب!" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ یہ بات تسلیم کر چکے
ہیں اور آپ چالان میں تحریری طور پر درج کر چکے ہیں کہ مقتولہ کی گردن کے نچلے حصے پر ملزم کے
دانتوں سے کاٹنے کے زخم موجود تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ایسی
صورت میں آپ کو چاہیے تھا کہ کسی ماہر سے ان زخموں اور ملزم کے دانتوں کا موازنہ کرواتے تاکہ
صورت حال مزید واضح ہو جاتی؟"

انکوائری افسر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے تفتیشی افسر پر سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے
ہوئے کہا۔

"انسپکٹر سرفراز نقوی صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مقتولہ کی موت
اس کا گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ نیز اس امر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ مقتولہ کی گردن پر دائیں
جانب' کان سے ذرا نیچے انگوٹھے کے دباؤ کے آثار پائے گئے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ
مقتولہ کی گردن پر قاتل کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ کیا آپ نے میرے موکل کے فنگر پرنٹس کا مقتولہ
کی گردن پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات سے موازنہ کیا تھا...... یقیناً نہیں کیا تھا۔" ایک
لمحے کو رک کر میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "اگر کیا ہوتا تو مقدمے کی فائل میں فنگر پرنٹس کے
موازنے کی رپورٹ موجود ہوتی۔"

آئی او کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا' تاہم وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا' حالانکہ اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرا منہ توڑ دیتا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی لگتا تھا۔

میں نے جرح ختم کردی تو جج نگاہ جھکا کر اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اٹھا کر پیش کار کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

''وہ فلیٹ نمبر'' تین سو پانچ اے'' کے مکین گواہی کے لیے آئے ہیں؟''

''جی وہ موجود ہیں۔'' پیش کار نے جواب دیا۔

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ان لوگوں سے کوئی اہم سوال کرنا چاہتے تھے؟''

''یس یور آنر۔''

میرے جواب کے بعد جج کے حکم پر دونوں میاں بیوی کو کمرے کے اندر بلا لیا گیا۔ واضح رہے کہ عدالت کے کمرے میں' ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو بیان اور جرح کے لیے بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے بیان سے کسی دوسرے گواہ کا بیان متاثر نہ ہو۔ مسٹر سبحان اور اس کی بیگم عشرت جہاں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تاہم کٹہرے میں صرف مسز سبحان پہنچی تھی کیونکہ گواہی اسی کو دینا تھی۔ جس وقت مقتولہ ان کے گھر میں وقوعہ کے روز کام کر رہی تھی' مسٹر سبحان اپنے دفتر میں تھے' اس لیے ان سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کٹہرے میں کھڑی عشرت جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔ ''عشرت جہاں صاحبہ! مقتولہ فوزیہ آپ کے گھر میں کیا کام کرنے آتی تھی؟''

''ہم اس سے دو کام کرواتے تھے۔'' عشرت جہاں نے بتایا۔ ''برتنوں کی دھلائی' صفائی اور کپڑوں کی دھلائی۔''

''وہ ان کاموں کے لیے عموماً آپ کے گھر کتنے بجے آجاتی تھی؟''

''لگ بھگ پانچ بجے۔''

''اور اس کی روانگی کب ہوتی تھی؟''

''کم و بیش چھ بجے!''

''اس کا مطلب ہے' یہ وہ دونوں کام ایک گھنٹے میں نمٹا دیتی تھی؟''

''جی ہاں' عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔''

''کیا وقوعہ کے روز بھی ایسا ہی ہوا تھا؟''

عشرت جہاں کا جواب اثبات میں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے مقتولہ وقوعہ کے روز چھ بجے آپ کے گھر سے رخصت ہوگئی تھی؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں مقتولہ آپ کے گھر سے نکل کر سیدھی اپنے گھر گئی تھی؟''

''اس بارے میں' میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' عشرت جہاں نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت کچن میں تھی اور میں نے باہر کوریڈور میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے دیکھا تھا کہ فوزیہ نے میرے گھر سے نکلنے کے بعد سامنے والے گھر کی گھنٹی بجائی تھی۔''

''یعنی تین سو دو والے فلیٹ کی گھنٹی۔''

''جی ہاں' آپ کا حساب درست ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مقتولہ وہاں بھی کام کرتی تھی؟''

''جی ہاں' وہ اس گھر میں صرف کپڑے دھونے جاتی تھی۔''

''آپ کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد۔''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''بلکہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمارے یہاں آتی تھی۔''

''پھر وہ آپ کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد وہاں کی گھنٹی کیوں بجا رہی تھی؟''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''یہ تو آپ اسی سے جا کر پوچھیں۔''

میں بھلا اس سے جا کر کیسے پوچھ سکتا تھا۔ وہ تو ایک سال قبل منوں مٹی اوڑھ کر سو گئی تھی۔

میں نے افسوسناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''عشرت جہاں صاحبہ! وقوعہ کے روز مقتولہ کی ماں سلطانہ بیگم اس کا پتا کرنے کتنے بجے آپ کے پاس آئی تھی؟''

''وہ آٹھ بجے آئی تھی۔''

''اور فوراً ہی واپس چلی گئی تھی؟''

''جی ہاں' وہ خاصی پریشان تھی۔''

میں نے مزید چند سوالات کرنے کے بعد جرح ختم کردی۔

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی تو میں نے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کا صرف ایک گواہ باقی بچا ہے۔ وکیل استغاثہ کو تاکید کی جائے کہ آئندہ پیشی پر وہ اس کی گواہی کروا دیں تاکہ ملزم کے بیان کے بعد صفائی اور دلائل کا سلسلہ شروع ہوسکے۔''

جج خود اس مقدمے کو جلد از جلد کسی نتیجے تک پہنچانا چاہتا تھا' چنانچہ اس نے میرے حسب منشا استغاثہ کو ہدایت جاری کردیں۔

اس روز ملزم کا بڑا بھائی افضل خان کسی خاص الخاص مصروفیت کے باعث عدالت نہیں آسکا تھا لیکن شام کو وہ میرے دفتر میں موجود تھا۔ میں نے اس کی بیوی کے ذمے جو کام لگایا تھا' وہ اس نے بطریق احسن انجام دے دیا تھا۔ میں نے افضل کو آج کی عدالتی روداد کے بارے میں بتایا تو

وہ بہت خوش ہوا۔ جذباتی لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ تو بہت تیز رفتاری سے منزل کی جانب گامزن ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کامیابی میں ہماری مشترکہ کوششیں کارفرما ہیں۔ خصوصاً گل ریز کے تعاون کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے مزید کہا۔ ''بھئی تمہاری بیوی کے کرنے کے لیے تو ایک اور کام نکل آیا ہے لیکن یہ کام آیندہ پیشی سے پہلے پہلے ہو جانا چاہیے۔ اس کام کا تعلق ''نیلم آرکیڈ'' سے ہے اور اس مشن میں تم میاں بیوی دونوں حصہ لو گے۔''

وہ سوالیہ مگر ولولہ انگیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''ذرا تفصیلات تو بتائیں بیگ صاحب!''

میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں غرض و غایت بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''یہ کام بہت ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔ افضل خان۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔''

آج جس طرح افضل خان نے گل بہار والے کام سے متعلق انکشاف انگیز معلومات مجھ تک پہنچائی تھیں' مجھے امید تھی کہ موجودہ ذمے داری پوری کرنے میں بھی وہ اسی طرح کامران رہے گا۔

انسان خلوص نیت سے اگر مثبت انداز میں کوشش کرے تو کامیابی ضرور اس کی قدم بوسی کرتی ہے۔

☆......☆......☆

''مسمی امتیاز شیخ سن آف افتخار شیخ ساکن فلیٹ نمبر ''تین سو دوائے'' نیلم آرکیڈ کراچی' بہ قائمی ہوش و حواس یہ بیان دیتا ہوں کہ......''

استغاثہ کے سب سے اہم اور آخری گواہ امتیاز شیخ نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا طویل بیان ریکارڈ کروایا جو پولیس کو دیے گئے بیان کی ہوبہو کاپی تھا۔ اس کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں بنتا تھا۔

وقوعہ کی رات (چوبیس اور پچیس اکتوبر کی درمیانی شب) امتیاز شیخ اپنے فلیٹ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اس نے نیچے ڈکٹ میں سے کچھ پراسرار آوازیں سنیں۔ وہ کھڑکی میں بنے ہوئے موکھلے میں سے جھانکنے لگا۔ اسی وقت اس نے ڈکٹ کے دروازے میں شبینہ ڈیوٹی والے چوکیدار نصیب خان کی جھلک دیکھی جو دروازہ بند کر رہا تھا۔ جب نصیب خان اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا تو وہ دوبارہ آ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس واقعے کو بھول گیا۔ لیکن دوسری صبح جب اسے معلوم ہوا کہ ڈکٹ میں کسی لڑکی کی لاش ملی ہے تو رات والا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اسے صد فی صد یقین تھا کہ رات چوکیدار نصیب خان نے اسی مقتول لڑکی کی لاش ڈکٹ میں پھینکی تھی۔

پولیس اور استغاثہ کے لیے امتیاز شیخ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور پورا کیس اسی پر بیس کرتا تھا۔ اب مجھے استغاثہ کے اس اہم گواہ پر جرح کرنا تھی۔ وکیل استغاثہ جب گھما پھرا کر مختلف

سوال کر چکا اور اس نے اپنی جرح ختم کرنے کا اعلان کر دیا تو میں نے جج کی اجازت پا کر گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سلسلہ سوالات کا آغاز کیا۔

''امتیاز شیخ صاحب! اگر میں آپ کو صرف شیخ صاحب کہوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''مجھے اکثر لوگ شیخ صاحب ہی کہتے ہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا: ''شیخ صاحب! آپ نے پولیس کو اور پھر معزز عدالت کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے ڈکٹ کی طرف سے کچھ پراسرار آوازیں سنی تھیں؟''

''جی ہاں' میرا یہی بیان ہے۔''

''آپ ان پراسرار آوازوں کی وضاحت کریں گے؟''

وہ گڑبڑا گیا پھر بولا۔ ''ان آوازوں سے میری مراد ایک عجیب سی آواز سے تھی۔''

''اچھا' چلو مان لیا کہ کوئی عجیب سی آواز آپ کے نزدیک پراسرار آوازوں میں شمار ہوتی ہے۔'' میں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ ذرا معزز عدالت کے سامنے اس عجیب آواز کی تشریح ہی کر دیں تو عین نوازش ہوگی۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''وہ کسی چیز کے پھینکنے کی آواز تھی' جیسے کوئی بوری یا بوری نما چیز پھینکی جائے۔''

''شیخ صاحب! آپ کے بیان کے مطابق آپ اس آواز پر چونکے اور صورت حال جاننے کے لیے ڈکٹ میں جھانکنے لگے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ سادہ لہجے میں بولا۔

''پھر آپ نے وہاں کیا دیکھا؟''

''میں نے جو کچھ دیکھا' وہ اپنے بیان میں بتا چکا ہوں۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''شیخ صاحب! اگر کوئی حرج نہ ہو تو ایک مرتبہ مجھے بھی بتا دیں۔''

''ایک ہی بات کو میں کتنی مرتبہ دہراؤں۔'' وہ جھنجھلا گیا۔

جج نے سرزنش آمیز آواز میں کہا۔ ''مسٹر امتیاز شیخ! وکیل صاحب جو کچھ پوچھ رہے ہیں' وہ بتاؤ۔ تم ان کے سوالات کے جواب دینے کے پابند ہو کیونکہ تم اس وقت ایک گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں موجود ہو۔''

امتیاز شیخ نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں نے جب ڈکٹ میں جھانکا تو وہاں مجھے شبینہ ڈیوٹی والے چوکیدار نصیب خان کی جھلک دکھائی دی تھی۔''

''وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''ڈکٹ کا دروازہ بند کر کے جا رہا تھا۔''

''اور صبح جب آپ کو معلوم ہوا کہ ڈکٹ کے اندر سے ایک برہنہ لڑکی کی لاش ملی ہے تو

آپ نے فرض کرلیا کہ رات آپ نے جو کسی بوری نما چیز کے پھینکے جانے کی آواز سنی تھی‘ وہ دراصل مقتول لڑکی کے پھینکے جانے کی آواز تھی‘ جسے آپ نے پہلے پراسرار آوازوں کے طور پر محسوس کیا اور بعد میں ایک عجیب سی آواز کے طور پر؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہی میرے محسوسات تھے۔“

”اور آپ کو یہ بھی یقین ہوگیا کہ وہ لاش ملزم نصیب خان نے ڈکٹ کے اندر پھینکی تھی؟“ میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

”ہاں۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے ملزم کو وہاں دیکھا تھا۔“

”لاش پھینکتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”نن......نہیں۔“ اس کی زبان لڑکھڑائی۔ ”وہ لاش پھینک کر واپس جارہا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نے اسے باقاعدہ لاش وہاں پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟“

”یہ بے قاعدہ اور باقاعدہ کا تو مجھے پتا نہیں۔“ وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے بس اسے وہاں دیکھا تھا۔ اگر وہ لاش پھینک کر نہیں جارہا تھا پھر آدمی رات کو وہاں کیا کررہا تھا؟“

جج نے دوبارہ اسے ڈانٹا۔ ”مسٹر امتیاز! آپ سوال نہ کریں بلکہ صرف وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔“

گواہ امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگے۔

وہ فوراً اس کی دستگیری کو لپکا۔ ”آبجیکشن یور آنر!“ اس نے تیز آواز میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست بار بار لاش کے پھینکے جانے کا ذکر کرکے معزز گواہ کو الجھا رہے ہیں حالانکہ گواہ انہیں بتا چکا ہے کہ اس نے کوئی بوری نما چیز پھینکے جانے کی آواز سنی تھی اور ملزم وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا ایک ہی منطقی نتیجہ نکلتا تھا کہ ملزم وہاں کچھ پھینک کر جارہا تھا۔ گواہ نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔“

وکیل استغاثہ نے ایک بے مقصد وضاحت کی تھی‘ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے خود نہ اندازہ ہو کہ وہ آخر کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

میں نے گواہ کو دوسرے زاویے سے گھسنا شروع کیا۔ ”شیخ صاحب! آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

”مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔“ وکیل استغاثہ نے اچھل کر کہا۔ ”وکیل صفائی ایک غیر متعلق سوال کررہے ہیں۔“

جج نے مجھ سے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنے سوالوں کو کیس تک محدود رکھیں۔“

”آل رائٹ یور آنر۔“ میں نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا۔ پھر گواہ کی جانب مڑتے ہوئے پوچھا۔

”شیخ صاحب! آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ اپنے گھر میں ٹی

وی دیکھ رہے تھے‘ جب آپ نے وہ پراسرار آوازیں بہ الفاظ دیگر ایک عجیب سی آواز سنی تھی...... کسی بوری نما چیز کے پھینکے جانے کی۔“ اتنا کہہ کر میں رکا۔ امتیاز شیخ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ”شیخ صاحب! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت آپ گھر میں اکیلے تھے؟“

”جی ہاں! میں اس وقت گھر میں اکیلا ہی تھا۔“

”اگر وکیل استغاثہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ شادی شدہ ہیں یا......؟“

میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وہ مجھے ایسی نظر سے گھور رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔ وہ مسلسل مجھے کینہ توز انداز میں دیکھتا رہا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

امتیاز شیخ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے اس سوال کا جواب بھی دوں گا اور اس سوال کا بھی جس کا جواب آپ کو نہیں مل سکا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا۔ ”میں ایک پرائیویٹ فرم میں بہ حیثیت اکاؤنٹینٹ کام کرتا ہوں اور یہ کہ میں شادی شدہ ہوں اور ایک تین سالہ بچی کا باپ بھی ہوں۔“

”اس کے باوجود بھی آپ وقوعہ کی رات گھر میں اکیلے تھے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ کے بیوی بچے کہیں گئے ہوئے تھے؟“

”جی ہاں! میری بیوی پروین کوثر چھوٹی بچی سونیا کے ہمراہ اپنی امی کے یہاں رنچھوڑ لائن گئی ہوئی تھی۔“

”تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”شیخ صاحب! جب آپ نے ڈکٹ کی جانب سے وہ عجیب سی آواز سنی تھی اس وقت رات کا کیا بجا تھا؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔“

”آپ اتنا ایکوریٹ ٹائم بتا رہے ہیں۔“ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے‘ آپ نے اس وقت ضرور گھڑی دیکھی ہوگی؟“

”جی ہاں‘ میں نے وال کلاک میں وقت دیکھا تھا۔“

اس زمانے میں کیبل نیٹ ورک اور ڈش انٹینا وغیرہ متعارف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مقامی طور پر ”ایس ٹی این“ کی نشریات کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے استغاثہ کے گواہ امتیاز شیخ سے سوال کیا۔

”تو اس وقت جناب ٹی وی دیکھ رہے تھے اور رات کا ایک بج چکا تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ رات کے ایک بجے کون سا پروگرام ٹی وی پر دکھایا جارہا تھا؟“

پی ٹی وی عموماً ساڑھے گیارہ یا پونے بارہ یا حد بارہ بجے تک اپنی نشریات بند کردیتا تھا۔

گواہ نے میرے اس سوال پر تحقیر آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور فخریہ لہجے میں بولا۔ ”میں اس وقت اپنا پسندیدہ کھیل کرکٹ دیکھ رہا تھا۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان بڑا سنسنی خیز ”ون

ڈے" کھیلا جارہا تھا۔

"رات کے ایک بجے یہ میچ کہاں ہورہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

امتیاز شیخ نے ایک مرتبہ پھر مجھے مضحکہ اڑانے والی نظر سے دیکھا اور جواب دیا۔ "جناب وکیل صاحب! یہ میچ ویسٹ انڈیز میں ہورہا تھا!"

اس کا جواب وزن دار تھا۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے معیاری وقت میں پورے نو گھنٹے کا فرق ہے۔ انتہائی مغرب میں واقع ہونے کے باعث ویسٹ انڈیز کا وقت ہم سے نو گھنٹے پیچھے ہے یعنی جب وقوعہ کی رات گواہ امتیاز شیخ ایک بجے ٹی وی پر ویسٹ انڈیز میں کھیلا جانے والا میچ دیکھ رہا تھا تو اس وقت وہاں ویسٹ انڈیز میں شام کے چار بجے ہوں گے......گزشتہ شام کے جو پاکستان میں گزر چکی تھی۔ اس حساب سے جب پاکستان میں پچیس اکتوبر کا ایک صبح کا بجا تھا تو ویسٹ انڈیز میں چوبیس اکتوبر شام کے چار بجے ہوں گے۔ جغرافیائی اعتبار سے ویسٹ انڈیز (جزائر غرب الہند) دو براعظموں (نارتھ امریکہ اور ساؤتھ امریکہ) کے درمیان "کریبین سی" میں واقع ہے۔

میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوا امتیاز سے سوال کیا۔ "شیخ صاحب وہ میچ کتنے بجے ختم ہوا تھا؟"

"رات تین بجے۔"

"یعنی ویسٹ انڈیز میں لگ بھگ شام چھ بجے؟"

"یہ حساب آپ خود لگاتے پھریں۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "میں نے میچ کی اختتامی تقریب بھی دیکھی تھی۔ میچ تو تین بجے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "شیخ صاحب! آپ نے جس طرح رات بھر جاگ کر وہ میچ دیکھا تھا، اس سے کرکٹ سے آپ کے گہرے دلی لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ کیا آپ خود بھی کرکٹ کھیلتے رہے ہیں؟"

وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "بالکل! میں اسکول اور کالج کی ٹیموں میں باقاعدہ کرکٹ کھیل چکا ہوں۔"

اس کے جواب دینے کے انداز سے مجھے شک گزرا۔ میں نے اطمینان کے لیے سوال کیا۔ "شیخ صاحب! اسکول یا کالج کی ٹیم میں آپ کس حیثیت سے کھیلتے تھے؟"

"بہت اچھی حیثیت تھی میری۔" وہ جلدی سے بولا۔

"شاید آپ میرے سوال کا مطلب نہیں سمجھے۔" میں نے کہا۔ "میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ بہ حیثیت بیٹس مین یا باؤلر یا وکٹ کیپر تھے؟"

"میں ہر حیثیت میں بہت عمدہ کھیل پیش کرتا تھا۔"

"گویا آپ آل راؤنڈر تھے؟"

"جی بالکل۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے سب کے سامنے اس کے جھوٹ کا پول کھولنے کے ارادے سے سوال کیا۔

"امتیاز صاحب! جب کوئی بیٹسمین اسکوائر کٹ کھیلتا ہے تو عموماً کس پوزیشن کا فیلڈر گیند کو روکنے کی کوشش کرتا ہے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "فرسٹ سلپ کا فیلڈر"

"ویل ڈن" میں نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "آپ نہایت ہی عمدہ فیلڈنگ کا مظاہرہ کر رہے ہیں شیخ صاحب!"

جج نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "بیگ صاحب! کرکٹ کے بارے میں میری ٹیکنیکل معلومات بہت کم ہیں۔ آپ اپنے سوال اور گواہ کے جواب کی تشریح کریں۔"

میں نے حاضرین پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "عدالت کے کمرے میں کوئی کرکٹ کا کھلاڑی موجود ہے۔"

ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی "لاء کالج" میں قانون کا اسٹوڈنٹ تھا اور اپنی معلومات اور تجربے میں اضافے کی خاطر اکثر عدالت کے کمرے میں آ بیٹھتا تھا۔ اسے کرکٹ سے بھی گہرا شغف تھا، اسی لیے میرے سوال کے جواب میں وہ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اس نوجوان سے پوچھا۔ "آپ صرف اتنا بتائیں کہ گواہ نے میرے سوال کا جواب غلط دیا ہے یا درست؟"

"ابسولیوٹلی رانگ سر۔"

"تھینک یو۔ آپ بیٹھ سکتے ہیں۔" میں نے اس نوجوان سے کہا اور پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔ "یور آنر! گواہ نے معزز عدالت کے سامنے ایک کھلا جھوٹ بولا ہے۔ یہ کرکٹ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔"

وکیل استغاثہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ "جناب عالی! معزز عدالت میں زیر سماعت مقدمے کا کرکٹ کے کھیل سے کیا تعلق ہے؟"

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اس تعلق کی وضاحت کریں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "یور آنر! کرکٹ اور اس مقدمے کے بیچ تعلق استغاثہ کا گواہ امتیاز شیخ ہے جو سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد بھری عدالت میں دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے، لہٰذا وہ گواہی کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جو شخص معزز عدالت کے سامنے بہ بانگ دہل ایک جھوٹ بول سکتا ہے اس سے مزید جھوٹ کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔" پھر میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ آیا آپ کی سمجھ شریف میں؟"

وہ اپنی بے عزتی یا سبکی محسوس کر رہا تھا۔ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''ایسا کیا جھوٹ بول دیا میرے گواہ نے' ذرا میں بھی تو سنوں!''

''بہ صد شوق۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا' جس نے جلتی پر تیل کا کام دکھایا۔ مخالف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ارشاد!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ کے گواہ نے کرکٹ کا مستند کھلاڑی بتا کر صریحاً جھوٹ بولا ہے جب کہ وہ اس کھیل کی اے بی سی سے بھی وا نہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب بیٹسمین اسکوائر کٹ کھیلتا ہے تو وہ گیند پر اس طرح اسٹروک لگاتا ہے کہ وہ پچ سے آف سائیڈ نوے درجے کا زاویہ بناتی ہوئی باؤنڈری کی جانب دوڑ لگاتی ہے۔ اس گیند کو عموماً ''گلی'' کی پوز میں کھڑا فیلڈر روکنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ فرسٹ سلپ کا فیلڈر۔ فرسٹ سلپ کا فیلڈر تو صرف گیندوں کو روکتا ہے جو پچ سے کم و بیش ایک سو پینسٹھ درجے سے لے کر ایک سو پچھتر درجے تک زاویہ بناتے ہوئے نکلتی ہیں۔''

''جناب عالی! بیگ صاحب خواہ مخواہ کرکٹ کی تفصیل میں معزز عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے برہمی سے کہا۔ ''انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''بیگ صاحب! گواہ کا جھوٹ عدالت کے ریکارڈ پر آ چکا ہے۔'' جج نے مجھ سے مخا ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کرکٹ کی دنیا سے نکل کر اس مقدمے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اپنی جاری رکھیں۔''

میں جج کے حسب ہدایت گواہ امتیاز شیخ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''شیخ صاحب! جزوی پر میچ کا ذکر کرتے ہوئے آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ وقوعہ کی رات آپ میچ دیکھ کر لگ بھگ بجے فارغ ہوئے تھے' یہ بتائیں کہ آپ کتنے بجے تک سو گئے تھے۔''

اس نے جواب دیا۔ ''شاید پانچ بجے تک۔''

''پچیس اکتوبر کی صبح کتنے بجے آپ کی آنکھ کھلی تھی؟''

''میں خاصی دیر تک سوتا رہا تھا۔''

''مثلاً کتنے بجے تک؟''

''شاید گیارہ بجے تک۔''

''ہیر از پوائنٹ یور آنر۔'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''واقعات شواہد کے مطابق جب لاش دریافت ہوئی تو خاکروب اور چوکیدار اسلم بلڈنگ کے مکینوں کو اطا دینے کے لیے دوڑ پڑے۔ محمد اسلم چوکیدار نے یونین انچارج کے فلیٹ کا رخ کیا تھا جبکہ گواہ امتیا

مارت کے احاطے میں خاکروب مائیکل سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کی زبانی مائیکل کو معلوم ہوا تھا کہ ڈکٹ سے ملنے والی لاش کا قاتل نصیب خان چوکیدار ہے۔ یہی نہیں' بعدازاں گواہ نے اپنے فلیٹ کے فون سے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع بھی دی تھی جس کی تصدیق انکوائری افسر کر چکا ہے اور اب...... اب گواہ کا کہنا یہ ہے کہ پچیس اکتوبر کی صبح وہ گیارہ بجے سو کر اٹھا تھا حالانکہ گیارہ بجے اچھی خاصی دوپہر ہو جاتی ہے۔ یہ گواہ کی کھلی دروغ گوئی نہیں تو اور کیا ہے؟''

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ امتیاز شیخ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہو گیا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جج نے ناگوار نظر سے گھور کر گواہ کو دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''مسٹر شیخ! تمہارا کون سا بیان درست ہے۔ گیارہ بجے سو کر اٹھنے والا یا نو بجے سے پہلے بیدار ہونے والا۔ یہ نو بجے سے پہلے کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم نے کم و بیش سوا یا ساڑھے نو بجے مائیکل سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد مصدقہ طور پر تم نے اپنے فلیٹ سے پولیس کو فون کیا تھا۔ لیس کے مطابق انہیں اس واردات کی اطلاع دس بجے دی گئی تھی۔ اگر دس پندرہ منٹ کے فرق کو ظرانداز کر دیا جائے تو بھی تمہیں نو بجے تک تو بیدار ہو ہی چکنا تھا۔ اب تم اس سلسلے میں کیا کہتے و؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! میں وقوعہ کے روز لگ بھگ نو بجے ہی بیدار ہوا ا۔ گیارہ بجے والی بات کو میں واپس لیتا ہوں۔ پتا نہیں کس رو میں یہ بات میرے منہ سے نکل گئی ی!''

میں نے کہا۔ ''تیز رو ایکسپریس میں۔''

وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔ ''آپ یہ ایکسپریس کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''شیخ صاحب! آپ کے سامنے والے فلیٹ نمبر تین سو پانچ میں رہنے لی عشرت جہاں کا کہنا ہے کہ چوبیس اکتوبر کی شام چھ بجے مقتولہ آپ کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ پ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

''عشرت جہاں نے کوئی خواب دیکھ لیا ہوگا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

میں نے اپنی جرح کو اختتامی مرحلے میں داخل کر دیا۔ ''شیخ صاحب! آپ کے فلیٹ کی رح اور کتنے فلیٹوں کی کھڑکیاں ڈکٹ میں کھلتی ہیں؟'' پانچ بلاک ''اے'' کے اور پانچ بلاک ''بی'' ے۔

''اور یہ سب دو نمبر کے فلیٹ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جیسے آپ کا فلیٹ نمبر تین سو دو...... ٹ نمبر دو' فلور نمبر تین؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''شیخ صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں۔ وقوعہ کی رات ان دس فلیٹوں میں ے کون کون سا آباد تھا؟''

"مجھے صرف اپنے فلیٹ کا علم ہے۔" وہ الجھن آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ب
"دوسروں کے فلیٹوں کا میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا۔"

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے افضل خان اور اس کی بیگم سے حاصل شدہ معلومات کی
میں کہنا شروع کیا۔ "شیخ صاحب! وقوعہ کی رات آپ کے بلاک کا فلیٹ نمبر چار سو دو خالی تھا۔
ماہ سے خالی ہے۔ فلیٹ نمبر تین سو دو یعنی آپ کا فلیٹ آباد تھا جہاں آپ اپنے من پسند کھیل
"لطف اندوز" ہو رہے تھے۔ فلیٹ نمبر دو سو دو کے مکین وقوعہ سے دو روز قبل ایک ماہ کے لیے
عزیزوں سے ملنے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ فلیٹ نمبر ایک سو دو میں رہنے والا جوڑا بھی غیر موجود
شوہر اپنی بیوی کے ساتھ ویک اینڈ منانے اپنی سسرال واقع محمود آباد گیا ہوا تھا۔ فلیٹ نمبر دو میں ر
والی عورت اپنے بچوں کے ساتھ اپنی امی کے فلیٹ نمبر چار سو چار "بی" میں گئی ہوئی تھی۔ اب ب
"بی" کی بات ہو جائے۔ فلیٹ نمبر دو ایک ہفتے سے بند پڑا تھا۔ فلیٹ نمبر ایک سو دو والی عو
ڈلیوری کے لیے میٹرنٹی ہوم میں داخل تھی۔ میاں بھی تیمارداری کے لیے اس کے پاس تھا۔ فلیٹ نم
سو دو والے میاں بیوی اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ تین روز کے لیے سکھر گئے ہوئے تھے۔ گو
فلیٹ بھی بند تھا۔ اس کے بعد فلیٹ نمبر تین سو دو آتا ہے یعنی جس کی کھڑکی آپ کے فلیٹ کے سا
کھلتی ہے۔ مذکورہ فلیٹ میں ایک بیوی اپنی دو بچیوں کے ساتھ رہتی ہیں اور وہ لوگ ذرا جلدی س
کے عادی ہیں۔ فلیٹ نمبر چار سو دو "برائے فروخت" کے بورڈ کے ساتھ خالی پڑا ہے۔" ایک
رک کر میں نے سانس درست کی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"شیخ صاحب! کیسا اتفاق ہے کہ وقوعہ کی رات مذکورہ دس فلیٹوں میں سے صرف دو
تھے۔ اول فلیٹ نمبر تین سو دو "بی" جہاں مفلوج بیوہ خاتون اپنی بچیوں کے ساتھ رات ایک بجے
نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں اور دوئم فلیٹ نمبر تین سو دو "اے" جہاں آپ اپنے "فیورٹ" گیم
"محظوظ" ہو رہے تھے!"

امتیاز شیخ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "تو آپ لوگوں کے گھ
میں جھانکنے کا کام بھی کرتے ہیں؟"

میں نے اس کے تبصرے کا برا نہیں منایا۔ جج نے مجھ سے پوچھا۔ "اور کوئی سوال
چاہتے ہیں بیگ صاحب؟"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر۔" میں نے اپنی مخصوص نشست کی جانب بڑھتے ہو
کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

اگلی پیشی پر وکیل استغاثہ نے اس مقدمے کے ملزم اور میرے موکل کو جرح کی چکی
پیسنے کی پوری کوشش کی اور پورے دو گھنٹے کڑے تیوروں، بگڑے لہجوں اور ٹیڑھے زاویوں سے

گھسنے، مانجھنے اور رگڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

میرے موکل نے "میں جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔" کا
عہد نبھاتے ہوئے راست گوئی کا سہارا لیا اور "سچ کو آنچ نہیں" کے مصداق اس امتحان سے بہ آسانی
سرخ رو ہو گیا۔ وکیل استغاثہ اس سے ایک بھی ایسی غلطی نہیں کروا سکا جو بعد ازاں اس کے خلاف
استعمال ہوتی۔

وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو جج نے مجھ سے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنے موکل
سے سوالات کریں گے یا عدالت برخاست کردی جائے۔ آپ نے صفائی کے گواہوں کو فہرست دائر
نہیں کی۔ آئندہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! آئندہ پیشی پر میں انشاء اللہ
دلائل کے ذریعے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کردوں گا اور اگر کوئی گواہی ناگزیر ہوئی تو اس کا بھی
انتظام کرلوں گا۔ آپ اگلی تاریخ ذرا نزدیک ہی رکھیں۔ اب اس کیس کو جلد از جلد کسی حتمی نتیجے پر پہنچ
جانا چاہیے۔"

جج نے پانچ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ
کر کہا۔ "یور آنر! کیس کے اس فائنل اسٹیج پر میں عدالت سے ایک استدعا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید
ہے عدالت میری گزارش پر ضرور غور کرے گی!"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟"

"صرف یہ جناب عالی کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے تمام گواہوں کو عدالت میں موجود ہونا
چاہیے۔ میں دراصل کچھ اہم انکشافات کرنے والا ہوں۔"

جج نے میرے سنجیدہ لہجے پر بھویں اچکاتے اور ہونٹ سکیڑتے ہوئے وکیل استغاثہ کی
جانب سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ ایسا انتظام کرسکتے ہیں؟"

وکیل استغاثہ جھٹکے سے اکڑ گیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے جناب عالی! میں اتنے لوگوں کو صرف
پانچ دن کی مہلت میں کیسے ارینج کرسکتا ہوں۔ اس کے لیے تو کم از کم پندرہ روز درکار ہوں گے۔"

جج نے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں اپنی درخواست کو ذرا ہلکا
کردیتا ہوں۔" پھر میں نے ایک لمحے کو رک کر کچھ سوچا اور کہا۔ "جناب عالی! آئندہ پیشی پر دلائل کا
مرحلہ ہوگا۔ مقتولہ کی والدہ سلطانہ بیگم جو استغاثہ کی گواہ بھی ہیں، ہر پیشی پر باقاعدگی سے عدالت میں
حاضری دے رہی ہیں، آئندہ پیشی پر بھی یقیناً موجود ہوں گی۔ عبدالرزاق یونین انچارج، سوپر مائیکل،
چوکیدار محمد اسلم، سبحان اور عشرت جہاں وغیرہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ انکوائری افسر انسپکٹر
سرفراز نقوی بھی ہر پیشی پر حاضری کے پابند ہیں۔ میں معزز عدالت سے صرف اتنا چاہوں گا کہ وہ
استغاثہ کے سب سے اہم گواہ امتیاز شیخ کو عدالت میں لانے کا پکا انتظام کردیں۔ میں آپ کا شکر گزار
ہوں گا۔"

وکیل استغاثہ نے بھڑک کر کہا۔ ''آپ اس روز کون سا سانپ نکالنا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟''

''ایک ایسا سانپ جو بڑے بڑوں کو سونگھ جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! وکیل صفائی نے ڈراما شروع کردیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں جج سے فریاد کی۔ ''یہ ایسے ڈراموں کے ماہر ہیں۔''

''آپ ان کے کسی 'ڈرامے' سے خوف زدہ ہیں؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔

''نہیں' جناب عالی!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں ان سے نہ خائف ہوں اور نہ ہی خوف زدہ۔ بس یہ تاخیری حربے استعمال کرکے عدالت کا وقت برباد کرنے کے لیے خاصے مشہور ہیں۔''

جج نے ناگواری سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں تو جب سے بیگ صاحب اس کیس کو ڈیل کررہے ہیں' اس کی اسپیڈ میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔''

وکیل استغاثہ بے بسی سے جج کا منہ تکنے لگا۔

جج نے متعلقہ عدالتی عملے' انکوائری افسر اور وکیل استغاثہ کو تاکید کردی کہ آیندہ پیشی پر امتیاز شیخ کو عدالت میں ضرور موجود ہونا چاہیے۔

میں افضل خان کے ساتھ عدالت کے کمرے سے باہر آگیا۔ وہ خاصا مطمئن اور خوش تھا۔ میں نے آیندہ لائحہ عمل بھی اس سے ڈسکس کرلیا تھا' اس لیے بھی وہ کامیابی کے لیے زیادہ پرامید دکھائی دیتا تھا۔ ویسے یہ سچ ہے کہ اس کیس کے سلسلے میں افضل خان اور اس کی بیوی نے میرا بہت ساتھ دیا تھا اور آگے گل ریز مزید گل ریزی کرنے والی تھی!

افضل مجھ سے مصافحہ کرکے آگے بڑھ گیا تو میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کرکے پلٹ کر دیکھا۔

وہ انکوائری افسر سرفراز نقوی تھا۔

''بیگ صاحب! کون سا ڈراما اسٹیج کرنے جارہے ہیں؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

دو کانسٹیبل میرے موکل کو جیل کی مخصوص گاڑی کی جانب لے جارہے تھے اور انسپکٹر تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس رک گیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آئی او صاحب! ڈرامے کو دیکھنے کا لطف اسٹیج پر ہی ہوتا ہے۔ آپ پانچ دن انتظار کرلیں۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

وہ کھوجتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو آپ کے ارادے خاصے خطرناک نظر آرہے ہیں۔''

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''ہوں گے دوسروں کے لیے خطرناک' مگر آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے اپنے دل میں نیک خواہشات رکھتا ہوں۔''

''آج اس قدر مہربانی کیوں کر؟''

میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے اس کے مطلب کی بات چھیڑ دی۔ ''مہربانی وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں تو آپ کے لیے میرے پاس ایک ٹپ ہے!''

''ٹپ۔'' اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے دہرایا پھر بولا۔ ''یعنی بخشش......ٹی۔ آئی۔ پی؟''

میں نے کہا۔ ''میں اشارے کی بات کررہا ہوں۔''

''کیسا اشارہ؟'' وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''اشارہ......کلیو......مفید معلومات۔''

''آپ یقیناً مجھے چکر دینا چاہتے ہیں۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''بالکل نہیں' میں واقعی آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''آیندہ پیشی پر میں ایک اہم انکشاف کرنے والا ہوں۔'' میں نے چلتے ہوئے کہا۔ ''اسی انکشاف میں آپ کے لیے بھی ایک ''کلیو'' ہوگا۔''

اسے میری بات کا یقین نہیں آیا اور وہ خشمگیں نگاہ سے مجھے گھورتے ہوئے جیل کی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

میں پارکنگ ایریا کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

☆☆......☆☆......☆☆

عدالت کا کمرہ تمام اہم اور ضروری افراد کی موجودگی کو ظاہر کررہا تھا۔ جج نے اپنی نشست سنبھالی تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

پہلے وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے خلاف آدھے گھنٹے تک بہت دھواں دھار دلائل دیے اور بالآخر ملزم نصیب خان کو قرار واقعی سزا سنانے کے لیے معزز عدالت سے اپیل کی۔ اس کے بعد میں دلائل کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں نے اپنے موکل اور اس مقدمے کے ملزم نصیب خان کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! میں اپنے دلائل کے سلسلے میں سب سے پہلے استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا ایک جائزہ پیش کروں گا جس سے میرے موکل کی بے گناہی پر وافر مقدار میں روشنی پڑ سکے گی۔

''یور آنر۔ استغاثہ کی گواہ مقتولہ کی والدہ ماجدہ کا موقف ہے کہ مقتولہ کو ملزم اکثر و بیشتر

تنگ کرتا رہتا تھا جبکہ اور کسی ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ تاہم سلطانہ کی شکایت پر یونین انچارج نے ملزم کو سرزنش بھی کی تھی۔ سلطانہ بیگم کے مطابق وقوعہ کے روز ملزم کسی طرح بہلا پھسلا کر مقتولہ کو اپنے کمرے میں لے گیا اور بعدازاں برباد کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہی موقف پولیس نے بھی اختیار کیا ہے۔" ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد میں نے سلسلہ دلائل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" یہاں غور طلب نکتہ یہ ہے جناب عالی کہ وقوعہ کے روز مقتولہ آخری گھر سے کام ختم کرکے چھ بجے شام نکلی تھی جبکہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق ان دنوں ملزم کی ڈیوٹی رات کی تھی اور وہ پورے سات بجے نیلم آرکیڈ پہنچا تھا۔ اس امر کی تصدیق کے لیے گواہ عبدالرزاق یونین انچارج اور چوکیدار اسلم کا بیان ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سات بجے وقوعہ پر پہنچنے والا میرا موکل چھ بجے مقتولہ کو کس طرح بہلا پھسلا کر اپنے کمرے تک لے جاسکتا ہے؟

"جناب عالی! گواہ سلطانہ بیگم کے مطابق جب وہ لگ بھگ پونے آٹھ' آٹھ بجے اپنی گمشدہ بیٹی کو دیکھنے نیلم آرکیڈ پہنچی تو اسے ملزم کہیں نظر نہیں آیا جبکہ یونین انچارج کے مطابق وہ کم و بیش اسی وقت گیٹ کے قریب کرسی پر موجود تھا۔ علاوہ ازیں سلطانہ بیگم نے بیٹی کی تلاش میں ناکامیابی کے باوجود بھی پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ کیوں؟"

میں نے عدالت میں موجود سامعین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔" جناب عالی! میں یہاں پر استغاثہ کے گواہ عبدالرزاق یونین انچارج کے بیان کا حوالہ دے کر معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ اس سے متعلق تمام اہم باتوں کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں۔

"یور آنر! استغاثہ کے گواہان مائیکل اور محمد اسلم کے بیانات میں بھی چند نکات غور طلب ہیں۔ مثلاً مائیکل کے مطابق اسے یہ بات امتیاز شیخ نے بتائی تھی کہ مقتولہ کو ملزم نے قتل کردیا ہے۔ فون بھی امتیاز شیخ نے اپنے فلیٹ سے کیا۔ جب کہ استغاثہ کے گواہ امتیاز شیخ نے اس وقت تک ڈکٹ کے اندر بے گور و کفن پڑی مقتولہ کی لاش کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اس طرح نیلم آرکیڈ کے دس سال پرانے چوکیدار کے مطابق میرا موکل ایک معقول اور شریف النفس انسان ہے۔ وہ مقتولہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تو تھا تاہم اس نے کبھی کسی قسم کی بے ہودگی یا بدتمیزی نہیں کی تھی۔ چھیڑ چھاڑ اور نازیبا جملے کسنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟"

"جناب عالی! اس کے بعد اس مقدمے کے انکوائری افسر کا بیان بھی حیرت انگیز بلکہ افسوسناک ہے۔ اس نے بغیر کسی میڈیکل چیک اپ یا نفسیاتی معالج کے معائنے کے یہ فتویٰ صادر کردیا کہ میرا موکل ایک جنونی اور ایب نارمل انسان ہے جبکہ گواہوں کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ میرا موکل ایک صلح جو اور امن پسند انسان ہے۔ علاوہ ازیں افسوسناک بات یہ ہے کہ انکوائری افسر نے اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہوئے نہ مقتولہ کی گردن سے فنگر پرنٹس اٹھوائے' نہ ملزم کے دانتوں کا ماہرین سے معائنہ کراوایا۔ نہ ہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو غور سے پڑھنے کی کوشش

کی۔"

"یور آنر! پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں درج ہے کہ مقتولہ کی گردن پر دائیں جانب کان سے ذرا نیچے انگوٹھے کے دباؤ کے آثار پائے گئے تھے۔ یقینی طور پر یہ اسی شخص کا انگوٹھا ہوسکتا ہے جس نے مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہاں میں ایک نہایت ہی اہم پوائنٹ کی جانب اشارہ کروں گا۔

"جناب عالی! مقتولہ کی گردن پر دائیں جانب پائے جانے والے انگوٹھے کے نشان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی "رائٹ ہینڈر" شخص نے اس کی گردن دبائی ہوگی کیونکہ انسان مشکل اور خصوصاً زور آزمائی کے کام اسی ہاتھ سے کرتا ہے جس سے وہ عموماً کام کرنے کا عادی ہو۔ مثلاً "رائٹ ہینڈر" افراد تمام اہم مشکل اور قوت صرف ہونے والے کام "رائٹ ہینڈ" سے کریں گے اور 'لیفٹ ہینڈر" افراد 'لیفٹ ہینڈ" سے۔ میں عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ میرا موکل 'لیفٹ ہینڈر" ہے۔ اگر وہ مقتولہ کی گردن دباتا تو مقتولہ کے بائیں جانب' کان سے ذرا نیچے گردن پر انگوٹھے کا دباؤ پڑتا۔ یہ بات بھی میرے موکل کی موافقت میں جاتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مقتولہ فوزیہ کو کسی "رائٹ ہینڈ" شخص نے گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

چند لمحات کو رک کر میں نے جج کی جانب دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔ میں اپنا نقطہ نظر اس کے ذہن میں ڈالنے میں کامیاب رہا تھا۔

میں نے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" جناب عالی! فلیٹ نمبر تین سو پانچ "اے" کی مکین کا کہنا ہے کہ مقتولہ نے اس کے گھر سے نکلنے کے بعد فلیٹ نمبر تین سو دو "اے" کی گھنٹی بجائی تھی جہاں کہ استغاثہ کا سب سے اہم گواہ امتیاز شیخ رہتا ہے مگر امتیاز شیخ نے اس بات سے سختی سے انکار کیا ہے اور اسے عشرت جہاں کے خواب سے تعبیر کیا ہے۔

"جناب عالی! گواہ امتیاز شیخ متعدد جھوٹ بولنے کے بعد اپنا اعتبار کھو چکا ہے' اس لیے اس کا "انکار" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ امتیاز شیخ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وقوعہ کی رات اس نے ڈکٹ میں کسی بوری نما چیز کے پھینکے جانے کی آواز سنی تھی جبکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی کھوپڑی' گردن اور ریڑھ کی ہڈی اور بازو ٹانگ کی ہڈیاں جس بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی ہیں' اس سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ مقتولہ کو ڈکٹ کے دروازے سے اندر نہیں پھینکا گیا بلکہ کہیں اونچائی سے نیچے پھینکا گیا ہے۔ یہ بات اس صورت میں پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ابھی تک ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی پولیس مقتولہ کی ہڈیوں کا سرمہ بننے کا کوئی معقول سبب نہ تو بیان کرسکی ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی ثبوت فراہم کرسکی ہے۔ گواہ امتیاز شیخ کا یہ کہنا کہ اس نے وقوعہ کی رات ملزم کو ڈکٹ کے دروازے کے قریب دیکھا تھا' سراسر مبنی بر دروغ ہے۔ میرا موکل قطعاً اس رات ڈکٹ کی جانب نہیں گیا تھا۔ پتا نہیں گواہ شیخ صاحب کو اس افسانہ طرازی کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

اس وقت عدالت میں امتیاز شیخ اپنی بیوی پروین کوثر کے ساتھ موجود تھا۔ کوثر کو عدالت کے کمرے تک لانے کا سہرا افضل خان کی بیوی گل ریز کے سر بندھتا تھا جو اس وقت پروین کوثر کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ گل ریز کی فراہم کردہ اطلاعات (گل بہار اور نیلم آرکیڈ کی جانب سے) کی روشنی ہی میں' میں نے اس کیس کو فائنل ٹچ لگانے کے لیے یہ سنسنی خیز انداز اختیار کیا تھا۔

میں نے دیکھا' میرے آخرالذکر دلائل کو سن کر امتیاز شیخ کرسی میں پہلو بدلنے لگا تھا۔ اس کی بے چینی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا موجود ہے۔

میں نے انتہائی ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنے دلائل کی گاڑی کو آگے بڑھایا۔

''یور آنر! یہاں سے ایک نہایت ہی دلچسپ' رومان پرور' عبرت ناک اور رونگٹے کھڑے کردینے والی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا۔ باری باری وکیل استغاثہ' امتیاز شیخ اور انکوائری افسر کو دیکھا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! جاوید نامی ایک نوجوان کسی فوزیہ نامی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ محبت کی نشانی کے طور پر جاوید' فوزیہ کو ایک طلائی انگوٹھی پیش کرتا ہے۔ اس انگوٹھی پر ایک تتلی بنی ہوئی ہے جس کے دونوں پروں پر انگریزی کا ایک ایک حرف بنا ہوا ہے۔ ایک پر ''ایف'' اور دوسرے پر ''جے'' یعنی ایف سے فوزیہ اور جے سے جاوید۔ کچھ عرصے بعد یہ انگوٹھی ایک پروین نامی عورت کی انگلی میں چلی جاتی ہے کیوں...... آخر کیوں؟''

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ پھر اس سناٹے میں امتیاز شیخ کی بیوی کی تیز آواز گونجی۔ ''یہ انگوٹھی تو امتیاز نے میرے لیے خریدی تھی۔''

وہ باقاعدہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور انگلی میں موجود انگوٹھی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس طرح اٹھ کر اچانک کھڑے ہو جانا اس کا ایک غیرارادی عمل تھا۔

اس کے ساتھ ہی امتیاز شیخ نے اٹھ کر دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ میں نے بآواز بلند کہا۔ ''جانے نہ پائے۔''

عدالت میں موجود پولیس اہلکاروں نے فوراً کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے امتیاز شیخ کو بے بس کرکے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔

صورت حال میں اتنی تیزی سے تبدیلی آئی تھی کہ وہاں موجود ہر شخص ہکابکا رہ گیا تھا۔ سوائے میرے' افضل خان اور گل ریز کے جو اس ڈرامے کے ڈائریکٹر پروڈیوسر تھے۔

پروین کوثر نے روتے ہوئے بتایا کہ امتیاز نے ایک سال قبل وہ انگوٹھی تحفے میں دی تھی۔ جب اس نے تتلی کے پروں پر موجود ''ایف'' اور ''جے'' کے حروف کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے یہ کہہ کر بات نبھادی تھی کہ یہ کمپنی کا ٹریڈ مارک ہے یعنی...... فردوس جیولرز۔''

مقتولہ کی ماں سلطانہ بیگم نے بھی تصدیق کی۔ ''میری تو مت ہی ماری گئی تھی جو اس انگوٹھی

کا مجھے خیال نہیں آیا۔ یہ واقعی میری فوزیہ کی انگوٹھی ہے مگر یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ انگوٹھی کسی جاوید نے اسے دی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے خود اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔''

کیس کی ایک ایک کڑی آپس میں ملتی جارہی تھی۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! جاوید نامی وہ شخص اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ جس نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر مذکورہ انگوٹھی مقتولہ کو دی تھی۔ وہ اس انگوٹھی کی خریداری کی رسید بھی اپنے ساتھ لایا ہے۔''

پھر میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جاوید نامی اس نوجوان کو گواہی کے لیے پیش کردیا۔ فوزیہ کی جاوید سے محبت اور پروین کوثر کے ہاتھ میں اس انگوٹھی کی موجودگی کے بارے میں افضل خان کی بیوی نے مجھے بتایا تھا' باقی کی کڑیاں میں نے خود ہی ملالی تھیں۔

جج کے حکم پر پروین کوثر کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی اتروالی گئی اور اسے انکوائری افسر کے حوالے کرتے ہوئے جج نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''سات دن کے اندر اندر اپنا چالان پیش کرو۔''

انکوائری افسر' امتیاز شیخ کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گیا۔ صورت حال کھل کر سامنے آچکی تھی۔ جج نے اسی روز میرے موکل اور اس مقدمے کے مبینہ ملزم کی رہائی کے احکامات صادر کردیے۔

امتیاز شیخ بہت کم ہمت ثابت ہوا تھا۔ اس نے ایک ہی رات کی ''مہمان داری'' میں اقبال جرم کرلیا۔

چلتے چلتے امتیاز شیخ کے اقبالی بیان کا خلاصہ پیش کروں گا۔ وقوعہ کے روز چھ بجے مقتولہ نے اس مقصد سے امتیاز شیخ کے گھر کی گھنٹی بجائی تھی کہ ایک روز پہلے پروین کوثر نے اسے گوشت دینے کو کہا تھا۔ چند روز قبل عید قرباں گزری تھی۔ پروین نے گھر سے جاتے وقت امتیاز کو یہ بات بتادی تھی کہ چھ بجے فوزیہ گزشت لینے آئے گی۔ وہ فریج میں رکھی ہوئی گوشت کی فلاں تھیلی اس کے حوالے کردے۔ اس روز چونکہ پروین کو پانچ بجے گھر میں نہیں ہونا تھا' اس لیے فوزیہ کو اس نے کام سے بھی منع کردیا تھا۔

حسب پروگرام فوزیہ نے قربانی کے گوشت والی تھیلی لینے کے لیے فلیٹ نمبر تین سو دو ''اے'' کی گھنٹی بجائی۔ امتیاز نے دروازہ کھولا اور فوزیہ کو اندر بلالیا۔ فوزیہ کے لیے اس کے گھر آنا کوئی نئی بات نہیں تھی' تاہم پروین کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ تھوڑا ہچکچائی ضرور تھی۔

امتیاز نے بتایا کہ نہ جانے اس وقت کیا ہوا کہ اچانک شیطان نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہوکر رہ گئیں۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوچ تھی کہ وہ فوزیہ کو حاصل کرلے۔ پتا نہیں کسی طرح اس نے فوزیہ کو قابو کیا کہ اس کے حلق سے معمولی سی چیخ بھی برآمد نہ ہوسکی۔ امتیاز شیخ کے مطابق اس وقت شیطان پوری طرح اس ''شیطانی عمل'' میں اس کی مدد کررہا تھا

اور وہ ایک طرح سے حیوان بن گیا تھا۔ اس نے نیم بے ہوش فوزیہ کے ساتھ وہ سلوک کیا' تہذیب جس کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔

کافی دیر کے بعد جب اس کے حواس بہ جا ہوئے تو وہ اپنے کرتوت پر شرمندہ ہونے کے بجائے خوفزدہ ہوگیا۔ اس دوران میں کافی وقت گزر چکا تھا۔ وہ کسی بھی طور پر یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ فوزیہ اس کے فلیٹ سے زندہ سلامت واپس جائے۔

سوچ بچار میں دس بج گئے۔ فوزیہ کو قابو کرنے کے لیے شیطان نے پتا نہیں اس کے ہاتھ سے ایسا کیا کروادیا تھا کہ تباہ و برباد ہونے کے باوجود بھی فوزیہ اب تک نیم بیہوش تھی۔ وہ زندہ تھی مگر مردوں کی مانند۔

بالآخر امتیاز نے اس کا گلا گھونٹ کر قصہ تمام کردیا۔ اس کے بعد وہ لاش سے چھٹکارے کی سبیل سوچنے لگا۔ وہ نصیب خان کی فوزیہ سے چھیڑ چھاڑ اور یونین انچارج کی سرزنش سے آگاہ تھا۔ اس نے نصیب خان کو قربانی کا بکرا بنانے کی ترکیب پر عمل کرڈالا۔ نصف شب کے بعد جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا' اس نے برہنہ فوزیہ کی لاش کو اپنی کھڑکی کے موکھلے میں سے تین فلور نیچے ڈکٹ میں پھینک دیا۔ ایک ''ڈھپ'' کی آواز پیدا ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ مردہ فوزیہ جب اتنی بلندی سے ڈکٹ کے پختہ فرش پر سر کے بل گری تو اس کا جو حشر ہوا' وہ لرزہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت اثر بھی تھا۔ لاش کے پیچھے ہی اس نے فوزیہ کا لباس بھی گول تہ کرکے پھینک دیا۔

صبح بستر سے امتیاز کو وہ تتلی والی انگوٹھی ملی جس پر ''ایف'' اور ''جے'' کے حروف بنے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ تو اس نے وہ انگوٹھی اپنے پاس چھپائے رکھی پھر پروین کوثر کی سالگرہ کے موقع پر اسے گفٹ کردی جو بالآخر امتیاز کی موت کا پروانہ ثابت ہوئی۔

ایک طرح سے فوزیہ کا مقدمہ اس کی انگوٹھی نے لڑا تھا۔ وہ انگوٹھی جو جاوید اور فوزیہ کے بیچ محبت کا ایک بندھن تھی۔ میں نے تو اپنے موکل کو رہا کروانے کی کوشش کی تھی' فوزیہ کی اس انگوٹھی نے اس کے قاتل اور عزت کے لٹیرے کو بالآخر کیفر کردار تک پہنچادیا۔

سچ کہتے ہیں کہ نامحرم مرد اور عورت کو تنہائی میں ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے۔ اس نازک موقع پر شیطان ان کے بیچ موجود ہوتا ہے جوان کو بہکانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے...... پھر ہوس اور بربریت کی ایسی ہی داستانیں جنم لیتی ہیں جن کو سن کر اور پڑھ کر انسان کی روح تک لرز اٹھتی ہے۔

اللہ ہمیں شیطان کا آلہ کار بننے سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیے۔ آمین۔

☆......☆......☆

دوسرا رخ

اٹھائیس جنوری کی شام جو شخص سب سے آخر میں میرے دفتر میں داخل ہوا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مذکورہ شخص قد کاٹھ اور وضع قطع میں ''ڈاکٹر نو'' کا کردار ادا کرنے والے ہالی ووڈ کے سپر اسٹار شان کونری سے مشابہ تھا۔ خال و خط اور نشست و برخاست میں بھی گہری مماثلت پائی جاتی تھی تاہم حقیقت یہ تھی کہ شان کونری (جیمس بانڈ) سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ خالصتاً ایک مقامی آدمی تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا اور شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

''جی فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

میں نے رف پیڈ اپنے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مصیبت کی تفصیل کیا ہے؟''

وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گیا پھر جلدی سے بولا۔ ''دراصل' میں نہیں بلکہ میرا ایک محسن مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

میں نے کہا: ''حضرت! آپ پہلے اپنے بارے میں' اپنے محسن کے بارے میں اور مصیبت کے بارے میں مجھے پوری تفصیل سے آگاہ کریں پھر میں بتا سکوں گا کہ آپ کیلئے کیا کیا جا سکتا ہے۔''

وہ جواب دینے کے بجائے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے میرے دفتر کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ میں نے محسوس کیا یا تو وہ اس وقت سخت پریشان تھا یا پھر بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں اضطرار پایا جاتا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس اور پچاس کے درمیان لگایا جو ازاں بعد بڑی حد تک درست ثابت ہوا۔ اس کی عمر چھیالیس سال تھی۔

جب وہ دس پندرہ مرتبہ میرے دفتر میں موجود اشیاء کا جائزہ لے چکا تو میں نے کھنکار کر

اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔ اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرا نام اجمل شاہ ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے وہ آگے بڑھا۔ ''اور میرے محسن کا نام افتخار ہے...... افتخار قریشی۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا: ''اور وہ مصیبت کیا ہے جو آپ کو کھینچ کر میرے پاس لے آئی ہے؟''

''میرے محسن افتخار کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا: ''آپ کے محسن کو کب اور کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''افتخار صاحب نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''پولیس نے کوئی تو الزام عائد کیا ہوگا۔''

''افتخار صاحب پر قتل کا الزام ہے۔''

''کس کا قتل؟''

''ان کی بیوی شمسہ کنول کا قتل۔'' اجمل شاہ نے جواب دیا۔

میں تمام اہم نکات پیڈ پر نوٹ کرتا چلا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا: ''آپ کے محسن افتخار قریشی کی بیوی شمسہ کنول کو کب اور کہاں قتل کیا گیا ہے؟''

اس نے بتایا: ''دو روز پہلے ان کے بنگلے پر...... یعنی پچیس اور چھبیس تاریخ کی درمیانی شب۔''

''افتخار کو کب گرفتار کیا گیا ہے؟''

''گزشتہ روز علی الصباح!''

''یعنی ستائیس جنوری کو صبح۔''

''جی ہاں' بالکل ستائیس جنوری کی صبح۔''

میں نے پوچھا: ''اب تک پولیس نے کیا کارروائی کی ہے؟''

''آج صبح پولیس نے افتخار صاحب کو عدالت میں پیش کیا تھا۔'' اجمل شاہ نے بتایا۔

''انہوں نے سات یوم کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' ملزم ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' پھر پوچھا: ''آپ اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

وہ حتمی لہجے میں بولا: ''سب سے پہلے تو میں افتخار صاحب کی ضمانت چاہتا ہوں...... اور ضمانت کے بعد باعزت رہائی۔''

میں نے کہا: ''قتل کے ملزم کی ضمانت اتنی آسانی سے نہیں ہوتی۔''

''میں یہ جانتا ہوں کہ آپ بہت کامیاب اور تجربہ کار وکیل ہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہاں آنے سے قبل آپ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا: ''بیگ صاحب! ایک کامیاب وکیل اگر اپنی سی کوشش کرے تو ضمانت آسانی سے نہ سہی' مشکل سے سہی' بہرحال ہو جاتی ہے۔ اخراجات وغیرہ کی آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی پوری فیس میں ابھی ایڈوانس دینے کو تیار ہوں۔ دیگر عدالتی اخراجات بھی قدم قدم پر ادا کردیئے جائیں گے۔ ضمانت کا بھی بندوبست ہوسکتا ہے۔ شخصی بھی اور رقم کی صورت میں بھی۔ بس آپ کیس لینے کی حامی بھرلیں۔''

میں نے کہا: ''ابھی تک آپ نے کیس کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔''

''کیس بس اتنا ہے کہ افتخار صاحب نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''اس کے باوجود بھی پولیس نے انہیں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ ایک بے گناہ شخص کو پولیس کے چنگل اور قتل کے الزام سے آپ نے باعزت بری کروانا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا اور بولا۔ ''میں نے مختصر الفاظ میں آپ کو اپنا مدعا بتا دیا ہے۔ اب جو کچھ بھی کرنا ہے' وہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ دعا کریں یا دوا کریں مگر جلدی کریں۔''

اس کے انداز میں ایک عجیب سا جارحانہ پن پایا جاتا تھا۔ اس کے رویے سے مجھے ناگواری محسوس ہوئی تھی تاہم میں نے اپنے چہرے سے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور حتی الامکان خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اجمل صاحب! آپ کا اپنے محسن کے افتخار قریشی سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے بیگ صاحب!'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

''میں اسی گہرائی کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں۔''

وہ بولا ''افتخار قریشی میرے باس ہیں مگر میں نے ہمیشہ انہیں اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔ وہ بھی مجھ سے چھوٹے بھائیوں جیسا شفقت اور محبت کا سلوک کرتے ہیں۔''

''کیا افتخار صاحب کوئی بزنس وغیرہ کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''افتخار صاحب صنعتکار ہیں۔''

''صنعت کی نوعیت کیا ہے؟''

''ان کی بال پین تیار کرنے کی ایک فیکٹری ہے۔'' اجمل شاہ نے بتایا۔

میں نے سوال کیا: ''فیکٹری کا نام کیا ہے؟''

''قریشی انجینئرز!''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ ''یہ تو خاصا جانا پہچانا نام ہے۔'' میں قریشی انجینئرز اور ان کے تیار کردہ بال پین پروڈکٹس سے واقف تھا۔

وہ بولا ''جی ہاں وکیل صاحب! ہماری فیکٹری کے تیار کردہ بال پین اعلیٰ معیار کے حامل

ہوتے ہیں۔ ہم ایکسپورٹ کوالٹی کا مال تیار کروا کر بیرون ملک بھیجتے ہیں اور آج تک کہیں سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ نہ اندرون ملک سے اور نہ ہی بیرون ملک سے۔"

میں نے پوچھا "اجمل صاحب! آپ "قریشی انجینئرز" میں کیا کرتے ہیں؟"

"جناب! میں اس فیکٹری کا جنرل منیجر ہوں۔"

"اچھا اچھا!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ جذباتی لہجے میں بولا: "بیگ صاحب! کہنے کو تو میں قریشی انجینئرز کا ایک ملازم ہی ہوں مگر افتخار صاحب نے کبھی میرے ساتھ ملازموں جیسا رویہ نہیں اپنایا بلکہ ہمیشہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد' اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھا ہے اور اب...... ان پر وقت آن پڑا ہے تو میرا یہ فرض بنتا ہے کہ ان کی باعزت بریت کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دوں۔"

میں اس کے جذبہ ایثار اور فرض شناسی سے خاصا متاثر ہوا۔ میں نے کہا: "اجمل صاحب! میں آپ کے باس یعنی آپ کے محسن افتخار کا کیس لینے کو تیار ہوں لہٰذا اس سلسلے میں آپ کو جو کچھ بھی معلوم ہے' اس سے بالتفصیل مجھے آگاہ کریں۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی غیر اہم بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بعض اوقات' بہ ظاہر بے وقعت نظر آنے والی کوئی چیز ازاں بعد بہت اہم اور مفید ثابت ہوتی ہے۔"

آئندہ آدھے گھنٹے تک اجمل شاہ سے مجھے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کا بیان ختم ہوا تو میں نے کہا۔

"شاہ صاحب! بتا ہے' یہاں سے رخصت ہونے کے بعد پہلا کام آپ کیا کریں گے؟"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم بیگ صاحب!"

میں نے اس سے اس تھانے کا نام پوچھا جس کی حوالات میں افتخار قریشی بند تھا پھر کہا۔

"آپ سب سے پہلے متعلقہ تھانے جائیں گے اور وہاں سے "ایف آئی آر" کی ایک نقل حاصل کر کے مجھ تک پہنچائیں گے۔"

"کیا ابھی اور اسی وقت؟" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا: "ابھی واپس میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کل کسی وقت میرے دفتر آ کر وہ نقل مجھے یا میرے دفتر کے کسی آدمی کو دے سکتے ہیں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن انداز میں بولا۔ "پھر تو میں تھانے بھی کل صبح ہی جاؤں گا۔"

"یہ آپ غلطی کریں گے۔" میں نے سرزنش والے انداز میں کہا۔

"بیگ صاحب! اس میں غلطی والی کون سی بات ہے؟"

"لگتا ہے' آپ کا پہلے کبھی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا!"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی لہجے میں بولا۔ "واقعی' آج سے پہلے

نہ تو پولیس سے کبھی واسطہ پڑا ہے اور نہ ہی عدالت وغیرہ سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بہر حال' آپ کسی غلطی کی نشاندہی کر رہے تھے۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دن میں عموماً تھانہ انچارج صاحبان تھانے میں مہیا نہیں ہوتے۔ وہ شام کے بعد ہی نظر آتے ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ یہاں سے آپ سیدھے متعلقہ تھانے کا رخ کریں۔ ایف آئی آر کی نقل آج کی تاریخ میں حاصل کر لیں اور کل کسی وقت مجھے پہنچا دیں۔ مذکورہ نقل سے بھی مجھے کیس کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے اور اس سے پولیس کا موقف بھی ظاہر ہو جائے گا۔"

"میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا بیگ صاحب!"

"ایک بات اور......" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے مگر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا: "پولیس والوں سے چونکہ یہ آپ کا پہلا سابقہ ہے' اس لئے یہ بات ذہن میں رکھئے گا کہ ایف آئی آر کی نقل حاصل کرنے کیلئے آپ کو تھوڑی بہت رقم پولیس والوں کی "خدمت" کے ذیل میں خرچ کرنا پڑے گی۔ آپ کا بندہ قتل کے الزام میں ریمانڈ پر ہے اس لئے وہ آپ سے سیدھے منہ بات نہیں کریں گے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے بیگ صاحب!"

"اور یہ بھی ممکن ہے۔" میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پولیس والوں نے خود بھی آپ کے باس سے کسی تگڑی رقم کا مطالبہ کیا ہو۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تفتیش کے نام پر ملزم کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اس کارروائی کا مقصد جرم اگلوانے سے زیادہ ملزم سے رقم بٹورنا ہوتا ہے۔ نچلے عملے کے ذریعے ملزم کے ذہن میں یہ بات نقش کرا دی جاتی ہے کہ اگر "تفتیش" سے بچنا ہے تو ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔"

وہ تشویشناک لہجے میں بولا "کیا قانون میں' پولیس کے اس غیر انسانی رویے کے خلاف کوئی سزا نہیں ہے؟"

"قانون میں ہر چھوٹے بڑے جرم کیلئے سزا موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ جرم پہلے قانون کے سامنے ثابت کرنا پڑتا ہے' اس کے بعد ہی سزا کا مرحلہ آتا ہے اور پولیس والوں کا کوئی جرم ثابت کرنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ وہ لوگ اتنی صفائی سے کام کرتے ہیں کہ اپنے کیے کا کوئی نشان یا سراغ نہیں چھوڑتے۔"

"یہ تو اندھیر نگری ہے بیگ صاحب!"

"بلاشبہ کسی حد تک ہے۔" میں نے دیانتداری سے تائید کی۔

وہ کافی دیر تک اس موضوع پر سوالات کرتا رہا پھر آخر میں پوچھنے لگا۔ "آپ نے ابھی

تک اپنی فیس کے بارے میں نہیں بتایا بیگ صاحب؟''
میں نے اسے اپنی فیس کی رقم بتائی اور دوٹوک الفاظ میں کہا: ''میں فیس ایڈوانس لی
ہوں۔ یہ میرا اٹل اصول ہے۔''

''میں آپ کے اصول کی پابندی کروں گا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''پھر اس نے فوراً اپنی جیب سے میری مطلوبہ فیس کی رقم نکال کر میری جانب بڑھا دی
میں نے فیس کی وصولی کی رسید لکھ کر اسے تھما دی۔

وہ ''خدا حافظ'' کہتے ہوئے اگلے روز دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے میرے دفتر سے رخص
ہوگیا۔

اجمل شاہ نے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذ
کر کے میں مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ اس کیس
پس منظر سے واقف ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار
ہو۔

☆......☆......☆

''قریشی انجینئرز'' نامی فیکٹری افتخار قریشی کے والد فضل قریشی نے قائم کی تھی۔ افتخار کو
جمایا کاروبار ورثے میں یا یوں کہہ لیں ترکے میں ملا تھا۔ افتخار اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا' با
اسی طرح جس طرح توصیف افتخار کی واحد اولاد تھا۔

کہتے ہیں' اکلوتی اولاد والدین کو بہت عزیز ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے
مگر عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جواباً اس اکلوتی اولاد کو والدین کچھ زیادہ عزیز نہیں ہوتے۔ وہ ا
بچے سے جتنی محبت اور لاڈ پیار کرتے ہیں' اس کے نتیجے میں بچہ ان کا اتنا خیال نہیں رکھتا جس کے
حق دار ہوتے ہیں۔ خیر' یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔ افتخار اپنے والد فضل قریشی کے نقش قدم پر
ہوئے بہت لائق فائق ثابت ہوا تھا' جبکہ توصیف بالکل اس کے برعکس نکلا تھا۔ دنیا کی ہر
آسائش اور سہولت میسر ہونے کے باوجود بھی اس نے نہ تو تعلیمی میدان میں کوئی کارنامہ انجام د
اور نہ ہی کاروباری معاملات میں اپنے باپ کا دایاں ہاتھ بننے کی کوئی کوشش کی تھی۔ اس نے رو د
گرے پڑے نمبروں سے میٹرک تو کرلیا تھا مگر اس کے بعد آوارگی اور حماقتوں کو اپنا شعار بنا لیا
توصیف کو دیکھ کر افتخار قریشی کا دل کڑھتا تھا مگر وہ ہر ممکنہ کوشش کر کے دیکھ چکا تھا۔ توصیف کی
نصابی سرگرمیوں اور نصابی بے رغبتیوں میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔

توصیف' افتخار قریشی کی دوسری بیوی شمسہ کنول کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور اس وقت
کی عمر لگ بھگ بیس سال تھی۔ افتخار نے پہلی بیوی ناہید کے ساتھ پانچ سالہ ازدواجی زندگی گزا
تھی جو تلخیوں اور ترشیوں کا مرقع تھی۔ صبح شام کے جھگڑوں سے تنگ آ کر بالآخر افتخار نے نا
طلاق دے دی تھی۔ اس طلاق کی دیگر وجوہات کے ساتھ سب سے اہم سبب ناہید کا بدزبان اور

ہوتا تھا۔ افتخار قریشی کو اپنی نسل چلانے کیلئے اولاد کی ضرورت تھی اور ناہید کو شہر کے تمام تجربہ کار
ڈاکٹروں نے بانجھ قرار دے دیا تھا۔ ممکن تھا' وہ ناہید کی موجودگی میں ہی دوسری شادی کرلیتا مگر ایک
تو ناہید نے سختی سے اس کی مخالفت کی تھی' دوسرے افتخار ناہید جیسی تنک مزاج' جھگڑالو اور بدکلام عورت
کے ساتھ مزید زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ناہید اس کے اپنے خاندان سے تھی اور
دوسری شادی کے ذکر پر اس نے نہ صرف شدید ہنگامہ کیا تھا بلکہ افتخار کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ اس
سوتن لایا تو وہ اپنے بھائیوں کے ذریعے اسے یادگار مزہ چکھائے گی۔ ناہید کا ایک بھائی پولیس میں
بھی تھا۔

افتخار قریشی روز روز کی دانتا کل کل سے چھٹکارا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ہمت سے کام لیا اور
کسی قسم کے خطرے کی پروا کیے بغیر اس نے ناہید کو طلاق دے دی۔ اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ
کردیا تھا مگر ذہن کے ایک گوشے میں اس بات کے امکانات موجود تھے کہ ناہید کوئی نہ کوئی ٹنٹا کھڑا
کرنے کی کوشش کرے گی لیکن سب خیریت گزری۔ ناہید کی خوفناک دھمکی کسی گیدڑ بھبکی سے زیادہ
کچھ ثابت نہیں ہوئی تھی۔

ایک سال کے اندر ہی افتخار قریشی نے دوسری شادی کرلی۔

اس کی دوسری بیوی اس کی منکوحہ بننے سے پہلے اسی کے دفتر میں ملازم تھی۔ شمسہ کا تعلق
ایک انتہائی غریب خاندان سے تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور والدہ محنت مزدوری وغیرہ سے
گھر چلا رہی تھیں۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد شمسہ عملی میدان میں اتر آئی۔ ٹائپنگ وغیرہ اس نے
میٹرک کے بعد ہی سیکھ لی تھی۔ اس کی پہلی اور آخری جاب افتخار قریشی کے دفتر ہی کی تھی۔ جب اس
نے نوکری جوائن کی تو اس کی عمر انیس سال سے زیادہ نہیں تھی پھر ایک سال کے اندر ہی ان کی شادی
ہوگئی۔ جب بحیثیت ٹائپسٹ شمسہ نے ''قریشی انجینئرز'' جوائن کی' اس وقت افتخار ناہید کو طلاق دے
چکا تھا۔

افتخار نے شمسہ سے شادی کر کے ایک نیا تجربہ کیا تھا جو صد فیصد کامیاب رہا تھا۔ وہ اپنے
سے کہیں کم معاشی حیثیت کی لڑکی سے شادی کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ خاندان چھوٹا ہو یا بڑا'
اعلیٰ ہو یا ادنیٰ' کم تر' اچھا انسان ہمیشہ اچھا ہی رہتا ہے اور اگر دو افراد کے درمیان محبت کا رشتہ استوار
ہو جائے تو پھر تمام اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

اور یہ حقیقت تھی کہ افتخار کو شمسہ سے محبت ہوگئی تھی۔

چند دنوں ہی میں شمسہ نے اس کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ شمسہ کے پاس اس کی سب سے
بڑی اور نمایاں خوبی اس کا حسن تھا۔ وہ دلکش خال و خط کی مالک ایک حسین و جمیل لڑکی تھی' اس پر طرہ
یہ اس کی عادات' حرکات و سکنات اور رویے میں ایک توازن اور تہذیب پائی جاتی تھی۔ آن وے
میں دو ماہ کے اندر افتخار نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ وہ شمسہ سے شادی کر کے رہے گا۔ شمسہ اسے اپنے
خوابوں کی تعبیر دکھائی دیتی اور فی زمانہ یہ بہت بڑی بات تھی۔ افتخار نے جب شمسہ کے بارے میں

تحقیق کر کے اتنی تسلی کر لی تو اس کی جانب قدم اٹھایا۔ ابتدائی چند کوششوں ہی میں اسے اندازہ ہوگ
کہ دونوں جانب آگ ہے برابر لگی ہوئی۔

الغرض افتخار نے شمسہ کی والدہ سے ملاقات کی۔ والدہ نے شمسہ سے اس کی مرض
دریافت کی اور ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ افتخار سے شادی کے بعد شمسہ
دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ گویا زمین سے آسمان پر آ گئی تھی۔ افتخار کو بھی زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوا
کہ عورت خصوصاً بیوی کی خالص' بے غرض اور سچی محبت کیا ہوتی ہے۔ افتخار نے دیگر امور کے سا
شمسہ کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شمسہ نے پہلے گریجویشن کیا' پھر ماسٹرز بھی کر لیا۔ ازیں علا
افتخار نے اسے اپنے ساتھ ہی فیکٹری کے معاملات میں بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ اپنے کاروبار کی اونچ
اور دیگر امور پر گھنٹوں لیکچر دیتا۔ شمسہ صحیح معنوں میں اس کی نصف بہتر ثابت ہو رہی تھی۔ شادی
ایک سال بعد ہی ان کے یہاں توصیف نے جنم لیا تھا۔ افتخار کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا' اس کا
جانشین ثابت ہو مگر......اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

جیسے جیسے شمسہ فیکٹری کے معاملات کو سمجھ رہی تھی' ویسے ویسے افتخار قریشی فیکٹری میں
عمل دخل کم کر رہا تھا۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی جب توصیف نے کسی قسم کی کارکردگی ظا
نہ کی تو افتخار اس کی طرف سے مایوس ہو گیا اور وہ زیادہ سے زیادہ شمسہ پر انحصار کرنے لگا۔ شم
باقاعدگی سے فیکٹری جاتی' پورا دن دفتر میں گزارتی' اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی اور اپنی نگرانی میں فیکٹ
کے معاملات کو چلاتی۔ شمسہ نے اتنی ذمے داری سے تمام کام سمجھا' سیکھا اور سنبھالا تھا کہ افتخار
حیرت ہوتی تھی پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ انڈی پینڈنٹ فیکٹری چلانے لگی۔ افتخار اس کے سا
فیکٹری جاتا ضرور تھا مگر عملی طور پر اس نے فیکٹری کے معاملات میں دلچسپی لینا ختم کر دی تھی۔

اس کی ایک بڑی وجہ اس کی فطری تن آسانی بھی تھی یا یوں کہہ دیں کہ شمسہ نے ا
مستعدی اور کارکردگی سے اسے تن آسان بنا دیا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں افتخار کا دایاں بازو ثابت
رہی تھی۔ اس نے بیٹے سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں' وہ بیٹے کی ماں پوری کر رہی تھی۔ ہر گزر
دن کے ساتھ ان کے درمیان محبت کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے
جتنا قریب آ رہے تھے' توصیف ان دونوں سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بری صحبت نے ا
آوارہ اور آوارگی نے ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنی ماں اور باپ سے صرف ایک مقصد کی خاطر ملتا تھا۔
جب بھی ان کے قریب آتا' صرف ایک ہی مطالبہ کرتا......اسے کسی نہ کسی مد میں رقم کی ضرورت
تھی اور یہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رقم مہیا کر دیتے تھے۔

توصیف اپنے والدین کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں
باپ اسے بے پناہ چاہتے ہیں' گویا دوسرے لفظوں میں وہ انہیں بلیک میل کرتا تھا۔ ایموشنل ب
ملینگ صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس نازک تجربے سے عملی طور پر گزرے ہوں۔

افتخار نے جب بھی اسے تعلیم مکمل کرنے کیلئے کہا تو اس کا ایک ہی رٹا رٹایا جواب ہوتا

''تعلیم میں کیا رکھا ہے ڈیڈی! بڑی بڑی ڈگریوں والوں کو میں نے معمولی نوکریوں کی
تلاش میں جوتے چٹخاتے دیکھا ہے۔''

افتخار قریشی اسے سمجھاتا ''انسان صرف نوکری حاصل کرنے کیلئے تو تعلیم حاصل نہیں کرتا۔
یہ تو انسان کا زیور ہے۔ ایک ایسا سرمایہ ہے جس کی کوئی چوری نہیں کر سکتا۔''

''ایسا سرمایہ آج کل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے ڈیڈی!'' وہ فلسفیانہ انداز میں کہتا۔ ''موجودہ
دور میں جس سرمائے کی ویلیو ہے وہ آپ کے پاس بے اندازہ موجود ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے'
جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے' معاشرے میں اس کی اتنی ہی زیادہ عزت ہوتی ہے۔ تعلیم
وغیرہ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کسی بھی وی آئی پی کلب یا جیم خانہ یا ایسے ہی کسی تفریحی اور تقریبی مقام پر
سوٹ بوٹ سے عاری افراد کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے' چاہے ان ''ناٹ آلاوڈ'' افراد میں کوئی کتنا بھی
زیادہ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ سوسائٹی میں صرف صاحب ثروت لوگوں کو عزت دی جاتی ہے اور شکر ہے
کہ آپ کی دولت نے مجھے بے انتہا عزت دے رکھی ہے۔''

بیٹے کی عجیب و غریب سوچ پر افتخار قریشی سوائے افسوس کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا
تاہم اس کو ہر حال میں سمجھانا بھی ضروری تھا اس لئے وہ اپنی کوشش جاری رکھتا۔

''دیکھو بیٹے! یہ حقیقت ہے کہ آج جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہارا اور تمہاری والدہ کا ہی
ہے مگر تمہیں اندازہ نہیں کہ میں نے اس مقام تک پہنچنے کیلئے کس قدر محنت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں' وہ
محنت تم بھی کرو۔ محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اکنامکس کا ایک اصول ہے کہ دولت کو محنت کے
ساتھ حرکت میں رکھا جائے تو وہ بڑھتی رہتی ہے۔ ایک جگہ رکھی ہوئی دولت چاہے قارون کا خزانہ ہی
کیوں نہ ہو' وہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔''

توصیف نے ان ناصحانہ باتوں سے اکتا کر کہا ''ڈیڈی! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں بیٹا کہ تمہیں میری کمائی ہوئی دولت پر تکیہ کرنے کے بجائے
دولت کمانے کا ہنر سیکھنا چاہئے۔'' افتخار قریشی نے تاکیدی لہجے میں کہا۔

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں ڈیڈی!''

''مگر عمل کچھ نہیں ہے؟'' افتخار نے شکایتی انداز میں کہا۔

''میں عمل تو اس وقت کروں جب آپ کوئی گر بتائیں۔''

''گر میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔'' افتخار نے کہا۔ ''تعلیم حاصل کرو۔ بہت زیادہ تعلیم۔''

''اگر دولت کمانے کا یہی گر ہے ڈیڈی تو میں اس کوشش سے باز آیا۔'' وہ نفی میں سر
ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے مشاہدے نے جو کچھ مجھے سکھایا ہے' وہ میرے لئے زیادہ اہم ہے۔'' میرا
پختہ خیال یہ ہے کہ ترقی کرنے کیلئے اعلیٰ تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

افتخار قریشی نے مجروح لہجے میں استفسار کیا۔ ''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''کوئی بزنس وغیرہ۔'' توصیف نے بے پروائی سے کہا۔

''مثلاً کون سا بزنس؟''

''آپ مجھے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھلوا دیں۔'' توصیف نے کہا۔ ''سنا ہے' اس کام میں بڑا مارجن ہے۔''

افتخار بیٹے کی ترجیحات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ آج کل آوارہ دوستوں کے ساتھ مل کر جس طرح لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا تھا اس کی سن گن افتخار اور شمسہ کو بھی تھی۔ وہ اس گمبھیر مسئلے پر رات دن سوچتے رہتے تھے اور بالآخر ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے کہ توصیف کی شادی کر دی جائے تاہم اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں بھی بہت سی دشواریاں حائل تھیں۔ اب توصیف نے جو ایڈورٹائزنگ ایجنسی والی بات کی تھی تو اس کے پس پردہ بھی لڑکیاں ہی تھیں۔ شوبزنس میں حسین سے حسین تر بلکہ حسین ترین لڑکیوں کی ریل پیل رہتی ہے۔ توصیف اگر اس لائن میں جانا چاہتا تھا تو اس کی وجہ یہی چکا چوند اور رنگینی تھی۔

افتخار نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''ممکن ہے' ایڈورٹائزنگ کے کام میں پیسا ہو لیکن کسی بھی طور پر یہ مناسب نہیں کہ اپنا چلتا ہوا کاروبار چھوڑ کر کسی ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جائے پہلے جس کا تجربہ نہ ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا: ''میرا خیال ہے' ہماری فیکٹری دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اگر تم فیکٹری کے معاملات میں دلچسپی لو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ ویسے بھی میرے بعد تمہیں ہی یہ کاروبار سنبھالنا ہوگا۔''

''میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں ڈیڈی۔''

''کیا مطلب بیٹا؟''

توصیف نے کہا: ''پہلی بات تو یہ کہ مجھے آپ کے کاروبار میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہے' دوسرے جہاں تک تجربے کی بات ہے تو جب تک انسان کوئی کام کرے گا نہیں' اسے تجربہ کیسے حاصل ہوگا۔ میں بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول کر تجربہ حاصل کر لوں گا۔''

افتخار کیلئے بیٹے کو سمجھانے کا مرحلہ ہمیشہ ہی دقت طلب ہوتا تھا تاہم پھر بھی وہ اپنا فرض کسی نہ کسی طرح پورا کرتا ہی رہتا تھا۔ اس نے توصیف سے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے' میں تمہیں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھلوا دوں گا مگر اس کیلئے میری بھی ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا ڈیڈی!'' توصیف نے سوالیہ نظروں سے افتخار قریشی کو دیکھا۔

''پہلے تم کچھ عرصے کیلئے کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی پر کام کرو گے۔'' افتخار قریشی نے کہا ''جب تمہیں اس کام کا تجربہ ہو جائے گا تو پھر میں تمہیں تمہاری ذاتی ایجنسی بھی کھلوا دوں گا۔ کہو تو میں اپنے ایک دوست سے بات کروں۔ وہ ایک کامیاب ایڈورٹائزنگ کا ادارہ چلا رہا ہے۔

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ آپ میری خواہش پوری نہیں کرنا چاہتے۔'' توصیف نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا: ''یہ تو صاف انکار ہوا نا!''

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔'' افتخار واقعی الجھ گیا تھا۔

توصیف نے کہا ''سیدھی سی بات ہے' آپ کا وہ دوست کبھی بھی یہ نہیں کہے گا کہ میں کام سیکھ چکا ہوں یا یہ کہ یہ کام میرے لیے موزوں ہے۔ اس طرح ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔''

''مگر میرا وہ دوست ایسا کیوں کرے گا؟''

''آپ کی ہدایت جو ہوگی۔''

''میری ہدایت؟''

''جی ہاں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو توصیف۔'' افتخار کو اپنے بیٹے کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''میں اپنے دوست کو بھلا ایسی ہدایت کیوں دوں گا؟''

''اس لیے کہ آپ نہیں چاہتے' میں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولوں۔'' توصیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یہ کام پسند نہیں ہے اور جو کام آپ کو پسند ہے' وہ میں کرنا نہیں چاہتا۔''

''گویا تم مری نیت پر شک کر رہے ہو؟''

افتخار قریشی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ گئی ہو۔ توصیف آوارہ ہونے کے ساتھ گستاخ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ آج اس نے افتخار کو بہت بڑا صدمہ دیا تھا۔ اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ سختی سے پیش آتا' اس کے ذہن اور سوچ پر سزا کے کوڑے برساتا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو وہ فطری طور پر معاملہ فہم اور نرم خو تھا' پھر اولاد اور وہ بھی اکلوتی اولاد کے حوالے سے وہ بہت حساس اور جذباتی تھا۔ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی سختی روا نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں شمسہ سے مشورہ کیا۔ وہ ماں تھی' باپ سے بھی زیادہ جذباتی اور کمزور دل۔ توصیف اگر باپ کی آنکھ کا تارا تھا تو ماں کے دل کا سہارا تھا۔ وہ افتخار کی روح کا چین تھا تو شمسہ کیلئے نور العین تھا چنانچہ انہوں نے کوئی سخت اقدام کرنے کے بجائے بیٹے کے حق میں اس کی خواہش کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

''تم یہ مت سمجھنا کہ میں اپنے پیسے بچانے کیلئے یا کسی اور وجہ سے تمہاری مخالفت کر رہا تھا۔'' افتخار نے توصیف سے کہا۔ ''بہرحال...... تم ایک تجربہ کرنا چاہتے ہو' کر کے دیکھ لو مگر خدارا' ہماری نیتوں پر شک نہ کرو۔''

توصیف نے بات بنتے دیکھی تو فوراً پٹڑی پر آ گیا۔ ''آئی ایم رئیلی سوری ڈیڈی! اگر آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا ہو تو میں ایک مرتبہ پھر سوری کہتا ہوں۔''

توصیف کی یہ ہمیشہ سے عادت تھی کہ اپنی بات منوانے سے پہلے وہ اکڑفوں دکھاتا تھا اور جب اس کا کام نکل جاتا تھا تو فوراً خوش مزاج بن جاتا تھا اور ممکنہ حد تک معافی تلافی بھی کرتا تھا۔

افتخار کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

''آپ نے مجھے معاف کردیا ہے نا ڈیڈی!''

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔'' افتخار قریشی بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''پھر آپ مجھے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھلوا کر دے رہے ہیں نا؟''

''ظاہر ہے' یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا بھئی!''

''آپ کتنے اچھے ہیں ڈیڈی!''

''بس اب زیادہ مسکا نہیں لگاؤ اپنے ڈیڈی کو'' شمسہ نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔''مجھے امید ہے توصیف' تم ایجنسی کو کامیاب کر کے دکھادو گے۔''

وہ بولا''میں اپنی پوری کوشش کروں گا ممی!''

''شاباش میرے بیٹے!'' وہ خوشی سے نہال ہوگئی۔

چند روز بعد افتخار نے پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر ایک بھاری رقم لگا کر بیٹے کو شان دار ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھلوادی۔ افتخار کی خواہش پر ایجنسی کا نام''قریشی ایڈورٹائزنگ'' رکھا گیا تھا۔

دو تین ماہ تک ایجنسی پر خوب رونق رہی پھر اچانک پتا چلا' سب کچھ ڈوب گیا۔ کچھ عرصے بعد نہ صرف ایجنسی کا فرنیچر بھی بیچنا پڑا بلکہ بجلی اور ٹیلی فون کے بلوں کی مد میں افتخار قریشی کو ایک موٹی رقم بھی ادا کرنا پڑی۔

چند روز تک توصیف ٹھنڈا ٹھار بیٹھا رہا پھر دوبارہ اسے کاروبار کی سوجھی۔ اس مرتبہ اس نے اپنے ڈیڈی سے فرمائش کی کہ وہ اسے ٹریول ایجنسی کھلوادے۔

''تاکہ تم اس کا بھی وہی حشر کرو جو ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا ہوا؟'' افتخار قریشی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

توصیف نے اپنی ناکامیابی کی عجیب توجیہ پیش کی۔''ڈیڈی! ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے فلاپ ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس کی کوئی اور ہی وجہ تھی۔''

''اور وہ وجہ کیا تھی؟''

''دراصل نام کے بھی بہت اثرات ہوتے ہیں۔'' توصیف نے مبہم لہجے میں کہا۔

افتخار نے پوچھا''تم مجھے کیا باور کرانا چاہتے ہو توصیف؟''

توصیف نے کہا:''آپ نے ایجنسی کا نام خاصا دقیانوسی رکھ دیا تھا۔ شو بزنس کے کاروبار کیلئے کوئی پھڑکتا ہوا نام ہونا چاہیے تھا۔''

''شاید تم یہ بات بھول رہے ہو کہ اسی نام سے میں ایک کامیاب فیکٹری چلا رہا ہوں۔'' افتخار نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

توصیف بولا:''ہر نام ہر ایک کو راس نہیں آتا ڈیڈی!''

افتخار نے بیٹے سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا مگر توصیف نے صبح شام اپنی ضد جاری

رکھی۔ وہ اپنی ممی کو بھی اپنے حق میں ہم وار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ نتیجتاً ممی ڈیڈی نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔

توصیف نے''اسکائی برڈ'' کے نام سے ٹریول ایجنسی کھول کر کام کا آغاز کردیا مگر بنیادی طور پر چونکہ وہ خود ناتجربہ کار اور غیر سنجیدہ تھا اس لیے یہ ایجنسی بھی چلا کر نہیں دی۔

ایک تیسری کوشش کے طور پر اس نے''ڈریم لینڈ'' کے نام سے اسٹیٹ ایجنسی کھول لی۔

افتخار نے اسے ہر ممکن تعاون سے نوازا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا عملی میدان میں کچھ کر دکھائے مگر شاید بیٹے کی کامیابی دیکھنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ ڈریم لینڈ اسٹیٹ ایجنسی بھی چند ماہ کے بعد قریشی ایڈورٹائزنگ اور اسکائی برڈ ٹریول ایجنسی کے مانند''بیٹھ'' گئی۔ توصیف نے اپنی کاروباری صلاحیتوں کو مزید آزمانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک سال کی اس تگ و دو کے بعد وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا۔ نہ پڑھائی لکھائی اور نہ کام کاج بس اپنے ڈیڈی کی دولت اور اس کی تفریحات۔

افتخار قریشی ان حالات میں کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا' سو وہ یہی کرتا رہا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ایک کامیاب بزنس مین بنے لیکن اس کی یہ خواہش توصیف کے عمل سے مشروط تھی اور توصیف اس معاملے میں قابل بھروسہ ثابت نہیں ہوا تھا۔

یہ سب تو چل رہا تھا کہ ایک افسوسناک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ دو سال قبل افتخار قریشی کو دل کا معمولی سا اٹیک ہوا۔ حملہ اچانک اور نچلی سطح کا تھا اس لیے وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ مگر یہ ابتداء تھی' ایک وارننگ تھی۔ اب اسے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

انہی دنوں افتخار نے مستقبل کے حوالے سے ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ افتخار کے بعد اس کا سب کچھ شمسہ اور توصیف کا ہی تھا لیکن کسی ممکنہ بگاڑ سے بچاؤ کی خاطر اس نے اپنی دولت و جائیداد کی تقسیم کو ضروری سمجھا۔ وہ توصیف کے کچھنوں سے بہ خوبی آگاہ تھا اس لیے چاہتا تھا کہ ماں بیٹے کے درمیان کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

کافی سوچ بچار اور حساب کتاب کے بعد اس نے''قریشی انجینئرز'' کے علاوہ اپنا شان دار رہائشی بنگلا' اپنی چہیتی بیوی شمسہ کے نام کردیا۔ مذکورہ بنگلا' پی ای سی ایچ سوسائٹی کے سب سے پوش بلاک میں واقع تھا۔ شمسہ کے استعمال میں رہنے والی''سٹی'' گاڑی پہلے ہی اس کے نام تھی۔ شمسہ کا ایک ذاتی بینک اکاؤنٹ بھی تھا جس میں ہر وقت ایک معقول رقم موجود رہتی تھی۔

طارق روڈ اور کلفٹن کے علاقے میں افتخار قریشی کے دو لگژری فلیٹ بھی تھے جو کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ دونوں فلیٹ توصیف کے نام کردیئے۔ ازیں علاوہ اس کے نام سے ایک بھاری رقم بینک میں فکس کروادی جس کو استعمال میں لانے کیلئے شمسہ کی قانونی اجازت ضروری تھی۔ ایک شیرڈ گاڑی توصیف کے تصرف میں تھی البتہ اس کا بینک اکاؤنٹ عموماً خالی ہی رہتا تھا۔

افتخار نے اس تقسیم میں یہ خیال خاص طور پر رکھا تھا کہ شمسہ کا پلڑا بھاری رہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ شمسہ دولت کی قدر کرنا جانتی تھی۔ دوسری جانب وہ توصیف کو چاہے کتنا بھی نواز دیتا' اس نے سب

کچھ برابر کر دیا تھا پھر یہ بھی تھا کہ شمسہ کی پوزیشن اگر مضبوط اور مستحکم رہتی تو وہ توصیف کو ہر مشکل میں سنبھالا دے سکتی تھی۔

شمسہ سے افتخار کی محبت مسلم تھی۔ اس نے ہمیشہ شمسہ کا خیال رکھا تھا۔ جواباً شمسہ نے بھی اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس ازدواجی زندگی کی کامیابی میں دونوں کا برابر کا حصہ تھا۔ وہ ایک دوسرے سے پرخلوص تھے اور بے لوث محبت کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی محرومی نہیں تھی۔ خدا نے انہیں عزت، دولت، شہرت اور اولاد ایسی نعمتوں سے سرفراز کر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ توصیف کی جانب سے ہمیشہ تشویش میں مبتلا رہتے تھے تاہم وہ اس کے ساتھ زیادہ سختی سے بھی پیش نہیں آ سکتے تھے۔ اولاد جب جوان ہو جائے تو پھر سختی کام نہیں آتی۔ انہیں کسی حکمت عملی سے قابو کرنا پڑتا ہے ورنہ وہ بغاوت اور سرکشی پر اتر آتے ہیں۔

توصیف پر اگر کسی شخص کی بات کا تھوڑا بہت اثر ہوتا تھا تو وہ شخص ''قریشی انجینئرز'' کا جنرل منیجر اجمل شاہ تھا۔ توصیف اجمل شاہ کو انکل کہتا تھا اور اس کی بات کو توجہ سے سننے کی کوشش کرتا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں افتخار قریشی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک اسے شمسہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اب وہ تھانے کی حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ''تفتیشی مراحل۔'' سے گزر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وقت بڑی ظالم چیز ہے۔ شاید یہ جملہ ایسے ہی مواقع کیلئے وجود پایا ہے۔

اس کے علاوہ بھی اجمل شاہ کی زبانی مجھے چند باتوں کا علم ہوا مگر سردست ان کا تذکرہ میں ضروری نہیں سمجھتا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر میں وہ نکات آپ کے سامنے لاؤں گا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

پہلی پیشی پر جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔

ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

میں اپنے وکالت نامہ مع درخواست ضمانت عدالت میں دائر کر چکا تھا۔ اس موقع پر میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیئے مگر مجھے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہ خلاف توقع نہیں تھا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہی ہوتی ہے پھر پولیس نے جو چالان عدالت میں پیش کیا تھا اس کی روشنی میں تو یہ اور بھی دشوار کام تھا چنانچہ ملزم افتخار قریشی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی ہو گئی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو اجمل شاہ خاصا اداس تھا۔ میں نے اس کی اداسی کا سبب جاننا چاہا تو وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! ہمیں تو پہلے ہی مرحلے پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ قطعاً غلط سوچ رہے ہیں۔''

''تو جو کچھ بھی ہوا، اچھا ہی ہوا؟'' اس نے سوال کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ یہ اچھا ہوا اگر میرے موکل کی ضمانت نہیں ہو سکی مگر میں اس کی توقع کر رہا تھا اور شاید میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ قتل کے ملزم کی ضمانت بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔''

''ہاں، آپ نے بتایا تو تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بس تو پھر آپ اتنے اداس نہ ہوں۔'' میں نے کہا ''انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو کیس عدالت میں لگا ہے۔ آگے آگے دیکھئے، ہوتا ہے کیا۔''

''گویا آپ کو کامیابی کی پوری امید ہے؟''

''بالکل پوری امید ہے بھئی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''میں تو افتخار صاحب کے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔ ان کی جانب سے سرگرمی دکھانے کے لیے اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ بیوی چل بسی، وہ خود جیل چلے گئے اور ان کا بیٹا خیر، توصیف کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ وہ بڑا نالائق لڑکا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ باپ کا سہارا بنتا مگر وہ اب تک تو باپ کے سہارے ہی چل رہا تھا۔ آئندہ اللہ کو جو منظور۔''

اپنی بات ختم کر کے اجمل شاہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا ''آپ اپنے ذہن کو فکر مندی کے خیالات سے خالی کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ قدرے مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے اچھے خاصے گواہ پیش کیے گئے لیکن میں یہاں صرف اہم گواہوں کا تذکرہ ہی کروں گا۔ سب سے پہلے میڈیکولیگل افسر گواہی کیلئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

اس رپورٹ کے مطابق شمسہ کنول کی موت پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب، گیارہ اور ایک بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب ایک سریع الاثر زہر تھا جس نے شمسہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ گواہ نے اپنی رپورٹ میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ مقتول کو مذکورہ زہر دودھ میں ملا کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد کیمیکل ایگزامنر کی باری آئی۔

کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق شمسہ کی ہلاکت کا سبب بننے والا زہر بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آسانی سے اور کسی قسم کا شک کیے بغیر دودھ پی گئی۔ وہ اپنی بے خبری میں ایک خطرناک چیز کو اپنے معدے میں اتار چکی تھی لہٰذا اس کی موت واقع ہو جانا یقینی

بات تھی ۔ مذکورہ زہر چٹکی بجاتے میں کام کرتا تھا۔

لیبارٹری ٹیسٹ میں اس جھوٹے گلاس کا معائنہ بھی کیا گیا تھا جس میں شمسہ نے وہ زہریلا دودھ پیا تھا۔ پولیس نے موقع واردات سے وہ گلاس حاصل کرلیا تھا۔ ازاں بعد ملزم کے دفتر کی تلاشی کے دوران میں انہیں ملزم کی ایک دراز سے وہ چھوٹی سی شیشی بھی مل گئی تھی جس میں مذکورہ زہر کی اچھی خاصی مقدار بھی موجود تھی ۔ وہ بے رنگ' بے بو اور بے ذائقہ زہر سفوف کی صورت تھا اور انتہائی سریع الاثر واقع ہونے کی وجہ سے اس کی قلیل مقدار کسی کو بھی موت کی نیند سلانے کیلئے کافی تھی۔ لیبارٹری ٹیسٹ نے یہ بات بھی ثابت کر دی تھی کہ مذکورہ شیشی میں پایا جانے والا سفوف وہی زہر تھا جس کے سبب شمسہ کی موت واقع ہوئی تھی۔

پولیس نے اپنی تفتیشی رپورٹ یعنی چالان میں وجہ قتل انتقام کو بتایا تھا۔ پولیس کا موقف تھا کہ ملزم اپنی بے وفا بیوی کو عبرت ناک سزا دینا چاہتا تھا لہٰذا اس نے شمسہ کو ایک خطرناک زہر دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس کے مطابق ملزم کو ایک طویل عرصے سے یہ شک تھا کہ اس کی بیوی شمسہ کنول اس سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی ۔ اس نے شمسہ سے باز پرس کی تو وہ اپنے طرز عمل سے صاف مکر گئی چنانچہ ملزم نے انتقاماً اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ ازاں بعد خود فون کر کے پولیس کو اطلاع دے دی کہ اس کی بیوی نے خودکشی کر لی ہے۔

پولیس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ملزم اپنی دولت و جائیداد کو واپس اپنے قبضے میں لانا چاہتا تھا۔ وہ جذبات میں آ کر فیکٹری اور بنگلا وغیرہ شمسہ کے نام لگا چکا تھا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ جس کی محبت میں اتنی قربانیاں دے رہا ہے وہ ایک بے وفا بیوی ثابت ہو رہی ہے تو ملزم نے اس سے جان چھڑانے کا ایک منصوبہ بنا لیا۔ اس نے کہیں سے ایک نہایت موثر اور خطرناک زہر حاصل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ سونے سے پہلے شمسہ ایک گلاس دودھ پینے کی عادی تھی ۔ اس نے شمسہ کے دودھ میں زہر ملا دیا پھر اگلی صبح جب اسے یقین ہو گیا کہ شمسہ زندگی کی قید سے رہائی حاصل کر چکی ہے تو اس نے فون کر کے پولیس کو اپنے گھر بلا لیا۔ اس نے ایک قتل کو خودکشی کا رنگ دینے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر پولیس کے مطابق وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے تھے اور انہوں نے ملزم کے دفتر کی تلاشی لے کر قاتل زہر کی شیشی برآمد کر لی تھی۔

پولیس نے اپنے تئیں میرے موکل کو پھانسی لٹکانے کا پورا پورا بندوبست کر ڈالا تھا مگر میں مطمئن تھا۔ مجھے ملزم کی بے گناہی کا یقین تھا۔ ایک وکیل کو جب تک اپنے موکل کی بے گناہی کا یقین نہ ہو اس وقت تک وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے ایک تجربہ کار اور سمجھ دار قانون پسند وکیل کی بات کی ہے ورنہ ہمارے یہاں ہر قسم کے وکیل پائے جاتے ہیں ۔ چند حضرات تو ایسے ہیں جو آخری وقت تک اپنے موکل کو خوش امیدی کے جال میں پھانسے رکھتے ہیں ۔ انہیں ملزم کی بریت کا ایک فیصد بھی یقین نہیں ہوتا مگر اس کے لواحقین سے وہ بڑی بڑی رقمیں اس بنا پر وصول کرتے رہتے ہیں کہ وہ جج کو ملزم کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرے موکل افتخار قریشی کے بنگلے پر کل چار افراد ملازم تھے۔ بنگلے کا گارڈ نما چوکیدار گلاب خان' گھریلو ملازمہ وحیدہ' خانساماں انور علی اور ڈرائیور محمد حسین۔ یہ ڈرائیور عموماً شمسہ کی گاڑی چلاتا تھا۔ افتخار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا تھا۔

خانساماں انور علی کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے کا ملازم تھا اور بنگلے کے عقبی حصے میں بنے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ اوپر کے کام کاج کیلئے وحیدہ موجود تھی ۔ وہ روزانہ صبح نو بجے آتی تھی اور شام کو پانچ بجے چلی جاتی تھی ۔ اس کی رہائش منظور کالونی میں تھی ۔ چوکیدار گلاب خان گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اپنے ''ملک'' یعنی مانسرہ چھٹی پر جاتا تھا۔ ڈرائیور محمد حسین خداداد کالونی میں رہتا تھا اور اس کی ڈیوٹی صبح نو بجے سے شام سات بجے تک ہوتی تھی۔

استغاثہ کے گواہوں میں یہ چاروں افراد شامل تھے۔ ان میں سے پہلے وحیدہ گواہی کیلئے پیش ہوئی۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان ریکارڈ کوایا پھر وکیل استغاثہ جرح کیلئے اس کے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

اس نے ایک طائرانہ نگاہ حاضرین عدالت پر ڈالی پھر وحیدہ سے پوچھا۔

''وحیدہ بی بی آپ ملزم کو کب سے جانتی ہیں؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ ''لگ بھگ پانچ سال سے۔''

''اس کا مطلب ہے' یہاں آنے سے پہلے آپ ملزم سے واقف نہیں تھیں۔''

''جی بالکل۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اس کا یہی مطلب ہے۔''

''اور بیگم صاحبہ شمسہ کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی؟۔''

''آپ شمسہ کو کب سے جانتی تھیں؟۔''

وحیدہ نے جواب دیا ''جناب میں بیگم صاحبہ اور صاحب جی کو پانچ سال ہی سے جانتی ہوں۔ اس سے پہلے میں ان دونوں میں سے کسی سے واقف نہیں تھی۔''

''آپ تقریباً پورا دن ملزم کے گھر میں کام کرتی ہو۔'' وکیل استغاثہ نے دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ ''ان پانچ سالوں میں آپ اس گھر اور گھر میں رہنے والے افراد کے مزاج اور معاملات سے تو اچھی طرح آگاہ ہو چکی ہوں گی؟''

وحیدہ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا ''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ پچھلے کچھ عرصے سے دونوں میاں بیوی میں خاصی کشیدگی چل رہی تھی؟''

''جی ہاں' میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی۔'' وحیدہ نے تائید کی۔

''کیا کبھی آپ نے اس کشیدگی کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا؟''

"جی ہاں' ایک دو مرتبہ ایسا اتفاق ہوا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

میرے خیال میں یہ ایک رسمی سی جرح تھی۔ اس سے وکیل استغاثہ محض یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا تھا کہ ملزم اور اس کی بیوی کے درمیان ان بن پائی جاتی تھی۔ استغاثہ کے موقف کو مضبوط بنانے کیلئے اس قسم ہی کی شہادتوں کی ضرورت تھی کیونکہ وہاں پر وجہ قتل شمسہ کی بے وفائی کو ظاہر کیا گیا تھا جس کیلئے میاں بیوی میں کشیدگی کا ہونا ضروری تھا' میں اپنی باری میں جرح کیلئے استغاثہ کی گواہ وحیدہ بی بی کے پاس چلا آیا۔

میں نے پہلا سوال کیا "وحیدہ بی بی! کیا واقعی تم عرصہ پانچ سال سے میرے موکل کے بنگلے پر کام کر رہی ہو؟"

"اس میں کیا شک ہے جی!" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "آپ تصدیق کرنا چاہیں تو صاحب جی سے پوچھ لیں۔"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا: "اگر ضرورت پڑی تو تمہارے صاحب جی سے بھی پوچھا جائے گا۔ فی الحال تم میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"میں نے تو پہلے بھی ٹھیک جواب ہی دیا ہے جی!" وہ ایک ادا سے بولی۔

وحیدہ کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہوگی مگر وہ اپنی عمر سے کافی کم دکھائی دیتی تھی پھر اس کی حرکات و سکنات میں ایک بانکا پن بھی پایا جاتا تھا۔ خاص طور پر اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی ورائٹی تھی۔ وہ بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں آنکھیں گھمانے کا فن بھی جانتی تھی۔ جنس مخالف کیلئے اس میں بڑی کشش تھی۔ ایسی عورتیں اگر چاہیں تو پلک جھپکتے میں مرد کو زیر دام لا سکتی ہیں۔

میں نے وحیدہ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا: "وحیدہ بی بی! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ پانچ سال کے عرصے کے دوران میں تم اس گھر اور گھر میں بسنے والے افراد کے مزاج سے بہ خوبی آگاہ ہو چکی ہو۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں' میں نے وکیل استغاثہ کو یہی جواب دیا تھا۔"

میں نے کہا "اور تم نے یہ بھی بتایا ہے کہ میرے موکل اور اس کی بیوی میں اچھی خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی؟"

وحیدہ نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "اس کشیدگی کی نوعیت کیا تھی؟"

وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں مٹکاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی "وکیل صاحب میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھی؟"

میں نے کہا: "میں نے ایسی کوئی مشکل بات تو نہیں پوچھ لی۔"

"تھوڑی وضاحت کر دیں تو مہربانی ہوگی۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "وحیدہ بی بی! میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میرے موکل اور اس کی بیوی کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کا سبب کیا تھا؟"

وہ گھٹ سے بولی "صاحب جی کو بیگم صاحبہ پر شک ہو گیا تھا۔"

"کس قسم کا شک؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

"وہ جی...... وہ جی......" وہ رک رک کر بولی۔ "صاحب جی کو شک تھا کہ بیگم صاحبہ ان سے بے وفائی کر رہی ہیں۔"

"یہ شک تمہارے خاوند جی کو تم پر کیوں نہیں ہوا تھا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھ پر کیوں جی؟" وہ گڑبڑا گئی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔ "وحیدہ بی بی! تم منظور کالونی میں رہتی ہو نا؟"

"جی ہاں' میں منظور کالونی میں رہتی ہوں۔"

"تم شادی شدہ بھی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہارے چار بچے بھی ہیں؟"

"جی ہاں' بالکل ہیں۔"

"اس کے باوجود بھی" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور چبھتے ہوئے انداز میں کہا "تم اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی رہتی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آب جیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا "وکیل صفائی معزز گواہ کی کردار کشی کر رہے ہیں۔ میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ فاضل وکیل کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا جائے۔"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ مسماۃ وحیدہ بی بی سے اس قسم کا سوال پوچھ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے مودبانہ انداز میں کہا "جناب عالی! میں صرف حقائق کو سامنے لا رہا ہوں' معزز عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ استغاثہ کا گواہ' شہادت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

وکیل استغاثہ نے جوشیلے لہجے میں مجھ سے دریافت کیا "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ استغاثہ کی گواہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی رہتی ہے۔"

وکیل مخالف کے جوش کو سوا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دراصل جوش کسی آتش گیر مادے کے مانند ہوتا ہے جو ذرا سی تحریک پر بھڑک اٹھتا ہے۔ اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جوش میں انسان

اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ میں نے وکیل استغاثہ کے جوش کو دیا سلائی دکھانے کی خاطر، اپنے موکل سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کہا۔

''میرے فاضل دوست! آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے اس لیے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کی سچائی کیلئے میرے پاس ٹھوس ثبوت بھی ہیں۔''

''میں وہی تو جاننا چاہتا ہوں!'' وکیل استغاثہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے روئے سخن کٹہرے میں کھڑی استغاثہ کی گواہ وحیدہ بی بی کی جانب موڑتے ہوئے کہا ''وحیدہ بی بی! کیا یہ غلط ہے کہ کچھ عرصہ قبل میرے موکل نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ تم سامنے والے بنگلے کے چوکیدار سے ''رسم وراہ'' بنانے میں مصروف تھیں؟''

میرے اس انکشاف پر وحیدہ کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی۔ میں نے دوسرا حملہ کیا۔ ''کیا یہ بات بھی غلط ہے کہ ایک موقع پر تم نے اپنے چھوٹے صاحب کو بھی رجھانے اور سلجھانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ تو شمسہ نے تمہاری چوری پکڑ لی ورنہ توصیف تو خود بھی اسی میدان کا کھلاڑی ہے۔''

وہ منمنائی ''وہ جی دراصل بیگم صاحبہ کو غلط فہمی ہوگئی تھی ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہنسی مذاق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔''

''ہر چیز جب حد سے تجاوز کر جائے تو وہ جرم کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا ''تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ کمزور سی آواز میں اپنا دفاع کرتے ہوئے بولی ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا جی، بیگم صاحبہ اور صاحب جی کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔''

''تم بڑی خوش فہم ہو وحیدہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''جو یہ سمجھ رہی ہو کہ دوسروں کو تمہارے بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی۔''

وہ مدد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو تکنے لگی۔ وکیل استغاثہ نے اس کی دستگیری کرتے ہوئے کہا ''جناب عالی! وکیل صفائی غیر ضروری باتوں میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس پوچھنے کیلئے کوئی سوال نہیں بچا تو میں استغاثہ کا دوسرا گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے جواباً کٹہرے میں کھڑی وحیدہ سے پوچھا ''وحیدہ بی بی! تم روزانہ کتنے بجے ڈیوٹی پر آتی ہو؟''

اس نے جواب دیا ''صبح نو بجے تک میں بنگلے پر پہنچ جاتی ہوں۔''

''اور چھٹی کتنے بجے کرتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''شام پانچ بجے۔''

''کیا تم کوئی ہفتہ وار یا ماہ وار چھٹی بھی کرتی ہو؟''

''جی ہاں، میں نے ہفتے میں ایک چھٹی کرتی ہوں۔''

''کون سے دن تمہاری چھٹی ہوتی ہے؟''

''جس دن صاحب جی گھر پر ہوتے ہیں'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا ''تمہارا مطلب ہے ہفتہ وار عام تعطیل کے روز؟''

''جی ہاں، میں اسی دن چھٹی کرتی ہوں جب سبھی لوگ چھٹی کرتے ہیں۔''

میں اصل موضوع کی طرف آ گیا اور پوچھا ''وحیدہ بی بی! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک وال کے جواب میں بتایا ہے کہ تم نے اپنے صاحب جی اور بیگم صاحبہ کے درمیان مبینہ کشیدگی کا عملی ظاہرہ بھی کئی بار دیکھا ہے؟''

''کئی مرتبہ نہیں'' وکیل استغاثہ فوراً بیچ میں کود پڑا۔ ''معزز گواہ نے بتایا تھا کہ اس نے ک دو مرتبہ اس کشیدگی کا عملی مظاہرہ دیکھا تھا۔''

''اس یاددہانی کا شکریہ میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

جج نے مجھے تاکید کی ''بیگ صاحب! آپ اپنے سوالیہ جملے میں سے ''کئی مرتبہ'' کے فاظ کو ''ایک یا دو مرتبہ'' سے بدل کر جرح جاری رکھیں۔''

میں نے جج کی ہدایت کے مطابق وحیدہ سے سوال کیا پھر پوچھا ''کیا تم کشیدگی کے عملی ظاہرے کی وضاحت کرو گی؟''

''وضاحت کیا کروں جناب!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''بس دونوں آپس میں ایک سرے کو کھری کھری سناتے تھے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے تبصرہ کرنے والے انداز میں ہا ''بس جی، جب میاں بیوی کے درمیان سے اعتبار اٹھ جائے تو پھر صبح شام اسی قسم کے واقعات ش آتے ہیں۔''

میں نے اس کے ''نادر و نایاب'' تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا ''وحیدہ بی بی! میری علومات کے مطابق افتخار قریشی اور شمسہ عموماً ایک ساتھ ہی گھر سے نکلتے تھے اور وہ تقریباً گیارہ بجے کٹری کیلئے گھر سے روانہ ہوتے تھے'' چند لمحات کا وقفہ دے کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات جائزہ لیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''شمسہ روزانہ پانچ بجے فیکٹری سے واپس آتی تھی بکہ افتخار قریشی رات آٹھ بجے تک لوٹتا تھا۔ پھر تم نے انہیں کس وقت آپس میں کشیدگی کا عملی مظاہرہ رتے ہوئے دیکھ لیا؟ تم تو صبح نو بجے سے پانچ بجے تک بنگلے پر رہتی ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ان کے ساتھ ہی تم بھی فیکٹری جاتی تھیں اور یہ کہ تم نے ان پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔''

''واہ جی، میں نے انہیں چھٹی کے روز لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا'' وہ بے ساختہ بولی۔

''بہت خوب!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کاٹ دار نظر سے وکیل استغاثہ کی جا

دیکھا۔

اس دوران میں وحیدہ نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کوئی غلط بات منہ سے نکال چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی یا کوئی نیا جھوٹ تراشتی' میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''تم کون سی چھٹی کا ذکر کر رہی ہو وحیدہ بی بی!''

''وہ جی...... جی......'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔

میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سخت لہجے میں کہا ''وحیدہ بی بی! تھوڑی دیر پہلے تم معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکی ہو کہ عام تعطیل کے دن تم ڈیوٹی پر نہیں آتی تھیں اور اب کہہ رہی ہو کہ تم نے چھٹی کے دن اپنے صاحب جی اور بیگم صاحبہ کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ تمہارے کون سے بیان کو سچ سمجھا جائے؟''

''دونوں کو......'' وہ شدید الجھن کا شکار نظر آتی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

جج نے اسے سرزنش کی ''بی بی! یہ عدالت کا کمرہ ہے جو بھی کہنا ہے' سوچ سمجھ کر کہو تمہارا بیان تمہیں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار کرا دے گا۔ وکیل صاحب کے سوال کا واضح جواب دو''

وحیدہ نے جواب دیا ''میں کبھی کبھی چھٹی کے روز بھی بنگلے پر کام کرنے آ جاتی تھی۔''

''اور اسی اسی روز یہ میاں بیوی آپس میں جھگڑا کرتے تھے؟'' میرے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی ''ہے نا یہی بات؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں جی!''

''کہنا تو تمہیں ہی ہے۔''

''بس تو پھر اس کو ایک اتفاق ہی سمجھ لیں' وہ بے بسی سے بولی۔

''ہم اسے تمہارا کھلا جھوٹ کیوں نہ سمجھ لیں وحیدہ بی بی!''

وہ جواب دینے کے بجائے نظر چرا کر وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اس روز اجمل شاہ کے چہرے پر قدرے اطمینان پایا جاتا تھا۔ توصیف بھی اس دن اس کے ساتھ عدالت آیا تھا مگر باقاعدہ جرح شروع ہونے سے پہلے اسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا اور چپکے سے وہ عدالت کے کمرے سے کھسک گیا تھا۔ عدالت کے برآمدے میں میرے ساتھ ہوئے اجمل شاہ نے کہا۔

''بیگ صاحب! آج تو آپ نے بڑی زبردست جرح کی ہے۔''

''اس میں زبردست والی کون سی بات تھی؟'' میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

وہ جوشیلے لہجے میں بولا ''جناب! آپ نے تو وحیدہ کی بولتی بند کر دی تھی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے'' میں نے بدستور سرسری انداز میں کہا۔

''کیا وحیدہ کے آنکھ مٹکے والی بات آپ کو افتخار صاحب نے بتائی تھی؟''

''ظاہر ہے اور کون بتا سکتا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے' انہوں نے آپ کو اور بھی بہت سی مفید باتیں بتائی ہوں گی؟'' وہ کریدنے والے انداز میں بولا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ افتخار قریشی سے گاہے بگاہے مختصر یا طویل ملاقات کے دوران بہت سی اہم باتیں سامنے آئی تھیں جو اس کیس میں مفید اور معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اجمل شاہ' افتخار قریشی کی خیر خواہی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اگر میں اسے سب کچھ بتا دیتا تو اس میں نقصان والی کوئی بات نہیں تھی مگر میں اپنے مؤکل کے رازوں کا امین رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہر حال احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے اور ہمیشہ فائدہ مند ہی ثابت ہوتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

میں نے اجمل شاہ کو ٹالنے کی خاطر کہا ''شاہ جی! آپ سے کیا پردہ ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے کہ میں جو کچھ جانتا ہوں یا افتخار قریشی نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ کم و بیش آپ کو بھی معلوم ہی ہے۔''

اس نے اس سلسلے میں زیادہ اصرار نہیں کیا اور مطمئن لہجے میں بولا ''اچھا ہوا کہ توصیف اس وقت عدالت سے جا چکا تھا جب آپ نے وحیدہ پر جرح کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کیا تھا۔''

''اگر وہ موجود ہوتا تو پھر کیا ہو جاتا؟''

''ہونا کیا تھا جناب!'' وہ سرسری لہجے میں بولا ''خواہ مخواہ بے چارے کو بھری عدالت کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔''

میں نے کہا ''اس قماش کے لوگ کبھی شرمندہ نہیں ہوتے شاہ جی!''

''یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں'' اس نے تائید کی۔

''مجھے جہاں تک توصیف کی سرگرمیوں کا علم ہوا ہے'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک بدقسمت شخص ہے۔ ہر قسم کی سہولت اور آسائش مہیا ہونے کے باوجود بھی انسان اگر اپنا مستقبل نہ بنا سکے یعنی معاشرے میں اپنا نام اور مقام پیدا نہ کر سکے تو اسے بدقسمت ہی کہا جا سکتا ہے۔''

اجمل شاہ نے کہا ''میری نظر میں تو وہ بدقسمت ہونے کے ساتھ ساتھ ہڈحرام درجہ اول کا ہے۔ وہ اب تک افتخار صاحب کے بل بوتے پر عیش کرتا آیا ہے مگر یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے۔ آخر ایک دن اسے سنجیدہ ہونا ہی پڑے گا۔''

''ایسے لوگ کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے شاہ جی!''

''تو پھر ایک دن اسے فٹ پاتھ پر آنا ہوگا'' اجمل شاہ نے کہا ''کسی کی نصیحتیں کہاں تک کام آ سکتی تھیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے۔''

میں نے کہا ''اس قسم کے افراد نصیحت کرنے والوں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔''
''اس بات کا مجھے ذاتی تجربہ ہے بیگ صاحب!'' اجمل شاہ نے سینے پر ہاتھ مار
ہوئے کہا ''سب سے زیادہ اسے میں ہی سمجھاتا ہوں۔ وہ مجھے انکل کہتا ہے اور بلاشبہ اگر وہ کسی
بات پر دھیان دیتا ہے تو وہ ''کسی'' میں ہی ہوں۔ میری تو پوری کوشش تھی اور اب بھی ہے کہ وہ افتخ
صاحب کے کاروبار کو سنبھال لے۔ چلتا ہوا بزنس ہے' اسے زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑے گی۔''
''مگر اس طرف اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی'' میں نے کہا۔
''ہاں' حقیقت تو یہی ہے۔ خیر......''
اجمل شاہ نے ذومعنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس سے مصافحہ کر کے پارکن
لاٹ کی جانب بڑھ گیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

گواہوں والے کٹہرے میں انور علی کھڑا تھا۔
انور کو میرے مؤکل کے پاس کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہوا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا شخ
تھا۔ اس کی عمر پچپن کے اریب قریب تھی۔ اس حوالے سے وہ افتخار قریشی کا ہم عمر ہی تھا۔ وہ دنیا
بالکل تنہا تھا اس لئے مستقل طور پر وہ بنگلے ہی میں رہتا تھا۔ اسے مقامی کھانوں کے علاوہ کئی غی
ڈشیں تیار کرنا بھی آتی تھیں۔ اس وقت وہ ہلکے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔
وکیل استغاثہ نے انور علی کا بیان ریکارڈ ہونے کے بعد اپنی جرح کا آغاز کیا۔ اس
سوالوں میں جان نہیں تھی۔ اسے صرف اس لئے استغاثہ کے گواہوں میں شامل کیا گیا تھا کہ جا
وقوعہ پر پولیس والوں نے اس سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی اور جب تک انہیں افتخار قریشی کے دفتر کی در
سے زہر والی شیشی نہیں ملی تھی' وہ انور علی ہی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے تھے کیونکہ رات کو دو
گرم کر کے وہی شمسہ کو دیتا تھا۔ یہ برسوں سے اس کا معمول تھا کیونکہ شمسہ روزانہ رات کو سونے
پہلے ایک گلاس نیم گرم دودھ ضرور پیتی تھی۔
اپنی باری پر میں اٹھ کر گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا اور انور علی کو مخاط
کرتے ہوئے کہا ''انور علی! کیا اس سے پہلے بھی کبھی تم نے کسی عدالت میں گواہی دی ہے؟''
''نہیں جناب!'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''یہ میرا پہلا موقع ہے۔''
''تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے حلف اٹھایا ہے'' میں نے اس
چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا ''حلف اٹھانے کے بعد صرف اور صرف سچ ہی بولا جاتا ہے' اتنا تو
جانتے ہی ہو گے؟''
''جانتا ہوں جی!'' اس نے کہا ''اور میں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔''
میں نے پوچھا ''تمہیں ملزم کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''
''دس سال پورے ہو گئے' گیارہواں چل رہا ہے۔''

''اس دوران میں تم نے اپنے مالک یعنی افتخار قریشی کو کیسا پایا ہے؟''
''وہ طبیعت کے بہت اچھے انسان ہیں۔''
''اور شمسہ؟''
''وہ بھی انتہائی مہربان خاتون تھیں' '' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
دیرینہ ملازمین اپنے خلیق' شفیق اور خیال رکھنے والے مالکان کی جدائی پر جذباتی ہو ہی
جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا' انور علی بھی آبدیدہ ہو گیا تھا۔
میں نے پوچھا ''استغاثہ کی ایک گواہ نے دعویٰ کیا ہے کہ دونوں میاں بیوی یعنی افتخار
قریشی اور شمسہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔''
''میرا خیال ہے' گواہ کا دعویٰ جھوٹا ہے۔''
''یعنی تم نے انہیں کبھی لڑتے جھگڑتے ہوئے نہیں دیکھا؟''
''وہ تو بڑے پیار و محبت اور اتفاق سے رہتے تھے جناب!'' وہ سادگی سے بولا۔
میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا' وہ غصیلی نگاہ سے گواہ انور علی کو تک رہا تھا۔
میں دوبارہ انور علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''انور علی! تمہیں معلوم ہے کہ تم یہاں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے آئے ہو؟''
''جی ہاں' مجھے معلوم ہے'' اس کے چہرے پر سادگی ہی سادگی تھی۔
میں نے کہا ''اور کیا تمہیں پتا ہے کہ استغاثہ کے گواہ کو یہاں کٹہرے میں کھڑے ہو کر کیا
کرنا ہوتا ہے؟''
''مجھے بتایا گیا تھا کہ مجھ سے بہت آسان سوال پوچھے جائیں گے۔''
میں نے کہا ''انور علی! یا تو تم انتہائی سادہ لوح ہو یا پھر بےوقوف ہو۔''
''میں نے بےوقوفی والی کون سی بات کی ہے جناب!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے
دیکھنے لگا۔
''انور علی! میری بات دھیان سے سنو'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تم یہاں
استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے لائے گئے ہو اور استغاثہ افتخار قریشی کو شمسہ کا قاتل سمجھتا ہے۔ تمہیں
اس سلسلے میں گواہی دینا ہے۔''
''جناب' یہ کیا چکر ہے؟'' وہ پریشان ہو گیا۔
میں نے پوچھا ''کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو کہ تمہارے مالک افتخار قریشی نے دودھ میں
زہر ملا کر اپنی بیوی شمسہ کو ہلاک کیا ہے؟''
''مم...... میں...... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا جناب!''
''کیسا نہیں سوچ سکتے انور علی؟''
''کک...... کہ......'' وہ اٹکتے ہو بولا ''افتخار صاحب...... اپنی بیوی کی جان بھی لے سکتے

ہیں۔''

''استغاثہ کا تو یہی مؤقف ہے میرے بھائی!'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں پولیس کے ڈر سے گواہی دینے آ گیا ہوں۔''

''پولیس کے ڈر سے کیوں؟'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

انور علی نے بتایا ''جناب' وہ تو مجھے ہی گرفتار کرنے کے چکر میں تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں نے ہی دودھ میں زہر ملا کر بیگم صاحبہ کو ہلاک کیا ہے' پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ مجھ پر مہربان ہو گئے۔ انہوں نے اس شرط پر میری جان بخشی کر دی کہ مجھے استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے بیان دینا ہو گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ عدالت کے کمرے میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کیس کے تفتیشی افسر کی جانب دیکھا۔ انور علی کا بیان استغاثہ کے خلاف جاتا تھا۔ میں انور علی کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ پولیس نے اچانک اس کی جان چھوڑ کر افتخار قریشی کو کیوں گرفتار کر لیا تھا۔ زہر والی شیشی کی بازیابی کا قصہ اس کے پلے نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں اب تک کی گفتگو سے بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ انور انتہائی سیدھا سادہ انسان تھا۔ استغاثہ نے اسے گواہوں کی فہرست میں شامل کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔

میں نے انکوائری افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آئی او صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟''

''کس مسئلے کے بیچ؟'' وہ بے اختیار بول اٹھا۔

میں نے مسئلے کی نشاندہی کی پھر کہا ''استغاثہ کا گواہ معزز عدالت کے سامنے انکشاف کر رہا ہے اسے زبردستی گواہوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ابھی آپ نے بھی اس کی زبانی سنا ہو گا کہ اسے استغاثہ کے مؤقف کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ اگر اسے اس کیس میں ملوث کرنے کے حوالے سے ڈرایا دھمکایا نہ جاتا تو وہ گواہی دینے عدالت میں نہ آتا۔''

''جناب! ہمارے ملک میں یہ بہت بڑی خرابی ہے۔''

تفتیشی افسر نے خجالت آمیز نظر سے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عین وقت پر گواہ منحرف ہو جاتا ہے اور استغاثہ دیکھتا کا دیکھتا...... رہ جاتا ہے۔ حالانکہ ہم نے انور علی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی مگر آپ دیکھ لیں' وہ کس خوبصورتی سے اپنی لاعلمی اور ہماری زیادتی کی اداکاری کر رہا ہے۔''

میں چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''آئی او صاحب! استغاثہ کا گواہ اگر استغاثہ کے خلاف بول رہا ہے تو اس سے استغاثہ کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہمارے ملک کو الزام نہ دیں۔ یہ ملک ہم سے نہیں بلکہ ہم سب اس ملک سے ہیں۔ آپ کے پاس جو عزت' دولت اور شہرت نظر آ رہی ہے۔ وہ اسی ملک نے آپ کو دی ہے۔ آج آپ کے جسم پر قانون کی وردی سجی ہوئی ہے تو اس میں

آپ کا...... صرف اور صرف آپ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ سب کچھ اسی ملک کی وجہ سے ہے جسے آپ خراب ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں۔ یہ ملک نہیں ہوتا تو جانے آپ کہاں اور کس حال میں ہوتے۔ اپنے ملک کو برا کہنا فیشن میں شامل ہو گیا ہے جیسے کبھی خدا کے وجود سے انکار کرنے کا فیشن چلا تھا۔ لوگ خود کو عظیم فلسفی اور انٹیلیکچوئل ثابت کرنے کیلئے ترقی پسندی کی راہ پر چل نکلے تھے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ''سیدھی اور آسان سی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس ملک کو برا کہتے ہیں' انہیں اس ملک کی سرزمین پر سانس لینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ وہ زندگی گزارنے کیلئے اپنی من پسند دھرتی ڈھونڈ لیں مگر...... یہ ہو نہیں سکتا۔ پاکستان کو برا کہنے والے پاکستانی نہیں بلکہ منافق ہیں اور منافق اندر سے انتہائی بزدل ہوتا ہے۔ اس سے کمٹ منٹ کی توقع رکھنا عبث ہے۔''

میری تقریر دل پذیر نے حاضرین عدالت کو خاصا متاثر کیا تھا۔ استغاثہ کے گواہ انور علی نے اپنی سادگی اور معصومیت سے استغاثہ کے بحری بیڑے کے پیندے میں عظیم شگاف ڈال دیا تھا جس سے بیڑے کے اندر ''پانی'' بھرنا یقینی بات تھی۔

استغاثہ کی جانب سے اگلا گواہ افتخار قریشی کا چوکیدار گلاب خان گواہی کیلئے پیش ہوا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے انکوائری افسر کو جو لمبا چوڑا لیکچر پلایا تھا اس کی گونج ابھی تک عدالت کے کمرے میں موجود تھی۔ شاید یہ میری حب الوطنی کی باتوں کا اثر تھا کہ وکیل استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد گلاب خان کو فارغ کر دیا' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وقوعہ کے وقت گلاب خان بنگلے پر موجود نہیں تھا۔

میں نے سرسری سے سوالات کئے۔ میں نے گلاب خان کے پاس جا کر پوچھا ''خان صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب آپ بنگلے پر ڈیوٹی نہیں دے رہے تھے۔ کیا آپ کہیں گئے ہوئے تھے؟''

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا ''وکیل صیب! ام اپنا ڈیوٹی سے چھٹی مٹی نہیں کرتا مگر اس رات ایک مجبوری پڑ گیا تھا اس لئے ام بنگلے پر موجود نہیں تھا۔''

''ایسی کون سی مجبوری پڑ گئی تھی خان صاحب؟''

''او یارا! ام تم کو کیا بتائے وکیل صیب!'' وہ گونج دار آواز میں بولا۔ ''امارا ایک رشتے دار پشاور جا رہا تھا۔ ام اس کو رخصت فرمانے اسٹیشن چلا گیا۔ ام بیگم صیب سے اجازت لے کر گیا تھا۔ پر ادھر اسٹیشن پر ایک لفڑا ہو گیا۔ امارے رشتے دار کے ساتھ اور بھی بہت لوگ تھا۔ اسٹیشن پر ان کا جھگڑا مگڑا ہو گیا۔ پشاور جانے والا رشتے دار تو روانہ ہو گیا مگر ام دوسرے لوگ کا جھگڑا نمٹانے میں ایسا مصروف ہوا کہ آدھا رات گزر گیا۔ ام نے بہت کوشش کیا کہ واپس لوٹ آئے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اس لئے ام اس رات بنگلے کا ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا۔''

مزید دو چار سوالات کے بعد میں نے جرح ختم کر دی۔

گلاب خان کے بعد شمسہ کا ڈرائیور محمد حسین کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ یہ کم وبیش وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ میں چالان کی کاپی میں اس کا بیان تفصیلاً پڑھ چکا تھا اور محمد حسین کیلئے میرے دل میں اچھا خاصا غصہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے شمسہ کی ذات کو مشکوک ظاہر کرنے کیلئے بہت زیادہ بے ہودہ گوئی کی تھی۔ میں چونکہ افتخار قریشی سے محمد حسین کے بارے میں مفید معلومات حاصل کر چکا تھا اس لئے اس کی درگت بنانے کیلئے پوری طرح تیار تھا۔

پہلے وکیل استغاثہ گواہ پر جرح کیلئے آگے بڑھا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''مسٹر محمد حسین! آپ کو ملزم کے پاس ملازمت اختیار کئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

گواہ نے جواب دیا ''صرف ایک سال۔''

''اس دوران میں تم نے ملزم کو کیسا پایا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

''انتہائی غصہ ور اور چڑچڑا'' محمد حسین نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ صرف تم سے ہی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا تھا؟''

''میں نے تو یہی محسوس کیا تھا'' گواہ نے جواب دیا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''جی ہاں' بڑی خاص وجہ تھی۔''

''اور وہ وجہ کیا تھی۔''

''ملزم مجھے اپنی بیوی کا رازدار سمجھتا تھا۔'' گواہ نے ناگواری سے بتایا۔

''رازدار ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''میں رازدار تھا ہی نہیں پھر میری مراد کیا معنی رکھتی ہے؟''

وکیل استغاثہ نے دوسرے زاویے سے پوچھا ''ٹھیک ہے' تم کسی بھی معاملے میں شمسہ کے رازدار نہیں تھے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ملزم تمہیں اپنی بیوی کا کس قسم کا رازدار سمجھتا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''وہ جی! بات دراصل یہ ہے کہ ملزم کا خیال تھا' میں اس کی بیوی کی مصروفیات کو اس سے پوشیدہ رکھتا ہوں۔''

''گویا ملزم کی بیوی کچھ اس قسم کی مصروفیات رکھتی تھی جن کو چھپایا جانا لازم ہو؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے انداز میں دریافت کیا۔

گواہ محمد حسین نے نہایت ہی مختصر جواب دیا ''جی ہاں!''

''کیا تم ملزم کی بیوی کی ان مصروفیات کو معزز عدالت کے علم میں لاؤ گے۔''

''اگرچہ یہ تذکرہ مناسب نہیں لگتا مگر مجبوری ہے'' گواہ نے کہا۔

''بالکل' بالکل! بعض اوقات بحالت مجبوری بہت کچھ ایسا کرنا پڑتا ہے جو عام حالات

میں انسان کو گوارا نہیں ہوتا'' وکیل استغاثہ نے گواہ کی ہچکچاہٹ کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ''عدالت میں سب کچھ سچ سچ بتانا چاہئے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔''

میں وکیل استغاثہ کا مقصد بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا' ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ وہ گواہ کی زبانی عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا تھا کہ میرے مؤکل کی بیوی ایک بے وفا عورت تھی چنانچہ افتخار قریشی نے انتقاماً اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ وکیل استغاثہ اپنے گواہ کے ذریعے جس منزل کی جانب بڑھ رہا تھا' میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔

گواہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گویا ہوا ''جناب سچی بات تو یہ ہے کہ ملزم کو اپنی بیوی کے کردار پر شک ہو گیا تھا۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزم کی بیوی کوئی اچھے کردار کی مالک نہیں تھی؟''

''بس جناب! کچھ اسی قسم کی بات تھی۔'' گواہ نے مبہم سا جواب دیا۔

''کیا تم نے بھی اس میں کوئی عیب دیکھا تھا؟''

''جی کچھ مظاہرے میں نے دیکھے تھے۔''

''کس قسم کے مظاہرے؟''

''چھوڑیں جی!''

''کیوں؟''

وکیل استغاثہ کے بلند آہنگ ''کیوں'' پر گواہ نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور قدرے دھیمے لہجے میں بولا ''کیا یہ سب کچھ بتانا ضروری ہے؟''

''ہاں بہت ضروری ہے' بہت ضروری'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

گواہ نے چند لمحے توقف کیا پھر بتانے لگا ''جناب! میں چونکہ زیادہ تر شمسہ کی گاڑی ڈرائیور کرتا تھا اس لئے مجھے اس کے نزدیک رہنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ وہ بعض اوقات ایسے مقامات پر بھیجتی تھی جن کے بارے میں ملزم کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ شمسہ اجنبی لوگوں سے ملتی تھی' ان سے بے تکلف ہوتی تھی اور میں یہ ضرور کہوں گا کہ ملزم کا اپنی بیوی پر شک کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ وہ واقعی اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ غیرت میں آ کر تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر ملزم نے اپنی بیوی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا ہے تو اس میں کسی اچنبھے کی بات نہیں بلکہ ملزم کیلئے دہرے فائدے کی بات ہے...... میرا مطلب ہے' دہرے فائدے کی بات ہوتی اگر وہ پکڑا نہ جاتا تو......''

''دہرے فائدے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں پوچھا۔

گواہ نے جواب دیا ''جناب! یہ تو سامنے کی بات ہے۔ ایک طرف تو ملزم نے اپنی بے وفا بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور دوسری جانب شمسہ کی تمام دولت و جائیداد اس کے پاس واپس آ جاتی مگر بدقسمتی سے وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور اس کا منصوبہ خاک میں مل کر رہ گیا۔''

میرا مؤکل افتخار قریشی اپنے خلاف کی جانے والی تمام باتیں سن رہا تھا مگر کسی بھی مرحلے پر وہ مشتعل نہیں ہوا تھا اور یہ سب میری ہدایت کا نتیجہ تھا۔ میں نے اسے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ عدالت کے کمرے میں اسے کمال صبر وتحمل اور ضبط کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس کا پھل اسے کیس کے اختتام پر ضرور ملے گا۔

وکیل استغاثہ دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا ”تم نے معزز عدالت کے روبرو تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ ملزم تمہیں اپنی بیوی کا رازدار سمجھتا تھا۔ کیا اس کی وجہ یہی تھی کہ تم نے کبھی ملزم کو اس کی بیوی کی حرکتوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟“

”جی ہاں‘ میرے خیال میں یہی وجہ ہو سکتی تھی“ گواہ نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے استفسار کیا ”تم نے شمسہ کی پردہ پوشی کیوں کی؟“

”اس کی دو وجوہات تھیں“ گواہ نے بتایا۔

”مثلاً کون سی دو وجوہات؟“

”پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زبان بندی کیلئے شمسہ مجھے ایک معقول رقم دیتی تھی“ گواہ نے کمال ڈھٹائی بلکہ بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوتے کہا ”اور دوسری وجہ یہ تھی میں شمسہ کے راز کو راز رکھ کر ثواب کمانا چاہتا تھا۔ میں نے کسی مولوی سے سنا تھا کہ دوسروں کی پردہ پوشی کرنے والوں سے خدا بہت خوش ہوتا ہے اور انہیں بے انتہا نوازتا ہے۔“

گواہ محمد حسین کے اس وضاحتی مگر مکروہ بیان کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی اور مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

پچھلے آدھے گھنٹے میں گواہ اور وکیل استغاثہ کے درمیان میں جس قسم کی منافقانہ اور سازشانہ گفتگو ہوئی تھی‘ اس نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میں بڑے جارحانہ انداز میں گواہ والے کٹہرے کے پاس پہنچا اور گواہ محمد حسین کو تیز نظر سے گھورنے لگا۔

وہ چند لمحات تک خاموش کھڑا رہا پھر نظر چرانے لگا۔ میں نے جب اس پر بھی اسے گھورنا موقوف نہ کیا تو وہ اضطراری انداز میں ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر اپنے وجود کے بوجھ کو منتقل کرتے ہوئے بولا۔

”وکیل صاحب! آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا ”میں تمہیں اس لئے اتنے غور سے دیکھ رہا ہوں کہ شاید کبھی زندگی میں دوبارہ تم جیسی ہستی کا دیدار نصیب نہ ہو۔“

”کیوں‘ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے؟“

”تم میں بہت ہی خاص بات ہے۔“

”کیا خاص بات ہے جناب؟“

میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم اعلیٰ پیمانے کے

دروغ گو اور بے غیرت درجہ اول ہو۔“

”مجھے اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز نکالی۔

میں نے ترکی بہ ترکی کہا ”آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”آپ معزز گواہ کی انسلٹ کر رہے ہیں۔“

”اور تھوڑی دیر پہلے آپ میرے مؤکل کی بیوی کی عزت افزائی کر رہے تھے؟“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میں جو کچھ بھی کر رہا تھا‘ حقائق کو سامنے لانے کیلئے کر رہا تھا۔“

”میں بھی حقائق ہی کی نقاب کشائی کر رہا ہوں۔“

”آپ استغاثہ کے گواہ پر الزام لگا رہے ہیں“ وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور آپ نے کیا شمسہ کو کسی انعام سے نوازا تھا؟“

اس مرحلے پر جج کو ہمارے درمیان مداخلت کرنا پڑی۔ وہ بیک وقت ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بھاری آواز میں بولا ”آپ دونوں صاحبان آپس میں الجھنے کے بجائے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں تو مناسب ہوگا۔“

”او کے یور آنر؟“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ ڈرائیور محمد حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرا انداز قدرے مختلف تھا۔ میں نہایت مہارت کے ساتھ اسے گھیرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”محمد حسین! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ملزم کے پاس تم لگ بھگ ایک سال سے کام کر رہے ہو‘ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب‘ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”اس سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟“

”میں ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے پر کام کرتا تھا۔“

”وہاں تم نے کتنا عرصہ کام کیا؟“

”چھ ماہ صرف!“

میں نے سوال کیا ”اور ڈیفنس والے بنگلے پر کام حاصل کرنے سے قبل تم کیا کرتے تھے؟“

”ڈرائیوری ہی کرتا تھا“ اس نے بتایا ”مجھے بس یہی کام آتا ہے۔“

”ڈیفنس والے بنگلے سے پہلے تم کس کے یہاں ڈرائیوری کرتے تھے۔“

وہ بولا ”میں ناظم آباد کے ایک بنگلے پر کام کرتا تھا۔“

”تمہارے کام میں یہ بات مشترک نہیں کہ تم ہمیشہ نوکری کیلئے کسی بنگلے کا ہی انتخاب کرتے ہو؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ عام سے لہجے میں بولا ''بس جی' آپ اسے ایک اتفاق ہی سمجھ لیں۔''

''اتفاق سمجھوں یا تمہاری پلاننگ؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب!'' وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو' میں جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی ایک ہی سوال کو رگیدنے کے بجائے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

''تم نے ناظم آباد والے بنگلے پر کتنا عرصہ کام کیا تھا؟''

''تقریباً آٹھ ماہ تک'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا ''اگر میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں تو اس سے پہلے تم گارڈن ایسٹ کے ایک بنگلے پر کام کرتے تھے' وہاں تم صرف چار ماہ ٹکے تھے؟''

''آپ بالکل غلطی پر نہیں ہیں وکیل صاحب!'' اس نے میرے بیان کی تائید کی۔

میں نے پوچھا ''تم اتنی جلدی جلدی نوکریاں کیوں بدلتے رہتے ہو؟''

''بس جی' کہیں میں مالکوں کو پسند نہیں آتا اور کہیں وہ مجھے پسند نہیں آتے'' اس نے کمال تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اسے تیز نظر سے گھورا اور گھمبیر لہجے میں کہا ''مسٹر محمد حسین! میری بات توجہ سے سنو۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''تم نے کبھی بھی کام خود نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ تمہیں نوکری سے نکالا گیا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟'' اس کے چہرے پر مصنوعی حیرت ابھر آئی۔

میں نے کہا ''گارڈن ایسٹ والے بنگلے سے تمہیں اس لئے نکالا گیا کہ تم اپنے مالک کی بیٹی سے عشق لڑانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ناظم آباد والے بنگلے سے تمہاری نوکری اس لئے ختم ہوگئی کہ تم اپنے مالک کی بیوہ بہن پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ ڈیفنس والے بنگلے سے تمہیں اس لئے برخاست کیا گیا کہ تم نے بنگلے کے مالک کی ایک مہمان خاتون سے دست درازی کی کوشش کی تھی'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے محمد حسین کو عقابی نگاہ سے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم میرے بیان کو جھٹلا سکتے ہو؟''

''بالکل جھٹلا سکتا ہوں'' وہ قطعیت سے بولا ''اس لئے کہ آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ میرے ساتھ کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جناب عالی! وکیل صفائی بلاوجہ کی الزام تراشی کر کے میرے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس کی عزت اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ وہ فاضل وکیل کو اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرے یا

پھر ان سے ان کے دعووں کے ثبوت طلب کرے۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھے مخاطب کیا ''آپ گواہ کے ماضی کے حوالے سے جو انکشافات کر رہے ہیں' ان کا کوئی ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟''

میں نے کہا ''جناب عالی! میں کوئی بھی بات بلا جواز نہیں کر رہا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر میں ان تمام مالکان کو عدالت میں پیش کرنے کا وعدہ کرتا ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی ناپسندیدہ اور بیہودہ عمل کے سبب استغاثہ کے گواہ محمد حسین کو نوکری سے نکالا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گواہ کے ماضی کا ریکارڈ بہت ہی آلودہ ہے۔''

''تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟'' جج نے براہ راست گواہ سے سوال کیا۔

وہ بولا ''جناب! اگر وکیل صفائی سچے ہیں تو آئندہ پیشی پر اپنی سچائی ثابت کرنے کیلئے تمام متعلقہ افراد کو عدالت میں پیش کریں۔''

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے گواہ محمد حسین سے پوچھا ''کیا یہ سچ ہے کہ میرے مؤکل نے بھی تمہیں وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر آئندہ تم نے کوئی نازیبا حرکت کی تو تمہاری نوکری بھی جا سکتی ہے۔''

گواہ کے جواب دینے سے پہلے وکیل استغاثہ بول اٹھا ''استغاثہ کے گواہ نے ایسی کون سی نازیبا حرکت کی تھی' یہ بھی بتا دیں میرے فاضل دوست؟''

''اس نے اپنی مالکن شمسہ سے 'فری' ہونے کی کوشش کی تھی'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ''افتخار قریشی نے گواہ کی اس حرکت کو اس کی پہلی غلطی گردانتے ہوئے صرف سرزنش پر اکتفا کیا تھا۔ وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ گواہ عادی مجرم ہے۔''

''یہ بالکل جھوٹ ہے۔'' گواہ تیز آواز میں چیخا۔

میں نے کہا ''محمد حسین! چیخنے چلانے سے تم خود کو بری الذمہ نہیں ثابت کر سکتے۔ افتخار قریشی اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اس سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔'' پھر میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''جناب عالی! اگر معزز عدالت ضرورت محسوس کرے تو اس بارے میں ملزم سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔''

جج نے میرے مؤکل افتخار قریشی سے اس امر کی تصدیق چاہی۔ افتخار نے بتایا ''جناب عالی! یہ بات سچ ہے کہ میں نے گواہ کو اس سلسلے میں تنبیہ کی تھی کہ وہ آئندہ میری بیوی پر ڈورے ڈالنے سے باز رہے ورنہ میں اسے نوکری سے نکال دوں گا۔''

جج نے ملزم سے پوچھا ''تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ گواہ کسی قابل گرفت اور نازیبا حرکت کا مرتکب ہوا ہے؟''

''مجھے یہ بات میری بیوی شمسہ نے بتائی تھی۔''

''پھر تو تمہیں فوری طور پر گواہ کو فارغ کر دینا چاہئے تھا۔''

"میں نے ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کیا تھا" افتخار قریشی نے کہا "مگر میں اپنی طبیعت کی نرمی سے مجبور ہوں۔ مجھ میں درگزر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں نے گواہ کی اس حرکت کو اس کی پہلی خطا سمجھ کر معاف کر دیا اور آئندہ کیلئے اسے وارننگ دے دی۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور پہلی غلطی اگر قابل تعزیر نہ ہو تو تادیبی کارروائی ہی کافی ہوتی ہے۔"

اس وضاحت پر جج اپنی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ میں اپنی جرح جاری رکھوں۔ میں استغاثہ کے گواہ محمد حسین ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"محمد حسین! تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم کو اپنی بیوی شمسہ کے کردار پر شک تھا؟"

"جی ہاں' میں نے یہی بتایا تھا" اس کی ڈھٹائی دیدنی تھی۔

میں نے پوچھا "ملزم کو اپنی بیوی پر کس قسم کا شک تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ شمسہ اس سے بے وفائی کر رہی تھی۔"

"کیا ملزم نے اس خیال کا اظہار تم سے کیا تھا؟"

"نہیں' اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"پھر تم نے یہ کیسے جان لیا؟"

"میں نے خود ہی جان لیا۔"

"مگر کیسے؟"

"بس یونہی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "محمد حسین! تمہارے "بس یونہی" کہہ دینے سے بات نہیں بنے گی۔ تمہیں اس طریقے یا ذریعے کی وضاحت کرنا ہو گی جس سے تمہیں شمسہ کی بے وفائی کے بارے میں پتا چلا...... یا تم نے اندازہ لگایا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "میں نے اپنی آنکھوں سے چند مرتبہ ملزم کو اپنی بیوی شمسہ کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی گاڑی شمسہ کی گاڑی کے پیچھے مجھے کئی بار نظر آئی تھی حالانکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔"

"اس سے تم نے سمجھ لیا کہ ملزم کو اپنی بیوی پر اعتماد نہیں رہا اور وہ چوری چھپے اس کی نگرانی کر رہا ہے؟" میں نے گواہ سے سوال کیا۔

"جی ہاں' میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔"

گواہ محمد حسین اور خصوصاً استغاثہ کا پورا زور اس بات کو ثابت کرنے پر تھا کہ میرے موکل کی بیوی شمسہ ایک بے وفا اور بدچلن عورت تھی لہٰذا اس عمل کی سزا کے طور پر افتخار قریشی نے اسے قتل کر دیا۔ مجھے استغاثہ کا زور توڑنے کیلئے شمسہ کے ماتھے سے بے وفائی کا جھوٹا داغ مٹانا تھا اور مجھے یقین واثق تھا کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیابی حاصل کر لوں گا کیونکہ سانچ کو آنچ نہ' یہ ممکن نہیں

تھا۔

میں نے گواہ سے پوچھا "محمد حسین! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ شمسہ اکثر غیر معروف اور قابل اعتراض جگہوں پر بھی جاتی تھی' وہ اجنبی لوگوں سے ملتی تھی' ان سے بے تکلف ہوتی تھی اور ایسی حرکات کا ارتکاب کرتی تھی جو بے وفائی کے زمرے میں آتی ہیں۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا "جی ہاں' میں نے یہی بتایا تھا۔"

میں نے پوچھا "تم نے شمسہ کی ان غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں ملزم کو تو ضرور بتایا ہو گا؟"

"میں نے اسے کبھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا" گواہ نے جواب دیا "یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے شمسہ کا رازدار سمجھنے لگا تھا اور مجھ سے ہمیشہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا تھا۔"

میں نے پوچھا "تم شمسہ کی مبینہ حرکتوں کے بارے میں افتخار قریشی کو کیوں نہیں بتایا تھا؟"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا "کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس نہیں بتایا میں نے۔"

"اب تم یہ تو نہ کہو کہ کوئی خاص وجہ نہیں تھی؟" میں نے کہا

"پھر کیا کہوں وکیل صاحب؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"سچ کہو...... اور سچ کے سوا کچھ نہ کہو" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کیونکہ تم ایسا کرنے کیلئے حلف اٹھا چکے ہو۔"

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور پوچھا "میرے فاضل دوست! اگر ایسی کوئی خاص وجہ تھی تو آپ ہی عدالت کے ریکارڈ پر لے آئیں۔"

"وہ وجہ عدالت کے ریکارڈ پر آ چکی ہے میرے محترم دوست!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر بولا "میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"شاید آپ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں صرف آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عدالت میں پیش ہوتے وقت اپنی آنکھوں کا اور کانوں کو کھلا رکھا کریں مگر لگتا ہے آپ صرف زبان کا استعمال ہی جانتے ہیں۔"

"میں اب بھی آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "شاید آپ کو یاد نہیں کہ آپ کا گواہ اپنے اس عمل کی وضاحت کر چکا ہے کہ وہ شمسہ کے معاملات کو ملزم سے پوشیدہ کیوں رکھتا تھا؟"

وکیل استغاثہ نے میکانکی انداز میں گواہ کی جانب دیکھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ”سنیں وکیل صاحب! میں آپ کو بتایا ہوں۔“ وہ میری جانب متوجہ ہوا تو میں نے وضاحتی انداز میں کہا ”گواہ محمد حسین یہ رازداری اس لئے برت رہا تھا کہ وہ اس کے بدلے میں ڈبل فائدہ اٹھا رہا تھا۔“

میں نے ”ڈبل فائدہ“ کے الفاظ خاص طور پر استعمال کئے تھے۔ یہ اس حملے کا جواب...... بلکہ دندان شکن جواب تھا جو کچھ دیر پہلے گواہ نے میرے موکل پر کیا تھا۔ محمد حسین نے کہا تھا کہ افتخار قریشی نے ”دہرے فائدے“ کیلئے قتل کیا تھا۔ یعنی ایک طرف اس نے اپنی بیوی سے انتقام لیا تھا اور دوسری جانب اس کی دولت و جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا ”آپ کون سے ڈبل فائدے کی بات کر رہے ہیں؟“

میں نے جواب دیا ”ڈبل فائدے سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کا گواہ بقول اس کے ملزم کو بے خبر رکھ کر ایک طرف تو شمسہ سے اس کام کا معاوضہ وصول کر رہا تھا اور دوسری جانب وہ اپنی دانست میں ”جنت“ بھی کما رہا تھا کیونکہ اس نے کسی مولانا سے سن رکھا تھا کہ خدا ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دوسروں کی پردہ پوشی کرتے ہیں“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”میرے فاضل دوست! یہ تو وہی بات ہوئی کہ...... رند کے رند ہے رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

وہ اظہار خیال کرنے کے بجائے بغلیں جھانکنے لگا۔

جج بار بار دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں جج کی اضطراری نظر کو سمجھ رہا تھا اس لئے فوراً استغاثہ کے گواہ محمد حسین ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”محمد حسین! تم نے وکیل استغاثہ کے سوالوں کے جواب میں بتایا ہے اور ازاں بعد میری جرح کے جواب میں بھی تصدیق کی ہے کہ شمسہ ایک بے وفا اور بد چلن عورت تھی۔ تم نے اس کی بدچلنی کے مظاہرے بھی دیکھے تھے‘ جب وہ نامحرم مردوں سے بے تکلف ہوتی تھی۔ تم نے یہ بھی بتایا ہے کہ تم اس سلسلے میں اس کے رازدار تھے۔ وہ تمہاری زبان بندی کیلئے تمہیں ایک معقول رقم دیتی تھی۔“

وہ توجہ سے میری بات سننے کے بعد بولا ”ہاں‘ یہ سب میں نے بتایا تھا۔“

”اب لگے ہاتھوں یہی بھی بتا دو کہ شمسہ کن نامحرم لوگوں سے ملتی تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ گڑبڑا گیا“ وہ جی...... وہ جی...... مجھے کیا معلوم؟“

”تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا ”کیونکہ تم اس کے رازدار تھے۔ وہ جہاں بھی جاتی تھی‘ تم اس کے ڈرائیور کے طور پر اس کے ساتھ جاتے تھے اسی لئے تو تم نے اس کی

بے وفائی اور بے حیائی کے مظاہرے دیکھے تھے۔ یہ تمہارا ہی بیان ہے محمد حسین۔“

وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا ”میں اس کے ساتھ ضرور جاتا تھا لیکن ان مشکوک لوگوں سے میرا میل جول نہیں تھا اس لئے میں ان کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔“

”تم ان جگہوں کے بارے میں تو بتا سکتے ہو جہاں جہاں شمسہ اپنے شوہر کے علم میں لائے بغیر جایا کرتی تھی؟“

میں محمد حسین کو جرح کی چکی میں پیس ڈالنا چاہتا تھا۔

وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا ”اس وقت مجھے ان جگہوں کے نام یاد نہیں آ رہے۔“

”یاد کرو‘ ذہن پر زور ڈالو۔“ میں نے حکمیہ انداز میں کہا ”کوشش کرو‘ ان مقامات کے نام تمہیں یاد آ جائیں‘ یہ بہت ضروری ہے۔“

”میں کوشش کر چکا ہوں۔“

”پھر کیا نتائج برآمد ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بے بسی سے بولا ”مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا وکیل صاحب۔“

”اس کا مطلب ہے تمہاری یادداشت واپس لانا ہو گی۔“

میں نے کہا۔

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا ”آپ میرے ساتھ کیا کرنے کا اردہ رکھتے ہیں؟ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور یکے بعد دیگرے اس کے پاؤں اور سر کو گھورنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ بے چینی مگر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے پراضطراب لہجے میں دریافت کیا ”یہ آپ بار بار میرے پاؤں اور سر کو کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں یا پاؤں میں کوئی خطرناک سانپ لوٹ رہا ہے؟۔“

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”تمہارے سر پر سینگ نہیں نکل سکتے کیونکہ وہ ایک مرتبہ نکل کر غائب ہو چکے ہیں بالکل اس کی طرح۔“ میں نے پراسرار انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک لمحے کے بعد کہا ”اور تم کسی موذی سانپ سے زیادہ خطرناک ہو چنانچہ تمہارے قدموں میں سانپ لوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ میرے طنز کے تیروں سے چھلنی ہو گیا‘ احتجاجی لہجے میں بولا ”پھر آپ بار بار مجھے اس طرح شک زدہ نظروں سے کیوں گھور رہے ہیں؟۔“

”مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”میں نے سن رکھا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا۔ میں اس وقت یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم بڑے جھوٹے ہو یا تمہارا جھوٹ تم سے زیادہ بڑا ہے۔“

میرے اس تبصرے پر عدالت کے کمرے میں لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جج کو بھی زیر لب مسکراتے ہوئے دیکھا۔ گویا میں معزز عدالت کو یہ باور کرانے میں کامیاب

ہو گیا تھا کہ استغاثہ کے گواہ نے متعدد بار دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ خاص طور پر شمسہ کے کردار کے حوالے سے اس کے الزامات بودے اور خالی از حقیقت تھے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو میں عدالت کے علم میں لانا چاہتا تھا۔ شمسہ ایک وفا شعار اور محبت کرنے والی بیوی تھی چنانچہ افتخار قریشی کے اس کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ محمد حسین کو باوجود کوشش کے بھی ان مقامات اور لوگوں کے نام یاد نہیں آ رہے تھے جن سے شمسہ کی بے راہ روی اور بے وفائی مشروط تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ محمد حسین کے بیان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ استغاثہ کی ذاتی کوششوں کا چمتکار تھا۔ میرے لئے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ جج میرے نقطہ نگاہ کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

عدالت کے کمرے میں موجود سامعین چہ میگوئیوں میں مصروف تھے کہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم باہر آئے تو اجمل شاہ نے مجھ سے کہا ''بیگ صاحب آج تو آپ نے استغاثہ کے گواہ کی ایسی کی تیسی کر دی ہے۔''

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں' میں نے گول مول جواب دیا۔

آج توصیف بھی اجمل کے ساتھ تھا۔ وہی عدالتی کارروائی کے دوران میں ہمہ وقت وہاں موجود رہا تھا۔ اس نے کہا ''وکیل صاحب یہ ہمارا ڈرائیور تو سالا پکا نمک حرام نکلا۔ ایک سال سے ہمارا نمک کھا رہا تھا اور ہماری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں تو عدالت کے وقار کی وجہ سے خاموش رہا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا' اس سیاہ بخت منحوس کے ٹکڑے کر دوں۔ وہ ممی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کر رہا تھا اس پر میں اس خنزیر کی زبان کاٹ سکتا تھا۔''

''تمہیں جوش و جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں نوجوان' میں نے توصیف کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا ''میں ہوں نا' ان مکار اور عیار لوگوں سے نمٹنے کیلئے۔ آپ لوگوں نے مجھے وکیل کیا ہے تو اب آپ کو کوئی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں' خاص طور پر میں تمہیں یہ نصیحت کروں گا کہ کبھی بھی' کسی بھی مرحلے پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔''

توصیف کی اٹھتی ہوئی جوانی تھی۔ اس کی رگوں میں ولولہ انگیز خون دوڑ رہا تھا۔ اس عمر میں خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا ہے پھر توصیف پر تو صحت و جوانی ٹوٹ کر برسی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک وجیہہ شخص تھا۔ دیکھنے والوں کی رائے تھی کہ اس میں اپنی ماں یعنی شمسہ کی شباہت تھی۔ قد کاٹھ اس نے اپنے والد کا لیا تھا۔

وہ میری بات کو سمجھ گیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''مگر وکیل صاحب' ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ کل تک جو لوگ ہمارے تلوے چاٹ رہے ہوتے ہیں' ہمارے دست نگر ہوتے ہیں اور اپنی ہر ضرورت کیلئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں' وہ اچانک خم ٹھونک کر ہمارے مقابلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں؟''

''یہ دنیا ہے برخوردار۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''یہاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔''

پھر میں نے اسے میر کا پورا شعر پڑھ کر سنایا۔ ''یہ تو ہم کا کارخانہ ہے۔ یہاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔''

وہ فکر انگیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے سانپ کی کینچلی کے بارے میں تو سن رکھا ہے لیکن انسان بھی اتنے روپ بدلتے ہیں' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

میں نے اس مرتبہ اسے غالب کا شعر سنا دیا جو انسانی نفسیات' رویوں اور فطرت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ برسوں پہلے غالب نے جو حقیقت شعر کے قالب میں ڈھالی تھی' وہ ہر دور کے انسان پر فٹ بیٹھتی ہے۔ آپ بھی سن لیجئے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اجمل شاہ کافی دیر سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا ''جی شاہ صاحب! کوئی خاص بات؟''

اس نے کہا ''بیگ صاحب! میں اب تک کی عدالتی کارروائی سے مطمئن ہوں۔ آپ نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور بڑی حد تک شمسہ بھابی مرحومہ کی پوزیشن صاف بھی کر دی ہے مگر اصل معاملہ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا ہے۔''

''کون سا اصل معاملہ شاہ جی؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... میرا مطلب ہے' افتخار صاحب والا معاملہ۔''

''یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں تو ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''جب استغاثہ کے موقف کے مطابق قتل کا جواز باقی نہیں رہے گا تو افتخار قریشی کی پوزیشن بھی صاف ہو جائے گی۔''

اجمل شاہ نے لفظ ''وہ'' کو اپنے مخصوص انداز میں کھینچتے ہوئے کہا: ''وہ...... دیکھیں نا' میں یہ کہہ رہا تھا...... میرا مطلب ہے' کیا آپ نے افتخار صاحب کو بے گناہ ثابت کرنے کیلئے اپنے ذہن میں کوئی لائحہ عمل تیار کر رکھا ہے؟''

وہ جس طرح گھما پھرا کر بات کر رہا تھا' اس سے مجھے شدید کوفت محسوس ہوئی۔ جو لوگ اپنے پتے چھپا کر دوسروں کو گھسنے کی کوشش کرتے ہیں' میں ان سے الرجک ہو جاتا ہوں مگر چونکہ وہ میرا کلائنٹ تھا اور ایک طرح سے اس کیس میں سب سے زیادہ سرگرمی وہی دکھا رہا تھا اس لئے میں اسے کچھ چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ بہرحال وہ اپنے عمل سے ملزم افتخار قریشی کا خیرخواہ ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے متحمل لہجے میں کہا ''شاہ صاحب! آپ پریشان نہ ہوں میرے ذہن میں اس مقدمے کی ایک ایک اہم اور ضروری بات نقش ہے اور آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا ہو گا؟''

وہ جھینپتے ہوئے بولا ''ظاہر ہے' آپ ایک کامیاب اور تجربہ کار وکیل ہیں۔ آپ جو قدم اٹھائیں گے' سوچ سمجھ کر ہی اٹھائیں گے۔ میں تو بس ذرا یونہی...... اپنے اطمینان کی خاطر پو رہا تھا۔ دیکھیں نا' یہ معاملہ اتنا حساس ہے کہ ہر پہلو پر گہری نظر رکھنا ہوگی۔''

میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا ''آپ بالکل مطمئن ہو جائیں شاہ صاحب! جب مجھ تجربہ کار اور کامیاب وکیل مان رہے ہیں تو پھر آپ کو فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے وہ واقعی مطمئن ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں اس کیس کا تفتیشی افسر کھڑا تھا۔ گزشتہ دو پیشیوں پر تین غیر اہم گواہوں کا بیان بھی ہوا تھا۔ استغاثہ کے ان گواہوں کے بیان اور ان پر جانے والی جرح میں قابل ذکر بات کوئی نہیں تھی اس لئے قیمتی صفحات کا خیال کرتے ہوئے میں یہاں ان کے بارے میں تحریر نہیں کیا۔

انکوائری افسر یا تفتیشی افسر یا آئی او ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ اپنی کارکردگی کی مکمل رپورٹ پہلے ہی چالان کی صورت میں عدالت میں دائر کر چکا تھا تاہم عدالتی کارروائی کے تقاضوں کے پیش نظر زبانی بھی اپنی کوششوں کا احوال معزز عدالت کے روبرو دہرانا تھا۔

وہ پندرہ بیس منٹ تک اپنی تفتیشی کارروائی کا بیان کرتا رہا۔ جب اس کی کہانی اختتام پذیر ہوئی تو وکیل استغاثہ نے جرح کے نام پر چند سوالات کیے پھر میری باری آئی۔

میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھا پھر جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں آئی او کی جانب مڑ گیا۔ انکوائری افسر کلف دار سرکاری وردی میں تھا۔ اس کے شولڈرز پر ''سب انسپکٹر'' کی خاص نشانی ''دو پھول'' دونوں جانب موجود تھے۔ میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''انکوائری افسر صاحب! آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟''

''شمشاد'' اس نے جواب دیا۔ ''شمشاد علی!''

''کیا میں آپ کو آپ کے نام سے مخاطب کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ''بڑی خوشی سے وکیل صاحب!''

میں نے کہا ''شمشاد صاحب' آپ کو واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''ملزم افتخار قریشی نے۔'' اس کا جواب تھا۔

میں نے پوچھا ''کب؟''

''چھبیس جنوری کو۔''

''اور شمسہ کی موت کا واقعہ کب پیش آیا تھا؟''

''پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب کو۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا ''شمشاد صاحب! کیا ملزم اطلاع دینے خود آپ کے پاس آیا تھا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا ''نہیں جناب' اس نے فون پر اطلاع دی تھی۔''

میں نے اپنے کاغذات پر نگاہ ڈالی اور اگلا سوال کیا ''آپ نے ملزم کو گرفتار کب کیا تھا؟''

''ستائیس جنوری کی صبح سات بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی واقعے کی اطلاع ملنے کے کم و بیش چوبیس گھنٹے بعد؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''جی ہاں۔''

''اس تاخیر کا سبب کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''دراصل ہم ایک الجھن میں پڑ گئے تھے۔''

''اس الجھن کا تعلق ملزم کے باورچی خانے سے تو نہیں تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں' کچھ ایسی ہی بات تھی'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''پہلے آپ کا خیال تھا کہ باورچی انور علی نے دودھ میں زہر پلا کر شمسہ کو دیا ہوگا مگر اس کے بعد آپ کا شک ملزم افتخار قریشی کی جانب چلا گیا۔ کیوں' یہی بات تھی نا؟''

وہ تائیدی انداز میں بولا ''کم و بیش یہی بات تھی۔''

''آپ نے فوری طور پر باورچی انور علی کو گرفتار کیوں نہیں کیا تھا؟''

''ہم تذبذب کا شکار ہو گئے تھے۔'' وہ سادہ سے انداز میں بولا۔ ''انور علی کے حوالے سے قتل کے اسباب یا وجوہات کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔''

''اس لئے آپ نے اسے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا؟'' میں نے چوٹ کی۔

وہ بولا ''جب ہمیں قتل کے محرکات کا علم ہو گیا اور جس زہر سے شمسہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا' اس کا منبع یعنی شیشی مل گئی تو ہم نے مطلوبہ بندے پر ہاتھ ڈال دیا۔ انور علی کو اگر ہم نے استغاثہ کے گواہوں میں شامل کیا ہے تو اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ''مگر اللہ کے بندے! اس بے چارے کو کوئی پٹی وغیرہ تو پڑھا دی ہوتی۔ اس کی گواہی تو الٹی استغاثہ کے خلاف چلی گئی۔''

وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا ''گواہ انور علی کی شہادت سے استغاثہ متاثر نہیں ہوتا۔ حقیقت یہی ہے کہ ملزم نے دولت و جائیداد سمیٹنے اور اپنی بے وفا بیوی سے نجات حاصل کرنے کیلئے قتل ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ''اور ہاں' یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہم استغاثہ کے گواہوں کو کوئی پٹی شٹی نہیں پڑھاتے...... آپ کی یہ غلط فہمی جانے کب دور ہو گی؟''

''اس اطلاع کا شکریہ آئی او صاحب!'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''میں آپ کو

یقین دلاتا ہوں کہ میں نے آپ کی بات کا اعتبار کرلیا ہے۔ آپ نے واقعی میری غلط فہمی دور کر دی ہے۔''

وہ بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ میں اس پر گہرا طنز کر رہا ہوں مگر وہ میری اس حرکت کیلئے مجھے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اس لئے ضبط کیے خاموش کھڑا رہا۔

میں نے پوچھا ''شمشاد صاحب! آپ کو یہ خیال کس طرح آ گیا کہ فیکٹری والے دفتر پر چھاپا مارا جائے۔ کیا اس سلسلے میں آپ کو کسی نے کوئی اطلاع وغیرہ دی تھی؟''

''یہ خالصتاً میرا ذاتی آئیڈیا تھا۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا ''میں ملزم کے پورے بنگلے کی تلاشی لے چکا تھا مگر قابل گرفت کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا' ذرا فیکٹری کی بھی چھان بین کر کے دیکھ لی جائے۔ ممکن ہے' کوئی اہم سراغ مل جائے اور ایسا ہی ہوا بھی۔''

''یعنی آپ کو ملزم کے دفتر سے زہر والی وہ شیشی مل گئی۔'' میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔

وہ پر جوش انداز میں بولا ''نہ صرف زہر والی شیشی مل گئی بلکہ اس میں زہر کی اچھی خاصی مقدار بھی موجود تھی' بعدازاں جس کے لیبارٹری تجزیے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مقتولہ شمسہ کو اسی زہر سے ہلاک کیا گیا تھا۔''

میں نے کہا ''مذکورہ زہر والی شیشی آپ کو ملزم کے دفتر میں کس جگہ ملی تھی؟''

''ملزم کی میز کی دراز میں سے'' اس نے جواب دیا۔

''کیا میز کی دراز لاک تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں دراز ہمیں کھلی ملی تھی۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم انتہائی احمق انسان ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کے مفروضے کے مطابق اس نے ایک انتہائی سریع الاثر خطرناک زہر سے اپنی بیوی کو ٹھکانے لگایا پھر اس زہر کی شیشی کو ثبوت کے طور پر اپنی کھلی ہوئی دراز میں رکھ دیا تا کہ پولیس کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ وہ آسانی سے زہر والی شیشی برآمد کر کے اس کی موت پر تصدیق کی مہر ثبت کر دے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ میرا موکل اپنی جان کا دشمن ہو گیا تھا۔''

اس موقع پر انکوائری افسر نے وہی گھسا پٹا مقولہ دہرایا کہ ذہین سے ذہین مجرم بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے جس سے وہ قانون کی پکڑ میں آ جاتا ہے۔ پھر کہا ''آپ کا موکل تو نہایت اناڑی مجرم ثابت ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا ''تفتیشی افسر صاحب! آپ کے چالان میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ شامل نہیں ہے۔ کیا آپ نے زہر والی شیشی پر سے فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے تھے؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔

''حالانکہ یہ تفتیش کا سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ خاموش کھڑا مجھے تکتا رہا۔

میں نے استغاثہ کا ایک واضح سقم جج کے سامنے ثابت کر دیا تھا۔ جج معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

میں نے انکوائری افسر سے پوچھا ''آئی او صاحب! کیا آپ نے اس گلاس پر سے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے جس کے زہریلے دودھ کو پینے سے شمسہ موت سے ہم کنار ہوئی تھی؟''

''اس گلاس پر مقتولہ کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے'' اس نے جواب دیا۔

''مگر اس تجزیے کی رپورٹ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔''

''وہ رپورٹ شامل مسل ہونے سے رہ گئی ہوگی۔''

''آپ نے رپورٹ تیار تو کی تھی نا؟''

''میرا خیال ہے' تیار کی تھی۔''

''خیال کیوں ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''یقین کیوں نہیں ہے؟''

وہ گڑبڑا گیا پھر ہراساں لہجے میں بولا ''شاید اس وقت پریشانی میں یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی تھی۔''

''پریشان تو آپ اس وقت بھی بہت زیادہ نظر آ رہے ہیں۔''

''نن...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا ''آئی او صاحب! بالکل ایسی ہی بات ہے۔ مجھے تو لگتا ہے' آپ انویسٹی گیشن کے شعبے میں زیادہ ماہر نہیں ہیں۔''

وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا ''بحیثیت تفتیشی افسر' یہ میرا پہلا کیس ہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں'' میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا ''آہستہ آہستہ ٹرینڈ ہو ہی جائیں گے۔ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ اس کی سفاک ٹھوکریں جینے کا ڈھنگ سکھا دیتی ہیں۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔ میں نے اس کی نظر کی پروا کیے بغیر کہا ''تفتیشی افسر صاحب! آپ کی رپورٹ کے مطابق شمسہ کنول کی موت پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب واقع ہوئی تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں' آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں'' وہ عام سے انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ شمسہ کی موت مذکورہ بالا رات میں گیارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان وقوع پذیر ہوئی تھی؟''

اس نے میری بات کی تائید میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا ''انکوائری افسر صاحب! واقعات اور شواہد کے مطابق شمسہ کی موت کا سبب وہ سریع الاثر بے رنگ' بے بُو' بے ذائقہ زہر ہے جو دودھ کے ساتھ اس کے معدے میں اتر گیا تھا۔ میں نے

کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''آپ کی بات بالکل درست ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک لمحے تک انکوائری افسر کے چہرے کا جائزہ لیا پھر سنسنی خیز انداز میں پوچھا ''متذکرہ بالا زہر کے بارے میں کیمیکل ایگزامنر کی رائے ہے کہ اس سے چٹکی بجاتے میں کسی بھی جاندار خصوصاً انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔''

''جی ہاں' اس خطرناک زہر کی یہی خاصیت بیان کی گئی ہے۔''

''پھر تو یہ بہت زود اثر زہر ہوا نا؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''آخر چٹکی بجانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔''

وہ چٹکی بجاتے ہوئے گویا ہوا ''بہت کم وقت لگتا ہے وکیل صاحب۔ یہی کوئی دو چار سیکنڈ یا اس سے بھی کم۔''

میں نے اس کی تائید کی ''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں'' پھر کہا ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شمسہ کی موت بھی جھٹ پٹ واقع ہو گئی ہو گی' بالکل چٹکی بجاتے میں؟''

''جی ہاں' ایسا ہی ہوا ہو گا'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا ''شمشاد علی صاحب! جب اس سریع الاثر زہر سے چند سیکنڈ میں موت واقع ہو سکتی ہے تو پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ دورانیہ دو گھنٹے کا کیوں ظاہر کیا گیا ہے؟'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ''میری مراد رات گیارہ اور ایک بجے کے وقت سے ہے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا ''میں نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ رپورٹ میں نے لکھی ہے۔ میں آپ کے سوال کا جواب کس طرح دے سکتا ہوں۔''

''پھر میرے سوال کا جواب کون دے گا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''آپ یہ بات میڈیکولیگل افسر سے دریافت کریں۔''

''چلیں' میں انہی سے پوچھ لیتا ہوں۔''

پھر میں نے جج سے درخواست کی کہ میڈیکولیگل افسر کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جائے۔ مذکورہ افسر اور کیمیکل ایگزامنر دونوں افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ جج کی ہدایت پر میڈیکولیگل افسر کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب! آپ تفتیشی افسر اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو بہ الفاظ دیگر جرح کو پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ مجھے امید ہے' آپ نے میرا آخری سوال بھی سنا ہو گا جس کے جواب کیلئے آئی او صاحب نے آپ کا نام پیش کیا ہے لیکن میں قاعدے کی رو سے اپنا سوال دہراؤں گا۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میڈیکولیگل افسر نے کہا۔

میں نے پوچھا ''آپ نے شمسہ کی موت کا وقت پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب میں گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کا لکھا ہے جب کہ اس کی موت ایک ایسے زہر سے واقع ہوئی ہے جو اپنے شکار کو پلک جھپکتے میں موت کی وادی میں پہنچا دیتا ہے۔ دو گھنٹے کے دورانئے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا شمسہ کی جان نکلنے میں اتنا زیادہ وقت لگا تھا؟''

میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی باریکیوں سے واقف تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ موت کے متوقع وقت میں ایک یا دو یا تین گھنٹے کا دورانیہ کیوں رکھا جاتا ہے مگر میں ایک خاص مقصد کی خاطر یہ سوال کر رہا تھا۔ میں عدالتی کارروائی کو ایک ایسے نکتے کی طرف لانا چاہتا تھا جس کیلئے میں نے کئی ماہ انتظار کیا تھا۔ اس کیس کو عدالت میں لگے اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

میڈیکولیگل افسر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ''وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ جب ہم کسی کی موت کا متوقع دورانیہ بتاتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس شخص کو مرنے میں اتنا وقت لگا ہو گا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے جج کی جانب دیکھا پھر اپنی وضاحت جاری رکھتے ہوئے بولا ''اور نہ ہی اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس دورانئے کا اوسط وقت کسی شخص کی موت کا وقت ہو گا۔ مثال کے طور پر مذکورہ کیس میں گیارہ اور ایک بجے کا اوسط وقت رات بارہ بجے کا وقت ہو گا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا۔'' میں نے کہا پھر سوالیہ انداز میں پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ شمسہ کی موت پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کسی بھی لمحے واقع ہوئی ہو گی۔ وہ لمحہ گیارہ بج کر ایک منٹ کا بھی ہو سکتا ہے اور بارہ بج کر انسٹھ منٹ کا بھی یا ان دو گھنٹوں کے درمیان کا کوئی بھی وقت ہو سکتا ہے۔''

''آپ بات کی تہ تک پہنچ گئے ہیں وکیل صاحب۔'' میڈیکولیگل افسر نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''ویسے ہم اپنے طور پر مارجن ضرور رکھتے ہیں۔''

''مارجن سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''مارجن کو آپ یوں سمجھیں کہ ہم احتیاط کا دامن ہر صورت میں تھامے رکھتے ہیں۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''آپ موجودہ کیس کی مثال سے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے شمسہ کی موت کا متوقع وقت رات گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کا لکھا ہے جبکہ میرے علم کے مطابق یہ وقت سوا گیارہ سے رات پونے ایک بجے کا ہونا چاہئے۔ میں نے احتیاطاً دونوں جانب پندرہ منٹ کا مارجن چھوڑا ہے۔''

لوہا گرم ہو چکا تھا اور اب چوٹ لگانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں میڈیکولیگل افسر سے سوال کیا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ کے طریقہ کار سے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی بھی صورت شمسہ کی موت رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوئی ہو گی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''اور اسی طرح اس بات کے امکانات بھی صفر کے برابر ہیں کہ شمسہ کی موت رات ایک بجے کے بعد واقع ہوئی ہو؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں دریافت کیا۔

''بالکل' بالکل۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''آپ کا تجزیہ یا اندازہ یا بیان جو کچھ بھی کہہ لیں...... صدفی صد درست ہے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ملائم لہجے میں ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے انکشاف کیا۔

''جناب عالی! موجودہ صورتحال کی روشنی میں' میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا موکل کسی بھی صورت اپنی بیوی کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ بے گناہ ہے' اسے کسی گہری سازش کے ذریعے اس مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔ یہ بات میڈیکولیگل افسر کے تازہ ترین بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟'' جج نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وکیل استغاثہ نے احتجاج کیا ''میڈیکو لیگل افسر کی وضاحت سے آخر کس طرح ملزم بے گناہ ثابت ہوتا ہے' یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

جج نے کہا ''بیگ صاحب! آپ اپنے دعوے کی وضاحت میں کیا کہیں گے؟''

میں نے نہایت ہی سنسنی خیز لہجے میں دھماکہ کیا ''یور آنر! میڈیکولیگل افسر کی ٹیکنیکل وضاحت کی روشنی میں میرا موکل اس طرح بے گناہ ثابت ہوتا ہے کہ شمسہ کی موت کے متوقع دورانیے میں وہ جائے وقوعہ سے دور اپنے ایک دوست غلام جیلانی کے گھر واقع ڈیفنس سوسائٹی میں موجود تھا۔ وہ پچیس اور چھبیس جنوری کی درمیانی شب رات دس بجے سے چار بجے تک غلام جیلانی کے بنگلے پر رہا تھا جہاں ان کے مشترکہ دوست آفتاب نصیر اور مسعود ظفر بھی پہنچے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات مرحومہ شمسہ کنول کو بھی معلوم تھی۔''

میرے اس سنسنی خیز انکشاف نے بھری عدالت پر سناٹا طاری کر دیا۔ جج اور وکیل استغاثہ سمیت تمام حاضرین عدالت مبہوت رہ گئے تھے اور سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

پھر اس سناٹے کو ایک چیختی ہوئی آواز نے مجروح کر دیا۔ یوں محسوس ہوا' جیسے اچانک کوئی بم پھٹا ہو۔ تمام افراد گردنیں موڑ موڑ کر آواز کے ماخذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عدالت کے کمرے میں یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

''ناممکن...... یہ نہیں ہو سکتا۔ شمسہ کو تو افتخار ہی نے زہر دے کر ہلاک کیا ہے۔ افتخار کے سوا کوئی دوسرا قاتل نہیں ہو سکتا۔ قاتل وہی ہے...... افتخار...... افتخار کو موت کی سزا ہونا چاہئے۔''

سب سے دلچسپ اور حیران کن بات یہ تھی کہ یہ الفاظ ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہو رہے تھے جو میرے موکل کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا...... یعنی اجمل شاہ!

اس کے ساتھ ہی ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ جیسے ہی اجمل شاہ نے اپنی بات پوری کی' وہ لڑکھڑایا اور چکر کھا کر زمین بوس ہو گیا۔ چند افراد اس کی جانب بڑھے اور اس کو چیک کرنے لگے۔ عدالت کے کمرے میں میڈیکولیگل افسر موجود تھا۔ اس نے فوراً تصدیق کر دی کہ اجمل شاہ کسی شدید صدمے کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا۔

ایسا صدمہ کون سا ہو سکتا تھا؟

ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال چکرا رہا تھا۔ جج نے باقاعدہ مجھ سے پوچھ لیا ''بیگ صاحب! جنرل منیجر صاحب کو کیا ہوا ہے؟''

''میں خود کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوں جناب عالی۔'' میں نے پرتشویش انداز میں کہا ''جو کچھ بھی ہوا ہے' سب کے سامنے ہی ہوا ہے۔''

جج نے کہا ''یہ شخص تو ملزم کا سچا خیر خواہ بنا ہوا تھا پھر اس کی بے گناہی کی خبر سن کر اس پر بے ہوشی کا دورہ کیوں پڑ گیا۔ ہم اسے خوشی کی انتہا سے بھی تعبیر نہیں کر سکتے۔ اس نے تو باقاعدہ اس بات پر زور دیا ہے کہ قتل افتخار ہی نے کیا ہے۔ یہ عجب ماجرا ہے۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں جناب عالی۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا ''اسے تو ملزم کے بے گناہ ہونے کا افسوس ہوا ہے۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ اس خوشی کے موقع پر اس نے دشمنوں والے رویے کا مظاہرہ کیوں کیا ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد اجمل شاہ کو فوری طبی امداد کیلئے قریبی ہسپتال بھیج دیا گیا۔ تاہم احتیاطاً دو سرکاری اہلکار بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔

جج کی ہدایت پر عدالتی کارروائی کو وہیں سے شروع کیا گیا جہاں پر رخنہ پڑا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس مرحلے پر سوال اٹھایا ''میرے فاضل دوست! آپ نے انکشاف کیا ہے کہ وقوعہ کی رات اپنے گھر سے غیر حاضری کے بارے میں شمسہ بھی جانتی تھی۔ موصوفہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ آپ کے دعوے کی تصدیق کس طرح ہو گی؟''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''میرے دعوے کی تصدیق کیلئے شمسہ کا ہونا ضروری نہیں ہے میرے عقل مند دوست! میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ملزم مذکورہ رات دس بجے سے چار بجے تک غلام جیلانی کے بنگلے پر تھا جہاں ان کے دوسرے دوست بھی تھے۔ میرے بیان کی تصدیق کیلئے غلام جیلانی' اس کی بیوی تابندہ' آفتاب نصیر اور مسعود ظفر کی گواہی ہی کافی ہو گی۔ میں کسی بھی وقت معزز عدالت کے احکامات پر ان افراد کو عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

میرا یہ جواب سن کر وکیل استغاثہ کے تعزیے ٹھنڈے ہو گئے اور وہ خجالت آمیز نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا' گویا وہ حاضرین عدالت سے نگاہ چرا رہا تھا۔

انکوائری افسر شمشاد علی نے باآواز بلند پوچھا ''وکیل صاحب! اگر آپ کے موکل نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا تو پھر شمسہ کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''

''واہ وا...... سبحان اللہ...... ماشاء اللہ......'' میں نے آئی او کے استفسار پر استہزائیہ انداز میں کہا ''جو کام آپ کا ہے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے مذاق کے رنگ میں کہا ''دیکھو میاں آئی او صاحب! میں ذرا دوسری قسم کا وکیل ہوں۔ تم اس شعبے میں ابھی رنگ روٹ ہو اس لئے میرے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ میں کوئی بھی کام فیس لیے بغیر نہیں کرتا۔ میں اپنے موکل کو بھری عدالت میں بے گناہ ثابت کر چکا ہوں۔ شمسہ کے قاتل کو تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ ہاں! البتہ اگر تم میری فیس دینے پر تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں چند ٹپس دے سکتا ہوں۔''

وہ کھسیانا سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے کہا ''مجھے تو اجمل شاہ میں کوئی گڑ بڑ دکھائی دیتی ہے۔''

''یہ بات آپ انکوائری افسر کو بتائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔'' میں نے مشورتاً کہا ''اجمل شاہ نے جس غیر متوقع رویے کا مظاہرہ کیا ہے اس میں گڑبڑ تو ضرور ہے۔''

جج نے مجھے ہدایت کی کہ آئندہ پیشی پر میں ان افراد کو عدالت میں پیش کروں جن کے ساتھ ملزم افتخار نے وقوعہ والی رات چھ گھنٹے گزارے تھے۔ یعنی رات دس بجے سے چار بجے تک کا وقت۔

میں نے جج کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اور اگلی پیشی پر مطلوبہ افراد کو عدالت میں حاضر کروا کر اپنے موکل کی جائے واردات سے غیر موجودگی ثابت کر دی۔ اس موقع پر ایک سوال یہ بھی اٹھا کہ ممکن ہے شمسہ نے خودکشی ہی کی ہو؟ لیکن پھر اس سوال کی تردید میں بھی بہت سے سوال اٹھ کھڑے ہوئے مثلاً یہ کہ اگر شمسہ نے خودکشی کی تھی تو اس کی وجہ کیا تھی؟ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک انتہائی خوش باش، مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہی تھی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر شمسہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لی تھی تو پھر زہر والی شیشی افتخار قریشی کی دراز میں کیسے پہنچ گئی؟ اور سب سے اہم اور غور طلب سوال تو یہ تھا کہ افتخار قریشی کی بے گناہی ثابت ہونے پر اس کا سب سے بڑا ہمدرد یعنی اجمل شاہ فرط غم سے کیوں بے ہوش ہو گیا تھا؟

یہ اور ان جیسے دیگر سوالات کے درمیان جج نے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔ اسی موقع پر یہ بھی معلوم ہوا کہ پولیس نے اجمل شاہ کو شمسہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اس سے اقبال جرم کروا لیا تھا۔ وکیل استغاثہ کے اشارے کو انکوائری افسر نے فوراً کیچ کر لیا تھا اور اسی وقت سے وہ اجمل کی ٹوہ میں لگ گیا تھا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اجمل شاہ نے بڑا بھیانک منصوبہ بنایا تھا مگر اچانک ناکامی نے اسے اعصابی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور وہ پولیس کی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکا۔ اسے زبان کھولتے ہی بنی تھی۔

چلتے چلتے، تھوڑی سی تفصیل اجمل شاہ کے خطرناک منصوبے کی بھی ہو جائے۔

واقعات کے مطابق وہ شمسہ کے قتل کے الزام میں افتخار قریشی کو پھانسی چڑھوا کر ان کے کارخانے، بنگلے اور دیگر مال و دولت پر قابض ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ یوسف پہلے ہی اس کی مٹھی میں تھا۔ وہ اجمل کو انکل کہتا تھا اور سب سے زیادہ اسی کی سنتا تھا۔ شمسہ اور افتخار کا پتا جھڑ جاتا تو سب کچھ توصیف کی ملکیت میں چلا جاتا کیونکہ وہی اکلوتا وارث تھا پھر آہستہ آہستہ اجمل، ناپختہ ذہن توصیف پر اپنے پنجے مہارت سے گاڑتا کہ توصیف بے بس ہو کر رہ جاتا۔

شمسہ کو اکثر آدھے سر کا درد رہتا تھا۔ اجمل نے اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کیلئے شمسہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ان دنوں ہومیو پیتھک طریقہ علاج نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ اجمل نے ایک روز علیحدگی میں شمسہ سے کہا کہ اس کے سر کے درد کا شافی علاج ہومیو پیتھی ہی سے ہو سکتا ہے مگر مصیبت یہ تھی کہ افتخار ہومیو علاج کا قائل نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایلوپیتھی ہی سے استفادہ کرتا تھا۔ اجمل نے شمسہ کو راز داری برتنے کا وعدہ کر کے کہا کہ وہ اسے ایک پڑیا دوا کی لا کر دے گا۔ شمسہ رات کو نیم گرم دودھ میں وہ پڑیا گھول کر پی جائے۔ انشاء اللہ زندگی بھر کیلئے آدھے سر کے درد سے نجات مل جائے گی۔ شمسہ نے کہا کہ افتخار کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اجمل نے جھٹ قسم اٹھا کر وعدہ کر لیا کیونکہ یہ بات اس کے مفاد کیلئے موزوں تھی۔ وہ تو خود بھی چاہتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور وہ اپنے مقصد میں کامران ہو جائے۔

اجمل نے نہایت راز داری کے ساتھ بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ سریع الاثر زہر کی ایک پڑیا لا کر شمسہ کے حوالے کر دی۔ اس زہر کی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے شکار کو پلک جھپکتے میں ختم کر دیتا تھا۔ اجمل نے افتخار کو پھانسنے کیلئے زہر کی بقیہ مقدار ایک شیشی میں ڈال کر افتخار کی دراز میں رکھ دی۔

اجمل اپنے منصوبے میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا کہ بالکل آخری وقت میں، میں نے کیس کا پانسا پلٹ دیا تھا۔ یہ اچانک صدمہ اجمل کی برداشت سے باہر تھا۔ ساحل پر پہنچ کر کوئی بھی ڈوبنا پسند نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسی بات ہوتی ہے جو موت سے زیادہ اذیت ناک بن جاتی ہے۔ اسی لیے ہوش و حواس کھو کر اس روز بھری عدالت میں وہ چلا اٹھا ''ناممکن...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

مگر ''یہ'' ہو چکا تھا۔ وقت اپنی چال چل گیا تھا۔ جس طرح گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لوٹایا جا سکتا، بالکل اسی طرح اجمل بھی اپنی ناکامی کو کامیابی میں نہیں بدل سکتا تھا اس لئے بیہوش ہو گیا تھا۔

میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ آخر وقت تک میں بھی اجمل شاہ کی اصلیت سے بے خبر رہا تھا مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اجمل کی قلعی کھلنے کا بھی ایک وقت تھا، اس سے پہلے وہ کس طرح بے نقاب ہو سکتا تھا۔ اسی کو وقت کی ستم ظریفی کہتے ہیں۔

وقت نے تصویر کو الٹ کر اس کا دوسرا رخ نمایاں کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

ناہنجار

اخلاقیات کے قاتل اور معاشرتی اقدار کو پامال کرنے والے افراد کا شمار سماج دشمن عناصر میں ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے ان ناسوروں کی حقیقت آوارہ کتوں کی سی ہوتی ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا موجود ہے تو یہ آپ کے قریب پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کریں گے۔ بصورت دیگر یہ سگ آوارہ بھونکنے اور کاٹنے کا کوئی موقع گنوانا پسند نہیں کرتے۔ اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے ایسے عفریتوں کی حوصلہ شکنی ضروری ہے ورنہ یہ آپ کو آسان شکار سمجھ کر ہمیشہ کے لیے آپ کی جان کا عذاب بن جائیں گے۔ یاد رکھیں...... برائی کو یا تو پہلے ہی قدم پر روکا جاسکتا ہے یا پھر کبھی نہیں روکا جاسکتا۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔ کراچی میں رہنے والے یہاں کے موسم سرما اور اس کے ''جوبن'' سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس زیر سماعت نہیں تھا' یعنی کسی مقدمے کی پیشی نہیں تھی' چنانچہ آج کا پورا دن مجھے اپنے دفتر ہی میں گزارنا تھا۔ میں گھر سے نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو' بیگ صاحب!'' ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے شائستہ لہجے میں سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''کہیے غوری صاحب! آج صبح ہی صبح کیسے یاد فرمایا؟''

''جناب' نو سے زیادہ کا وقت ہو چکا ہے اور آپ اسے صبح ہی صبح کہہ رہے ہیں۔'' شمشاد غوری نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو خدشہ تھا کہ آپ کہیں گھر سے نکل ہی نہ گئے ہوں۔''

شمشاد غوری میرے ایک دیرینہ شناسا ہیں۔ وہ ایک سماجی وفلاحی تنظیم کے کرتا دھرتا ہیں۔ مفلس' نادار اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا ان کے ادارے کا بنیادی مقصد ہے۔ شاید میں پہلے بھی

کبھی ان کا ذکر کر چکا ہوں۔

میں نے کہا۔ ''غوری صاحب! اگر آپ دس منٹ بعد مجھے فون کرتے تو آپ کا خدشہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہوتا۔ میں بس گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''کیا کسی خاص کام سے آپ نے مجھے فون کیا ہے؟''

''میں آپ کی مصروفیات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔'' غوری صاحب نے کہا۔ ''امید ہے' انکار نہیں کریں گے۔''

میں ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا مگر ازاں بعد میرا اندازہ غلط نکلا۔ میں نے سرِدست پوچھا...... ''کیا کوئی چیریٹی کیس ہے؟''

غوری صاحب کا جواب خلاف توقع تھا۔ ''بالکل نہیں بیگ صاحب۔ یہ کوئی چیریٹی کیس ہے اور نہ ہی میں آپ سے کسی قسم کی رعایت کے لیے کہوں گا۔ بس کام تسلی بخش ہونا چاہیے۔ میرے ایک دوست ہیں اجمل برہان۔ ان کا جنرل منیجر کسی قانونی پیچیدگی میں الجھ گیا ہے۔ برہان صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی قابل وکیل کا پتا بتاؤں۔ میرے ذہن میں فوراً آپ کا نام آ گیا اسی لیے زحمت دے رہا ہوں۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ پارٹی صاحب حیثیت ہے۔''

غوری صاحب کے توسط سے عموماً ایسے کیس میرے پاس آتے تھے جن میں مجھے خصوصیت رعایت کرنا پڑتی تھی۔ بس ٹوکن فیس ہی میرے حصے میں آتی تھی' اسی لیے میں نے شروع میں ان کی بات سنتے ہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ بھی کوئی اسی قسم کا کیس ہوگا۔

میں نے سوال کیا۔ ''غوری صاحب! معاملے کی نوعیت کیا ہے؟''

''یہ تو آپ خود جاوید احمد سے پوچھ لیں۔'' غوری صاحب نے کہا۔ ''میں اسے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ آج کون سی کورٹ میں ملیں گے؟''

''میں ابھی سیدھا اپنے دفتر جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ جاوید کو میرے دفتر کا پتا سمجھا دیں۔ بائی دا وے یہ جاوید احمد وہی جنرل منیجر صاحب ہیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے؟''

''بالکل وہی ہیں۔'' غوری صاحب نے کہا۔ ''باقی مسائل آپ ان کی زبانی ہی سنیں۔ میں انہیں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔''

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب میری سیکرٹری شیریں نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی کہ کوئی جاوید احمد مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ میں گزشتہ ایک گھنٹے سے اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اتفاق سے اس وقت میں فارغ ہی تھا اس لیے میں نے جاوید کو فوراً اپنے چیمبر میں بلالیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک پریشان شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ اس نے نیوی بلیو سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ چہرے مہرے اور قد کاٹھ سے اچھا خاصا دکھائی دیتا تھا لیکن کسی گہری اندرونی

الجھن کے باعث اس وقت اس کے چہرے پر پژمردگی کے آثار واضح نظر آ رہے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر لگ بھگ سینتیس سال رہی ہوگی۔

میں نے اس سے مصافحہ کرنے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے آسودہ حال دکھائی دیتا تھا' تاہم اس کی حرکات و سکنات سے پریشانی مترشح تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اضطراری انداز میں دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! غوری صاحب نے آپ کو فون کیا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر پوچھا۔ ''آپ کس قسم کی الجھن کا شکار ہیں اور آپ مجھ سے کیا مدد چاہتے ہیں۔ غوری صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کسی قانونی پیچیدگی میں پھنس گئے ہیں۔ اس پیچیدگی کی تفصیل کیا ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''مسائل تو کئی ایک ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔''

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''سب سے پہلے وہ مسئلہ بیان کریں جس نے آپ کو اندرونی طور پر اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔''

جاوید احمد نے...... امید بھری نظر سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''فی الحال تو فوری طور پر آپ میرے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کا انتظار کریں۔ باقی مسائل کو بعد میں دیکھیں گے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوال کیا۔ ''آپ کو ضمانت قبل از گرفتاری کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

''مجھے خدشہ ہے کہ پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا ہے جو پولیس آپ کو گرفتار کر لے گی؟''

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''پھر خواہ مخواہ کے اندیشے میں کیوں گھل رہے ہیں؟''

''یہ اندیشہ نہیں ہے وکیل صاحب۔'' وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے میری حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہ کیا تو پولیس ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ فون پر مجھے بڑی سنگین دھمکی دی گئی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ معاملہ یوں ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''فون پر آپ کو کس نے اور کیوں دھمکی دی ہے۔ ذرا تفصیل سے بتائیں۔''

جاوید احمد نے بتایا۔ ''میں دھمکی دینے والے کو تو نہیں جانتا مگر اس کا انداز بڑا خطرناک تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل ضرور کرے گا' اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ فوراً سے پیشتر

میری ضمانت قبل از گرفتاری کروا دیں۔ میں آپ کو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں۔''

''دیکھیں' مسٹر جاوید احمد۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بیان نے مجھے الجھا دیا ہے۔ جب تک آپ اپنے معاملات کی وضاحت نہیں کریں گے' میں آپ کی کوئی قانونی مدد نہیں کر سکوں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔''

چند لمحے خاموش رہ کر وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر رک رک کر بتانے لگا۔ ''وکیل صاحب! دراصل بات یہ ہے کہ گزشتہ دنوں میں ایک کیس میں ملوث ہو گیا تھا۔ میری ایک عزیزہ کو قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ ملزمہ کا دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھے جب اس پر ٹوٹنے والی بپتا کے بارے میں معلوم ہوا تو میں فوراً اس کی مدد کو پہنچا۔ میں نے اپنے پاس سے رقم خرچ کر کے اس کی بریت کے لیے ایک وکیل کا انتظام کیا مگر بدقسمتی سے وہ وکیل میری عزیزہ کی ضمانت نہ کروا سکا اور اسے جیل کسٹڈی ہو گئی۔ ابھی تک اس کیس کی ڈھنگ سے سماعت بھی شروع نہیں ہوئی......''

''آپ کسی ٹیلی فونک دھمکی کا ذکر کر رہے تھے؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں' میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں دھمکی دینے والے شخص کو نہیں جانتا۔ نہ ہی اس کی آواز کو پہچانتا ہوں' البتہ اس شخص نے واضح الفاظ میں مجھے تنبیہہ کی ہے کہ اگر میں اس کیس کی پیروی سے باز نہ آیا تو مجھے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا...... اور سب سے پہلے میری گرفتاری عمل میں آئے گی۔''

''ہوں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کے حوالے سے آپ کی گرفتاری کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ جاوید صاحب۔ اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! میں نے اپنی جس عزیزہ کا تذکرہ کیا ہے' اس پر اپنے شوہر نادر جان کے قتل کا الزام ہے اور پس پردہ یہ کہانی بھی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی تھی حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ دھمکی دینے والے کا کہنا یہ ہے کہ اگر میں اپنی عزیزہ کی مدد سے باز نہ آیا تو وہ مجھے اس عزیزہ کے آشنا کی حیثیت سے اس کیس میں ملوث کر دے گا۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ پولیس کو میرے پیچھے لگانے کے لیے اس کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔''

اس کے حالات نے مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ دھمکی دینے والے کے دعوے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''وہ سراسر جھوٹا ہے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''پھر آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''اگر پولیس نے واقعی اس سلسلے میں مجھے گرفتار کر لیا یا کسی اور طریقے سے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کی تو میرا مقصد فوت ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کیا ہے کہ ہر صورت میں اپنی اس عزیزہ کو جیل کی سلاخوں سے باہر لاؤں...... اور پھر میری گرفتاری کی صورت میں میری اپنی فیملی بھی متاثر ہوگی۔ میں ان پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دینا

چاہتا۔''

میں نے کہا۔ ''جاوید صاحب! اگر آپ واقعی بے قصور ہیں اور اس معاملے میں آپ کے ہاتھ صاف ہیں تو اس پراسرار دھمکی کے بارے میں آپ کو پولیس کو بتا دینا چاہیے تھا۔ اگر آپ نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ہمارے یہاں کی پولیس کے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں وکیل صاحب۔ میری وہ عزیزہ بھی تو بے گناہ ہے۔ اس نے کون سا جرم کیا ہے جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دی گئی ہے؟''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''جاوید صاحب! آپ ضمانت قبل از گرفتاری کے حصول کی خاطر اپنے وکیل کے پاس کیوں نہیں گئے۔ میرا مطلب ہے' اس وکیل کے پاس جو آپ کی عزیزہ کا کیس ڈیل کر رہا ہے؟''

''میں اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے وہ صرف پیسا بنانے کی مشین ہے۔ غوری صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے اور خود میں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کیس بھی میں آپ کے ہی حوالے کر دوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان وکیل صاحب کا نام کیا ہے؟''

''کامران رضوی۔'' جاوید احمد نے جواب دیا۔

میں کامران رضوی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جاوید احمد واقعی غلط جگہ پر پھنس گیا تھا۔ مذکورہ وکیل صاحب کسی اچھی شہرت کے مالک نہیں تھے' تاہم میں نے اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے جاوید سے کہا۔

''جاوید صاحب! میں جب تک خود مطمئن نہ ہو جاؤں' اس وقت تک کسی کیس کو ڈیل کرنے کی حامی نہیں بھرتا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''اور آپ کے مطمئن ہونے کا طریقہ کار کیا ہے؟''

''طریقہ کار کچھ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس جب مجھے یقین ہو جائے کہ مجھ سے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا جا رہا۔ تمام حقائق اور واقعات مجھے من و عن بتائے جا رہے ہیں' کہیں کوئی گھپلا اور دروغ گوئی نہیں ہے تو پھر میں کیس لینے کا فیصلہ کر لیتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں کل ہی اس کیس کی فائل آپ کے حوالے کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کر اور مجھ سے مزید تفصیل جان کر میری عزیزہ کی بے گناہی کا یقین کر لیں گے۔ اسے کسی سوچی سمجھی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس سے پہلے آپ میری ضمانت قبل از گرفتاری کا کوئی بندوبست کریں۔''

''میرے خیال میں آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں

کہا۔ ''اگر آپ بے قصور ہیں تو آپ کو خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

جاوید احمد نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا میری ضمانت قبل از گرفتاری میں کوئی رکاوٹ آڑے آ رہی ہے؟ کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟''

میں نے اس کے سوالات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''صبح غوری صاحب نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ آپ ان کے دوست اجمل برہان کے جنرل منیجر ہیں۔ کیا برہان صاحب کوئی بزنس مین ہیں؟''

''جی ہاں! برہان صاحب ''برہان ٹریڈرز'' کے مالک ہیں۔'' وہ میرے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا۔ ''ملک اور بیرون ملک تک بزنس کرتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''برہان ٹریڈرز کیا ڈیل کرتا ہے؟''

''بنیادی طور پر ہم ٹیکسٹائل پروڈکٹس کی ایکسپورٹ کا کام کرتے ہیں مثلاً گارمنٹس' تولیے' بیڈ شیٹس' جائے نماز' نیپکن اور ہوزری وغیرہ کا سامان۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم انڈینٹنگ بھی کرتے ہیں "Indenting" یعنی دوسری کمپنیز کی مصنوعات کو اپنے نظام کے تحت مناسب کمیشن پر ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ ازیں علاوہ ہم باقاعدہ حکومت کے لائسنس یافتہ سپلائر بھی ہیں۔'' جنرل منیجر جاوید احمد نے تفصیلاً بتایا پھر پرامید نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو اس ادارے میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''تقریباً چار سال۔'' اس نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان مزید تھوڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر اپنی تسلی کرنے کے بعد میں نے اپنی سیکرٹری شیریں سے جاوید کی درخواست ضمانت ٹائپ کروائی اور اسے اپنے ساتھ لے کر مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچ گیا۔ ضروری قانونی کارروائی کے بعد ہم واپس دفتر میں آ گئے۔

جاوید احمد نے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! تو کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟''

''کس بارے میں؟''

''میری عزیزہ کے کیس کے بارے میں۔''

''پہلے اس کے بارے میں تفصیلات تو بتائیں پھر ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور ابھی تک آپ نے اپنی عزیزہ کا تعارف نہیں کروایا۔ میرا مطلب ہے' آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

وہ قدرے محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مجھ سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ اتنا گہرا...... اتنا مضبوط کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔''

''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! یوں سمجھ لیں کہ معاشرتی رشتوں کے حساب سے تو وہ میری کچھ

نہیں لگتی لیکن...... میں اسے اپنا بہت کچھ سمجھتا ہوں۔''

''کوئی دل کا معاملہ ہے؟'' میں نے کریدا۔

''آپ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ آپ کی وہ عزیزہ...... کیا نام ہے اس کا؟'' میں نے توقف کر کے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ جواب دینے میں اس نے تاخیر نہیں کی۔

''فہمیدہ۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق فہمیدہ پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام ہے مگر آپ کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ آپ کے اس یقین کی وجہ کیا ہے؟''

''بس، میرا دل کہتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

''جاوید صاحب!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''عدالت دل کی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ ہر بات کے لیے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ وہاں تو حقائق کو بھی ثابت کرنے کے لیے مضبوط دلائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں تو تمام واقعات تفصیل سے مجھے بتائیں۔''

''تمام حالات و واقعات کیس کے فائل میں درج ہیں۔''

''فائل کو تو میں بعد میں پڑھوں گا، پہلے آپ کی زبان سے سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں، اس سلسلے میں، میں ملزمہ فہمیدہ سے بھی ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہوں گا۔''

''ضرور۔ ضرور۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''آپ جب کہیں گے میں آپ کو اپنے ساتھ فہمیدہ سے ملوانے جیل لے چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے، فہمیدہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اس کیس کے بارے میں جن حقائق سے آگاہ ہیں، پہلے ان کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتائیں۔''

وہ خاموش ہو کر چند لمحات تک اپنے خیالات کو مجتمع کرتا رہا پھر تمام حالات میرے سامنے رکھ دیئے۔ آئندہ روز میں جاوید احمد کے ہمراہ فہمیدہ سے ملنے متعلقہ جیل گیا۔ ایک گھنٹے کی ملاقات میں، فہمیدہ نے میرے سوالات کے جواب میں جو حالات و واقعات مجھے بتائے، ان کی روشنی میں میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔

آئندہ پیشی سے پہلے جاوید احمد نے کامران رضوی نامی وکیل کو فارغ کر دیا اور اس کیس کا فائل میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس فائل کا سرسری معائنہ کرنے کے بعد جاوید کو اپنی فیس کے بارے میں بتایا جو اس نے فوراً ادا کر دی۔

مقدمے کی تاریخ میں ابھی بیس دن باقی تھے۔ اس دوران میں، میں بہ آسانی کیس کی اسٹڈی کر سکتا تھا۔ میں نے جاوید احمد سے کہا۔ ''آپ ایک ہفتے کے بعد آ کر مجھ سے ملیں۔ میں چند ضروری ذمے داریاں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں فہمیدہ کی باعزت رہائی کے لیے ہر کوشش، ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

قارئین! جاوید احمد اور فہمیدہ کی بیان کردہ تفصیلات اور مقدمے کی فائل کے مطالعے کے بعد جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

اس کہانی کا آغاز دس بارہ سال پہلے ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جاوید اور فہمیدہ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ جاوید اپنی بیوہ ماں حدیثۃ النساء اور چھوٹی بہن ثمن کے ساتھ امن و سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ گریجوایشن کے بعد وہ ایک پرائیویٹ فرم میں سپروائزر ہو گیا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں بھی وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا رہا تھا، کیونکہ وہی گھر کا واحد کفیل تھا۔ اس کی مدد کے لیے حدیثۃ النساء محلے والوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ شکر کی بات یہ تھی کہ مکان ان کا اپنا تھا۔ جاوید کے والد نے عقل مندی کا یہی ایک کام کیا تھا ورنہ کرائے کے مکان کا عذاب وہی لوگ جانتے ہیں جن کے ذاتی مکان نہیں ہوتے۔

جاوید کے پڑوس میں ایک مکان دو ماہ سے خالی پڑا تھا۔ مکان کا مالک بیرون ملک چلا گیا تھا اور چند سال تک اس کا واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ جاوید کے ذمے یہ کام لگا گیا کہ جب تک وہ واپس نہیں آتا، جاوید اس مکان کو کرائے پر اٹھا دے۔ اس سلسلے میں وہ جاوید کو تمام قانونی اختیار بھی دے گیا تھا۔

چند روز بعد ایک صاحب کرائے پر مذکورہ مکان لینے کے لیے جاوید سے ملے۔ ان کا نام رفیق الدین تھا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ تھے۔ فیملی نہایت محدود تھی۔ یعنی رفیق الدین اور ان کی اکلوتی صاحبزادی فہمیدہ۔ فہمیدہ کی والدہ کا عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ان دنوں فہمیدہ انٹرنس پارٹ ون کی تیاری کر رہی تھی۔ جاوید نے پہلی ملاقات ہی میں رفیق الدین کو وہ مکان کرائے پر دینے کا فیصلہ کر لیا جس کی سب سے بڑی وجہ فہمیدہ تھی جو اپنے والد کے ساتھ ہی مکان دیکھنے آئی تھی۔ جاوید، فہمیدہ کو ایک نظر دیکھ کر ہی دل ہار بیٹھا تھا۔

جس روز رفیق الدین اپنی بیٹی کے ساتھ جاوید کے پڑوس میں آ کر آباد ہوا، وہ چھٹی کا دن تھا۔ وہ سارا دن تو سامان کی شفٹنگ میں گزر گیا۔ جاوید رفیق الدین سے تفصیلی بات نہ کر سکا ورنہ اس کا دل تو بہت چاہ رہا تھا، وہ ان کے گھر جائے، رفیق الدین سے ملاقات کے بہانے فہمیدہ کو دیکھے اور

اگر موقع مل جائے تو اس سے بات بھی کرے۔

اگلے روز صبح ہی سے بارش شروع ہوگئی۔ جاوید نے آفس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جاوید نے سوچا' اس موسلا دھار بارش میں تو اس کا پڑوسی بھی گھر پر ہوگا۔ آج تو اسے ملاقات کا موقع مل ہی جائے گا۔ وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

دوسرے کمرے سے جاوید کی والدہ کی آواز آئی۔ ''جاوید بیٹے' دیکھو تو ذرا۔ دروازے پر کون ہے۔''

''جی امی۔ ابھی دیکھتا ہوں۔'' جاوید دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

بارش خاصی تیز تھی۔ وہ صحن کو عبور کر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے تقریباً بھیگ چکا تھا۔ دل میں وہ جھنجلا بھی رہا تھا کہ اس چھم چھم برستی بارش میں کون آ سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے جانا اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس موسم میں نہ تو اس کی امی دروازے تک جا سکتی تھیں اور نہ ہی ثمن۔

تیسری گھنٹی پر جاوید نے اپنے گھر کا بیرونی دروازہ کھول دیا اور دروازہ کھلتے ہی اس کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ اس کے لیے تو جیسے جنت کا دروازہ کھل گیا تھا۔ خوش بو میں بسی ہوئی کسی کلی کے مانند فہمیدہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ گلابی سوٹ میں وہ کسی تر و تازہ گلاب ہی کی طرح نکھری ہوئی تھی۔

''سوری' آپ کو ڈسٹرب کرنے کے لیے معافی چاہتی ہوں۔'' فہمیدہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''وہ دراصل مجھے ماچس چاہیے۔ ہمارا بیشتر سامان ابھی بندھا ہوا ہے۔ رات جو ماچس ہم نے استعمال کی وہ کہیں ادھر ادھر ہوگئی ہے۔ پلیز آپ اپنے گھر سے ذرا ماچس لا دیں۔''

جاوید کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے کوئی کوئل کوک رہی ہو۔ فہمیدہ کی آواز نے اس پر بے خودی سی طاری کر دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ زمین پر ہے یا آسمان پر۔ پھر فہمیدہ کی قدرے سنجیدہ آواز نے اسے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''پلیز! ذرا جلدی کر دیں۔ بارش بہت تیز ہو رہی ہے۔''

''آ...... آ...... آپ اندر آ جائیں۔'' وہ ہکلایا۔

وہ مسکرائی۔ ''نہیں۔ بس آپ ماچس لا دیجیے۔''

جاوید بے اختیار اندر کی جانب لپکا پھر ایک فوری خیال کے تحت صحن کے درمیان ہی سے واپس لوٹ آیا اور اپنی پتلون کی جیب میں سے سگریٹ لائٹر نکال کر فہمیدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ لیجیے۔''

فہمیدہ نے شکریہ کہہ کر لائٹر لینے کے لیے اپنا حنائی ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کی مخروطی انگلیاں جاوید کی انگلیوں سے مس ہوگئیں۔ جاوید کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک شعلہ سا لپک گیا ہو۔ اسے اپنے پورے وجود میں ایک کیف آور لہر سی محسوس ہوئی۔ جب تک وہ اس کیفیت سے

باہر آتا' دور آسمان پر بجلی چمکی' بادل کڑکے اور فہمیدہ اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ وہ اپنے گھر کے اندر غائب ہو چکی تھی۔ جاوید بند دروازے کو تکتا رہ گیا۔

اس محویت کو ثمن کی چہکار نے توڑا۔ ''بھائی جان! کیا دیکھ لیا ہے جو دروازے پر ہی جم کر رہ گئے ہیں۔ اب واپس بھی آ جائیے۔''

جاوید کو ہوش آ گیا۔ وہ مدہوش قدموں سے چلتے ہوئے اندر کی جانب بڑھنے لگا۔ اس وقت تک وہ بارش میں پوری طرح شرابور ہو چکا تھا۔ وہ اندر پہنچا تو حدیث النساء نے استفسار کیا۔

''باہر کون تھا بیٹا؟''

جاوید نے سحر زدہ سی نظر سے ماں کو دیکھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ثمن بول اٹھی۔ ''لگتا ہے امی! بھائی جان نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔ دیکھ نہیں رہیں' ان کی حالت کیا ہو رہی ہے۔''

''تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے ثمن۔'' حدیث النساء نے ثمن کو آنکھیں دکھائیں' پھر جاوید سے پوچھا۔ ''تم نے بتایا نہیں بیٹا' گھنٹی کس نے بجائی تھی؟''

جاوید نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں جواب دیا۔ ''فہمیدہ تھی۔''

''کون فہمیدہ؟'' حدیث النساء کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہ ہماری نئی پڑوسن۔'' جاوید قدرے سنبھل چکا تھا۔ ''رفیق الدین کی بیٹی۔ ماچس مانگنے آئی تھی۔''

''اچھا' اچھا۔ تم اس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو جو ہمارے پڑوس میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔'' حدیث النساء نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''جی امی جان۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''تو کیا وہ ماچس لیے بغیر ہی چلی گئی بھائی جان'' ثمن نے اچانک سوال کر دیا۔ ''آپ ماچس لینے کچن میں آئے ہی نہیں۔ میں کچن میں ہی تو تھی۔''

جاوید نے کہا۔ ''میں نے اسے اپنا سگریٹ لائٹر دے دیا ہے۔''

''اوہ!'' ثمن نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ تو ان لوگوں پر خاصے مہربان نظر آ رہے ہیں۔ کوئی تحقیق و تفتیش کیے بنا ہی انہیں مکان کرائے پر دے دیا اور اب......'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''خیریت تو ہے نا بھائی جان؟''

جاوید نے کہا۔ ''سب خیریت ہے پگلی۔'' پھر نظر چراتے ہوئے بولا۔ ''حق ہم سائیگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر کو وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا اور ضرورت کے وقت ان کے کام آنا ہمارا فرض بنتا ہے۔''

''ہاں' یہ بات تو ہے۔'' ثمن معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اس فرض کی ادائی میں کہیں خود کام نہ آ جائیے گا بھائی جان۔''

حدیث النساء نے ڈانٹ آمیز انداز میں ثمن سے کہا۔ ”اے لڑکی! کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ خدا کا شکر کرو' ہمارا پڑوس تو آباد ہوا۔ اللہ کرے' یہ اچھے لوگ ہوں۔“

”انشاء اللہ اچھے ہی ہوں گے۔“ ثمن جاوید کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”کیوں بھائی جان؟“

جاوید ثمن کی شرارت آمیز گفتگو کو سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے چور جذبات سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ جان چھڑانے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ فہمیدہ اس کے ذہن میں پیوست ہو کر ساتھ ہی چلی آئی۔

جاوید نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ فہمیدہ آنکھوں میں بند ہو گئی پھر جاوید کے پردۂ تصور پر اس کا سراپا چمکنے لگا۔ بھری برسات میں چند جملوں پر مشتمل اس گفتگو نے جاوید کے دل کی دنیا تلپٹ کر دی تھی۔ آنے والے دنوں میں یہ ملاقات نقش دوام بن گئی...... ایک ایسا نقش جو مٹائے نہ مٹے اور نہ بنائے نہ بنے۔

جلد ہی دونوں گھروں کے درمیان تعلقات استوار ہو گئے۔ چند ہی روز میں ثمن' فہمیدہ کی گہری دوست بن چکی تھی۔ ثمن اور فہمیدہ کی عمروں میں اگرچہ خاصا فرق تھا' تاہم ہم مزاج ہونے کے باعث ان میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ثمن' بھائی کی فہمیدہ میں دلچسپی کو تو پہلے ہی دن سمجھ گئی تھی' البتہ یہ بات اسے کچھ دن بات معلوم ہوئی کہ فہمیدہ بھی جاوید کی خاطر ہی ان کے یہاں آئی تھی۔

نظروں کی پسندیدگی کو اظہار کی زبان ملی تو وہ ایک روز تنہائی میں اقرار محبت کر بیٹھے۔ گویا دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ پھر وہ چپکے چپکے ملنے لگے۔ اس سلسلے میں ثمن ان دونوں کی ہمراز تھی۔ ثمن ہی کے ذریعے جاوید نے اپنی ماں تک یہ بات پہنچائی۔ حدیث النساء نے دل و جان سے بیٹے کی پسند کو سراہا۔ ماں کی طرف سے ہاں ہوتے ہی وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ایک روز اس نے فہمیدہ سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں۔“

وہ انجان بن گئی۔ ”تمہاری امی تو ہمارے گھر آتی جاتی رہتی ہیں۔ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی جاوید!“

”تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو فہمیدہ۔“ جاوید جذباتی ہو گیا۔ ”اب میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا ہوں۔ اگر میں تمہارے رشتے کے لیے اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں تو تمہارے ابو کا ردعمل کیا ہو گا؟“

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ تو تمہاری امی کے' ہمارے گھر آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“

”جس طرح میری امی اور ثمن تمہیں چاہتی ہیں۔“ جاوید نے کہا۔ ”کیا تمہارے ابو بھی مجھے قبول کر لیں گے؟“

فہمیدہ بولی۔ ”ابو ویسے تو تمہاری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن اس حوالے سے کبھی انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے فہمیدہ!“ جاوید نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا یہ رشتہ منظور ہو جائے گا؟“

”میری دعا تو یہی ہے کہ ابو ہاں کر دیں۔“ فہمیدہ نے کہا۔

”تو میں اپنی امی کو بھیج دوں؟“

”اللہ کا نام لے کر بھیج دو۔“ فہمیدہ نے کہا۔ ”جو ہونا ہو گا' سامنے آ جائے گا۔“

جاوید نے کہا۔ ”اگر تمہارے ابو نے مجھے مسترد کر دیا تو؟“

”بظاہر ایسی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“

”اگر ایسا ہوا تو؟“

”بعد کی بعد میں دیکھیں گے جاوید۔“

”اگر تمہارے ابو نے انکار کر دیا تو میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گا۔“

فہمیدہ بھی جذباتی ہو گئی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو جاوید' میں تم سے دور رہ کر زندہ رہ سکوں گی۔ نہیں' ہرگز نہیں۔“

”اگر حالات ہمارے مخالف ہو گئے تو وعدہ کرو' تم میرا ساتھ دو گی۔“

”میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دوں گی جاوید۔“

”بس' پھر مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔“ جاوید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں کل ہی امی کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔“

آئندہ روز حدیث النساء رفیق الدین سے ملی اور اپنا مدعا بیان کیا۔ پوری بات سننے کے بعد رفیق الدین کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”بہن! مجھے سوچنے کے لیے کچھ مہلت دو۔“

”سوچنا کیا ہے بھائی صاحب۔“ حدیث النساء نے کہا۔ ”جاوید آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ اب آپ کو ہمارے پڑوس میں رہتے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔“

رفیق الدین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے بہن۔ جاوید ماشاء اللہ بہت ہونہار اور سمجھدار لڑکا ہے۔ میں نے کبھی اسے ایسی ویسی کسی بات میں نہیں دیکھا لیکن پھر بھی مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ میں ایک ماہ بعد آپ کو جواب دوں گا۔“

”چلیں ٹھیک ہے' میں ایک ماہ تک بے چینی سے آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔“

حدیث النساء نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بھائی صاحب! فیصلہ میرے بیٹے کے حق میں ہونا چاہیے۔“

"جو اللہ کو منظور ہو بہن۔"

حدیث النساء اٹھتے ہوئے بولی۔ "کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت فہمیدہ کو نظرانداز نہ کیجئے گا۔ اس کی مرضی معلوم کرنا بھی بہت ضروری ہے۔"

حدیث النساء نے یہ بات دانستہ کہی تھی۔ اگر رفیق الدین فہمیدہ سے اس سلسلے میں بات کرتا تو حدیث النساء کو یقین تھا' وہ جاوید کے حق میں فیصلہ دیتی۔

رفیق الدین نے پرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ میں فہمیدہ کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ بھلا کیسے کرسکتا ہوں بہن۔"

حدیث النساء مطمئن ہوکر اپنے گھر چلی آئی۔

جاوید ایک ایک دن گن گن کر گزارنے لگا۔ یہ دن اسے اس لیے بھی قیامت لگ رہے تھے کہ فہمیدہ نے اس کے گھر میں اپنی آمد و شد موقوف کردی تھی۔ جاوید جانتا تھا کہ یہ پابندی رفیق الدین نے لگائی ہوگی۔ وہ روزانہ جس صورت کے دیدار کا عادی ہو چکا تھا' اسے دیکھے بغیر اب اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا' گھر سے باہر کہیں ملنے کی کوئی ترکیب لڑائی جائے مگر پھر اس نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اس طرح کسی بے احتیاطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا۔ وہ صبر کرکے بیٹھ گیا اور مہینہ پورا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک ماہ گزر گیا مگر رفیق الدین نے "ہاں یا نہ" میں کوئی جواب نہ دیا پھر ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ فہمیدہ سے اس کی ملاقاتوں کا باب بند ہو چکا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رفیق الدین نے فہمیدہ سے اس سلسلے میں کیا بات کی تھی۔ جب دو ماہ بیت گئے تو جاوید کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

اس نے حدیث النساء سے کہا۔ "امی! رفیق الدین انکل نے ایک ماہ کا وقت لیا تھا' لیکن اب تو دو ماہ گزر گئے۔ آپ کو ان سے پوچھنا تو چاہیے۔"

حدیث النساء نے کہا۔ "میری بیچ میں ایک بار ان سے بات ہوئی تھی۔"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا' وہ ابھی سوچ رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹا' میں نے جان بوجھ کر تم سے ذکر نہیں کیا۔" حدیث النساء نے کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ خواہ مخواہ تمہاری دل آزاری ہوگی۔ رفیق الدین کا رویہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔"

جاوید کو غصہ آ گیا۔ جذباتی لہجے میں بولا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ انہوں نے ایک ماہ کا وقت لیا تھا۔ اب تو دو ماہ گزر گئے۔ شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آپ ان سے جا کر فائنل بات کریں۔"

"ٹھیک ہے' میں جاتی ہوں۔" حدیث النساء نے کہا۔ "اور ان سے کوئی حتمی جواب لے کر آتی ہوں۔"

ایک گھنٹے بعد حدیث النساء رفیق الدین کے گھر سے واپس آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

جاوید کو اس کے چہرے کے تاثرات سے رفیق الدین کے جواب کا اندازہ ہوگیا پھر بھی تصدیق کے لیے اس نے پوچھا۔

"ہاں! امی! کیا جواب دیا انہوں نے؟"

"عجیب آدمی ہے یہ رفیق الدین بھی؟"

"آخر ہوا کیا؟" ثمن نے پوچھا۔

"انکار کردیا بیٹی۔" حدیث النساء نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بتایا۔

جاوید نے مردہ لہجے میں استفسار کیا۔ "انکار کی کوئی وجہ بھی تو بتائی ہوگی امی۔"

"ہاں بتائی ہے وجہ۔"

"کیا؟" ثمن اور جاوید نے بیک زبان پوچھا۔

حدیث النساء نے جواب دیا۔ "رفیق الدین کا کہنا ہے کہ اس نے فہمیدہ کی بات کہیں پکی کردی ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" جاوید بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

ثمن نے کہا۔ "اگر ایسی بات تھی تو انہوں نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا!"

"میں نے یہ سوال بھی کیا تھا۔" حدیث النساء نے کہا۔ "رفیق الدین کا کہنا ہے کہ بس اچانک ہی انہوں فہمیدہ کے لیے کراچی کے ایک بزنس مین کا رشتہ منظور کرلیا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "اور اس ماہ وہ مکان بھی خالی کر رہے ہیں۔ شادی کراچی میں ہی ہوگی۔"

"تو یہ بات ہے۔" جاوید معنی خیز لہجے میں بولا۔ "رفیق الدین کی لالچی فطرت کھل کر سامنے آ ہی گئی۔ کسی بزنس مین کی دولت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ہماری محبت اسے بھلا کیسے نظر آسکتی ہے؟"

حدیث النساء نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بیٹا! فہمیدہ' رفیق الدین کی بیٹی ہے۔ ہمارا کوئی ان پر زور تو نہیں ہے۔ وہ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ تمہیں ٹھنڈے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے۔" وہ ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ بھی تو کوئی شرافت نہیں ہے کہ ہمیں دو ماہ تک لٹکائے رکھا۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو ہمیں صاف صاف بتا دیا ہوتا۔"

حدیث النساء نے کہا۔ "میں نے شکوہ کیا تھا۔"

"پھر وہ کیا بولے؟"

"بولنا کیا تھا' بس شرمندہ ہوکر رہ گئے۔"

"امی! یہ اچانک سب کچھ کیسے ہوگیا؟" جاوید کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ثمن بولی۔ "فہمیدہ باجی نے تو کبھی کراچی میں رہنے والے اپنے کسی رشتے دار کا ذکر نہیں

کیا تھا۔"

"بیٹا! یہ سب دولت کا کرشمہ ہے۔" حدیث النساء نے کہا۔ "نادر جان نامی وہ بزنس مین ان کا رشتے دار نہیں ہے۔ بس ایک تقریب میں اس نے فہمیدہ کو دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اب رفیق الدین کا پلڑا اگر نادر جان کی طرف جھک رہا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

جاوید نے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ "کرنے کو تو میں بہت کچھ......"

"نہیں بیٹے۔" حدیث النساء نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "تم ایسی ویسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں۔ میں خود تمہاری شادی کرواؤں گی۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔"

جاوید نے ناراضی سے کہا۔ "لڑکیوں کی کمی یقیناً نہیں ہوگی لیکن ان میں سے کوئی فہمیدہ تو نہیں ہوگی نا؟"

"بس میں نے کہہ دیا نا۔ تم فہمیدہ کو بھولنے کی کوشش کرو۔"

"یہ کوشش اتنی سہل نہیں ہے امی جان۔"

"مرد بنو جاوید مرد۔" حدیث النساء نے کہا۔ "ایک مشکل پسند مرد۔ اس دنیا میں زندہ رہنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں نے عورت ہوتے ہوئے بھی کتنی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کیا ہے۔ بیوگی کا عذاب کیا ہوتا ہے' یہ کوئی بیوہ ہی جان سکتی ہے۔ میں نے بڑے کٹھن حالات سے گزر کر تم دونوں کو پالا پوسا ہے۔"

"میں جانتا ہوں امی جان...... مجھے آپ کی قربانیوں کا پوری طرح احساس ہے لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وہ جاوید کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "یہ میرا حکم ہے کہ تم فہمیدہ کو بھول جاؤ گے۔ نہ صرف بھول جاؤ گے بلکہ اس کے بغیر نارمل زندگی بھی گزارو گے۔ بولو۔ تم ایسا کرو گے نا؟"

"میں کوشش کروں گا امی جان۔"

"شاباش۔" حدیث النساء کا دل فخر کے احساسات سے معمور ہو گیا۔ "مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی بیٹا۔ تم نے میرا مان رکھا ہے۔ خدا تمہیں دین و دنیا میں ترقی دے۔"

جاوید نے ماں کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور فہمیدہ کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ البتہ وہ جاوید کے دل میں روز اول کی طرح آباد رہی۔ دل ایک ایسا آئینہ ہے جس کی سطح پر ابھرنے والا عکس مجسم ہو جاتا ہے پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ جاوید نے اپنے دل کے آستاں میں فہمیدہ کی جو تصویر بنائی تھی' وہ ناقابل فراموش تھی۔ پہلی نظر کی محبت اتنی اٹوٹ اور پائیدار ہوتی ہے کہ دل کی دھڑکن میں شامل ہو کر تاحیات پورے بدن میں دھڑکتی رہتی ہے۔

چند روز بعد فہمیدہ اپنے والد کے ساتھ کراچی شفٹ ہو گئی۔ حدیث النساء نے جاوید کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ جاوید کے مختلف حیلوں بہانوں سے یہ معاملہ کم و بیش ڈیڑھ سال تک

ٹلتا رہا۔ بالآخر اسے اپنی والدہ کی خواہش کے سامنے ہتھیار پھینکنا ہی پڑے چنانچہ آٹھ سال قبل یعنی فہمیدہ کے حیدر آباد چھوڑنے کے دو سال بعد جاوید کی رخشندہ سے شادی ہو گئی۔ اس وقت جاوید کی عمر انتیس سال تھی۔ رخشندہ اس سے صرف دو سال چھوٹی یعنی ستائیس سال کی تھی۔

جاوید کی شادی کے ایک سال بعد ثمن کی شادی بھی ہو گئی۔ ثمن کی شادی کے دو ماہ بعد حدیث النساء مختصر علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ گویا وہ اسی لیے اب تک زندہ تھی کہ اپنی اولاد کی شادی کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

ثمن کی شادی کراچی میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر خاصا اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ وہ جاوید کی صلاحیتوں کا بھی معترف تھا۔ وہ ہاتھ دھو کر جاوید کے پیچھے پڑ گیا کہ اسے حیدر آباد سے کراچی آ جانا چاہیے چنانچہ جاوید نے اپنا آبائی مکان بیچا اور رخشندہ کو ساتھ لے کر کراچی آ گیا۔ اس وقت تک جاوید کے یہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ کراچی آنا اس کے لیے ہر لحاظ سے مبارک اور سود مند ثابت ہوا۔ پہلے ہی سال اللہ نے اسے اولاد نرینہ سے نوازا اور اس کی ملازمت بھی ایک اچھی فرم میں ہو گئی۔ ازاں بعد وہ تجربہ اور ترقی حاصل کرتے ہوئے "برہان ٹریڈرز" میں پہنچ گیا۔ گزشتہ چار سال سے وہ اجمل برہان کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اس کا جنرل منیجر ہونے کے علاوہ وہ اس کا معتمد خاص بھی تھا۔ اس دوران میں اس کے یہاں ایک بیٹی کی ولادت بھی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنے ذاتی مکان میں نارتھ ناظم آباد میں رہائش پذیر تھا۔ اللہ نے دولت اور عزت سے نواز رکھا تھا۔

جاوید نے مجھے بتایا کہ چند ماہ قبل ایک مارکیٹ میں اچانک اس کی ملاقات فہمیدہ سے ہو گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ماضی کی کچھ یادیں تازہ کرنا قدرتی بات تھی۔ جاوید کے مطابق' فہمیدہ اپنی موجودگی زندگی سے مطمئن نہیں تھی۔ شادی کے فوراً بعد اس کے والد رفیق الدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا شوہر ایک کم رد شخص تھا جو خشک مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ عمر میں اس سے پندرہ سال بڑا بھی تھا۔ وہ ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے بھی محروم تھے۔

اس کے بعد بھی ایک دو بار ان کی ملاقات ہوئی' تاہم وہ فون پر ہفتہ دس دن میں ضرور بات کر لیتے تھے۔ ایک روز فہمیدہ نے فون پر جاوید کو بتایا کہ اس کے دیور قادر جان نے انہیں ملاقات کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے' لہٰذا اب انہیں اس سلسلے میں محتاط رہنا چاہیے۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد جاوید کو پتا چلا کہ پولیس نے فہمیدہ کو اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں فہمیدہ سے ملا اور اسے اپنی بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ فہمیدہ نے جاوید سے بس ایک ہی جملہ کہا تھا۔

"جاوید! اب اس دنیا میں تمہارے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے۔ اوپر خدا اور نیچے تم ہو۔"

"تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جاوید نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔"

پھر واقعی جاوید نے کوشش بھی کی لیکن پھس پھسا وکیل اس کے حسب منشا کارکردگی کا

مظاہرہ نہ کرسکا۔ اسی دوران میں جاوید کو کسی نامعلوم شخص نے فون پر دھمکی دی کہ اگر اس نے خود کو اس کیس سے الگ نہ کیا تو پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیا جائے گا' چنانچہ ان واقعات سے گھبرا کر وہ دوڑا دوڑا میرے پاس چلا آیا۔

فہمیدہ کی زبانی مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں' ان کے مطابق جب اس کے دیور نے اسے جاوید سے ملاقات کرتے ہوئے دیکھ لیا تو بلیک میلنگ شروع کردی۔ اس نے فہمیدہ کو دھمکی دی کہ اگر وہ اس کے ساتھ ''بے تکلف'' نہ ہوئی تو وہ نادر کو سب کچھ بتا دے گا۔ فہمیدہ نے اس کی دھمکی سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اس پر واضح کردیا کہ وہ چاہے کچھ بھی کرتا پھرے مگر وہ اس کی خواہش کے آگے سر نہیں جھکائے گی۔ اس واقعے کے بعد قادر جان نے خاموشی اختیار کرلی۔

فہمیدہ کے مطابق قادر جان اپنے بڑے بھائی کے برعکس ایک غیر سنجیدہ اور پھڈے باز آدمی تھا۔ اس کے لیے فہمیدہ کے دل میں کبھی بھی احترام کے جذبات نہیں جاگے تھے۔ فہمیدہ نے مجھے بتایا کہ اس کے سسر نے کسی زمانے میں ''جان محمد اینڈ سنز'' کے نام سے ایک ٹریڈنگ کمپنی کھولی تھی۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے آٹو پارٹس اور مشینری امپورٹ کرتی تھی۔ جان محمد کے انتقال کے بعد اس کمپنی کا نام ''جان برادرز'' ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد چھوٹے بھائی قادر جان نے بزنس سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے حصے کا سرمایہ لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ فہمیدہ کی شادی سے پہلے کا واقعہ تھا۔ جب نادر جان اس کمپنی کا واحد مالک رہ گیا تو یہ ''نادر ٹریڈنگ کمپنی'' ہوگئی۔ نادر جان کی رہائش کشمیر روڈ پر ایک شاندار بنگلے میں تھی۔

دو سال قبل قادر جان واپس آگیا۔ وہ اپنا سارا سرمایہ اور صحت تباہ و برباد کرکے آیا تھا۔ بڑے بھائی سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی اور وہ اسے اپنے بنگلے پر لے آیا۔ اب وہ ان کے ساتھ ہی رہتا تھا اور بڑی شرافت سے نادر جان کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

وقوعہ کے روز حسب معمول فہمیدہ اور نادر اپنی خواب گاہ میں سوئے ہوئے تھے پھر اگلی صبح یعنی چوبیس اکتوبر کو علی الصباح قادر نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ فہمیدہ نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظر سے اپنے دیور کو دیکھا۔

''سوری بھابی! میں زحمت کی معذرت چاہتا ہوں۔'' قادر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا' پھر بیڈروم کے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''بھائی صاحب جاگ رہے ہیں کیا؟''

''نہیں' وہ تو بے خبر سو رہے ہیں۔'' فہمیدہ نے ایک طویل جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آخر کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں بھابی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''دراصل مجھے ایک دوست کے ساتھ ایئرپورٹ جانا ہے۔ رات بھائی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا' میں ان کی گاڑی لے جاؤں۔ مجھے چاہیے تھا' میں رات ہی ان سے گاڑی کی چابی لے لیتا لیکن بس اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ آپ مجھے گاڑی کی چابیاں دے دیں۔''

فہمیدہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔''

پھر وہ بیڈروم کے اندر ڈریسنگ ٹیبل پر گاڑی کی چابیاں تلاش کرنے لگی۔ تلاش اس لیے کہ چابیاں وہاں موجود نہیں تھیں حالانکہ نادر اپنا بٹوا اور گاڑی کی چابیاں ہمیشہ ڈریسنگ ٹیبل پر ہی رکھا کرتا تھا۔ فہمیدہ مختلف درازوں کو کھولنے بند کرنے لگی۔

اس دوران میں قادر بھی بیڈروم میں داخل ہوچکا تھا۔ فہمیدہ کو اس کے اندر آنے کا بہت دیر بعد احساس ہوا۔ جب تمام ممکنہ جگہوں پر دیکھنے کے بعد بھی گاڑی کی چابیاں نہ ملیں تو قادر نے مشورہ آمیز لہجے میں کہا۔

''بھابی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے' بھائی صاحب کو جگا کر پوچھ لیں۔''

''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔'' فہمیدہ نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''ویسے بھی ان کے اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے' اتنی کھٹ پٹ کے باوجود بھی ان کی آنکھ کیوں نہیں کھلی۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی فہمیدہ' نادر جان کو آوازیں دینے لگی۔ جب دو چار آوازوں پر نادر جان کے وجود میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی تو فہمیدہ اسے کندھے سے پکڑ کر باقاعدہ ہلانے لگی پھر یہ ہلانا جھنجھوڑنے میں بدل گیا مگر زمین جنبد نہ جنبد نادر جان۔

فہمیدہ نے پریشان نظر سے اپنے دیور کو دیکھا۔ ''قادر' انہیں کیا ہوگیا ہے۔ یہ حرکت کیوں نہیں کر رہے؟''

قادر نے آگے بڑھ کر بڑے بھائی کی نبض ٹٹولی پھر اس کی ناک کے قریب ہاتھ رکھ کر اس کی سانسوں کو محسوس کرنے لگا' پھر تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''بھابی! بھائی صاحب میں تو زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' فہمیدہ نے غصے سے کہا اور بے حس و حرکت پڑے ہوئے نادر جان کی نبض ٹٹولنے لگی۔ ''رات کو تو اچھے خاصے سوئے تھے۔ اللہ جانے' انہیں کیا ہوگیا ہے۔'' پھر وہ قادر جان کی طرف بڑھی۔ ''قادر! فوراً ڈاکٹر کو فون کرو۔'' پریشانی کے سبب اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''ڈاکٹر کو اس وقت فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چلو ہم انہیں کسی پرائیویٹ ہسپتال لے چلتے ہیں۔''

قادر جان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب اس ایکٹنگ کا کیا فائدہ۔ تم نے جو کرنا تھا وہ تو کر ڈالا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' فہمیدہ ہکابکا اسے دیکھنے لگی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے میرے بھائی کی جان لے لی ہے نامراد۔'' قادر نے زہریلے لہجے میں کہا پھر بولا۔ ''ٹھہرو' ذرا میں اپنے دوست کو بتا دوں کہ ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے اس لیے میں اس کے ساتھ ایئرپورٹ نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد تم سے نمٹتا ہوں۔''

فہمیدہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی مجھ پر ایسا الزام لگاتے ہوئے؟''

''حقیقت بیان کرنے میں شرم کیسی۔'' وہ روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو ایک سچی بات کہی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، سچ بڑا کڑوا اور تلخ ہوتا ہے۔ اس بات کا اندازہ تمہاری حالت سے لگایا جاسکتا ہے۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ بیڈ روم سے نکل گیا پھر تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولا۔ ''میں نے اپنے دوست کو فون کر دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ سچ سچ بتا دو۔ تم نے میرے بھائی کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اگر تم نے دروغ گوئی کا سہارا نہ لیا تو میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے قادر جو اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔'' فہمیدہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں بھلا نادر سے ایسی دشمنی کرسکتی ہوں؟''

''دوستی کو دشمنی میں بدلتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

فہمیدہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''فضول باتیں نہ کرو اور انہیں ہسپتال پہنچانے میں میری مدد کرو۔''

پھر ان میں بحث و تکرار ہونے لگی۔ اسی میں خاصا وقت گزر گیا۔ فہمیدہ کو اس وقت چونک جانا پڑا جب اس کے بنگلے پر پولیس کی جیپ نے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ قادر نے اپنے کمرے میں جا کر یقیناً پولیس اسٹیشن فون کیا ہوگا۔ ازاں بعد اس کا اندازہ صد فی صد درست ثابت ہوا۔

پولیس نے آتے ہی اپنی کارروائی شروع کر دی۔ نادر جان کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ پولیس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے شیشے کے گلاس کو فوراً اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ وہی گلاس تھا جس میں رات سونے سے قبل نادر جان نے دودھ پیا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ فہمیدہ کو آن واحد میں ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ ازاں بعد اس کے سامان کی تلاشی میں سے بھی پولیس کو کچھ قابل اعتراض اشیاء ملیں۔ قصہ مختصر، فہمیدہ کو اپنے شوہر نادر جان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا تھا۔ پولیس کا ابتدائی موقف یہی تھا کہ فہمیدہ نے زہریلا دودھ پلا کر اپنے شوہر کی جان لے لی تھی۔

اس کے علاوہ بھی فہمیدہ نے مجھے بہت سی اہم باتیں بتائیں جن کا ذکر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔

جاوید احمد حسب وعدہ ایک ہفتے بعد میرے دفتر آیا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کر لیا ہے؟''

''ہاں، میں پوری طرح اس کیس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''معاملہ خاصا الجھا ہوا ہے۔ اس واردات کے پس منظر میں مجھے کوئی گہری سازش نظر آ رہی ہے۔ میں تو اپنی پوری کوشش کروں گا لیکن آپ کو بھی بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں بیگ صاحب۔ بتائیں مجھے کیا کرنا

ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں مضبوط گواہی کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم کیس نہیں جیت سکتے۔''

''کس قسم کی مضبوط گواہی؟'' وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری بات سمجھا دی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ کل ہی سے کام شروع کر دے گا پھر وہ رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں مقررہ تاریخ پر عدالت میں حاضر ہوا اور اپنا وکالت نامہ دائر کر دیا۔ پیش کار کی زبانی معلوم ہوا کہ ہمارے کیس کا پانچواں نمبر تھا۔ میں نے اس سے اپنا نمبر اوپر لگانے کے لیے کہا تو اس نے واضح الفاظ میں معذرت کر لی۔

''بیگ صاحب! آج دو نہایت ہی اہم مقدمات کے فیصلے سنائے جانے ہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ میں تیسرے نمبر پر آپ کا کیس لگا دیتا ہوں۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ تیسرے نمبر پر لگنے کے بعد ہمیں مناسب وقت مل سکے گا تاہم میں نے پیش کار سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تیسرا نمبر ہی لگا دیں۔ جو اللہ کو منظور ہو۔''

میری توقع کے عین مطابق جب ہمارے کیس کی آواز پڑی تو عدالت کا وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ ہی باقی بچے تھے۔ ہم عدالت میں حاضر ہوئے۔ جج مجھ پر نگاہ پڑتے ہی چونک اٹھا۔ پھر اس نے پیش کار سے استفسار کیا۔

''کامران رضوی نظر نہیں آ رہے؟''

''سر! رضوی صاحب نے یہ کیس چھوڑ دیا ہے۔'' پیش کار نے جج کو بتایا۔ ''اب بیگ صاحب وکیل صفائی کے طور پر اس کیس کی پیروی کریں گے۔ انہوں نے اپنا وکالت نامہ داخل کر دیا ہے۔''

جج نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیا پھر مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔

''جناب عالی! آج تو کوئی قابل ذکر کارروائی ہونا ممکن نہیں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ کوئی قریب ترین تاریخ دے دی جائے تاکہ اس مقدمے کا معاملہ جلد از جلد آگے بڑھے۔''

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے دی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج کے حکم پر عدالت برخاست کر دی گئی۔

دوسری پیشی سے پہلے میں اس کیس کی چند اہم باتیں آپ کو بتاتا چلوں۔ اس میں

سرفہرست پولیس رپورٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ ہیں۔

پولیس کی رپورٹ کے مطابق ملزمہ فہمیدہ نے اپنے شوہر مقتول نادر جان کو زہریلا دودھ پلا کر ہلاک کیا تھا۔ اس کی تفصیل میں پولیس نے بیان کیا تھا کہ ملزمہ ایک بے وفا بیوی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں غیر مردوں سے ملتی تھی۔ یہ ملاقاتیں اگرچہ گھر سے باہر ہوتی تھیں تاہم اتفاق سے مقتول کے چھوٹے بھائی قادر جان کے علم میں آ گئی تھیں۔ قادر نے جب اپنی بھابی ملزمہ فہمیدہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ صاف مکر گئی۔ قادر نے ملزمہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ قادر نے ایک دو بار مناسب موقع دیکھ کر بھابی کو علیحدگی میں سمجھایا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے ورنہ مجبوراً اسے مقتول سے اس کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرنا پڑے گا۔ جواب میں ملزمہ ہتھے سے اکھڑ گئی اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق وہ قادر پر چڑھ دوڑی۔ بہ حالت مجبوری قادر کو یہ سارا معاملہ بڑے بھائی کے سامنے رکھنا پڑا۔

نادر کو پہلے تو یقین نہیں آیا پھر قادر نے کچھ ایسے دلائل دیے کہ وہ ملزمہ سے پوچھ تاچھ پر مجبور ہو گیا۔ ملزمہ نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قادر کی بات کو بے بنیاد الزام قرار دیا۔ میاں بیوی کے درمیان اس رات خوب جھگڑا ہوا۔ اس کے دو روز بعد نادر جان اپنی خواب گاہ میں مردہ پایا گیا تھا۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر ملزمہ کو گرفتار کر لیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے دودھ والا گلاس بھی مل گیا جس میں زہریلا دودھ مقتول کو پلایا گیا تھا۔

ملزمہ کے سامان کی تلاشی میں پولیس کو مانع حمل گولیوں کی ایک شیشی بھی ملی تھی جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ ملزمہ شوہر سے ''بے وفائی'' کی پردہ پوشی کے لیے وہ گولیاں استعمال کرتی تھی۔ پولیس نے اس ضمن میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مقتول باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ پولیس کے موقف کی تصدیق قادر جان نے کی تھی اور اس سلسلے میں انہیں مقتول کی ایک میڈیکل رپورٹ بھی مہیا کی تھی۔

پولیس کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری موکلہ کو اپنے شوہر کا قاتل ثابت کرنے میں قادر جان پیش پیش تھا۔ فہمیدہ سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس نے دیور کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جب قادر نے دیکھا کہ وہ اس کے مذموم عزائم سے انکاری ہے تو اس نے اپنی توپوں کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ بہرحال میری موکلہ بری طرح ایک سازشی جال میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹس بھی سراسر میری موکلہ کے خلاف جاتی تھیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول نادر جان کی موت رات ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی یعنی وہ چوبیس اکتوبر کی تاریخ تھی۔ دودھ میں شامل سریع الاثر زہر نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ملنے والے گلاس پر دو قسم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے نمبر ایک ملزمہ فہمیدہ کے فنگر پرنٹس اور نمبر دو مقتول نادر جان کے فنگر پرنٹس۔ زہر کی جو قسم مقتول کے

جسم میں پائی گئی تھی وہی زہر دودھ کے استعمال شدہ گلاس کے پیندے میں بھی پایا گیا۔ جب اس گلاس کا لیبارٹری ٹیسٹ کیا گیا تو پیندے میں موجود دودھ کی قلیل مقدار سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مقتول کو اسی گلاس سے زہریلا دودھ پلا کر سفر آخرت پر روانہ کیا گیا تھا۔ میری موکلہ کو پھانسنے کا بڑا کامل منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست داخل کی گئی تھی لیکن میں صرف اہم گواہوں پر جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں گا جو باتیں غیر دلچسپ اور غیر ضروری ہیں انہیں بیان کرنا سسپنس کے قیمتی صفحات کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔

☆☆............☆☆............☆☆

جج اپنی کرسی سنبھال چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے استغاثہ کی گواہ برکت بی بی گواہی کے لیے وٹنس باکس میں آئی۔ برکت بی بی مقتول کی گھریلو ملازمہ تھی۔ وہ عرصہ دراز سے اس کے بنگلے پر کام کر رہی تھی۔ صفائی ستھرائی اور جھاڑو پونچھا اس کے فرائض کا حصہ تھا۔

عدالت کے دستور کے مطابق برکت بی بی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروایا پھر وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''برکت بی بی! مقتول نادر جان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''صاحب جی بہت اچھے انسان تھے۔''

''برکت بی بی!'' وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔ ''تمہیں وہ دن یاد ہے جب مقتول اور ملزمہ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

برکت بی بی نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے دو روز بعد ہی تو صاحب جی فوت ہو گئے تھے۔ میرا مطلب ہے انہیں زہر دے کر مار دیا گیا تھا۔''

''تمہارے خیال میں تمہارے صاحب جی کو کیوں ہلاک کیا گیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں جی۔''

''برکت بی بی!'' وکیل استغاثہ نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم پورے بنگلے کی صفائی کرتی ہو۔ کچرے کی ٹوکریوں میں تمہیں دیگر اشیاء کے ساتھ دوا کی خالی شیشیاں اور پتے وغیرہ بھی ملتے ہوں گے؟''

''جی ہاں، ایسا ہوتا ہے۔'' برکت بی بی نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ بنگلے کے مکینوں میں کون شخص کون سی دوا استعمال کرتا ہے؟''

"جناب! میں بالکل ان پڑھ ہوں۔" برکت بی بی نے معذرت آمیز انداز میں کہا "اس لیے دواؤں کے نام نہیں جانتی۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم دواؤں کے نام نہیں بتا سکتی لیکن ان کی شیشیاں اور پتے دیکھ کر تو بتا سکتی ہو یعنی تم ان کی شناخت تو کر سکتی ہو نا؟"

"جی ہاں' میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

وکیل استغاثہ نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے مختلف دواؤں کے استعمال شدہ اسٹرپس اور ایک دو خالی شیشیاں نکال کر گواہ برکت بی بی کو دکھائیں پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

برکت بی بی نے تین اسٹرپس اور ایک خالی شیشی ان میں سے الگ کر لی پھر بولی۔ "میں ان کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ یہ بڑے صاحب کے کمرے کی دوائیں ہیں۔"

مذکورہ اسٹرپس میں ایک پین کلر (دردکش) ایک بلڈ پریشر اور ایک ملٹی وٹامن کا اسٹرپ تھا جب شیشی ویلیم فائیو کی تھی۔ میری معلومات کے مطابق مقتول نادر جان ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا مستقل دوا استعمال کرتا تھا۔ پین کلر اور وٹامن کی گولیاں کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔ میری موکلہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ویلیم فائیو بھی اکثر و بیشتر نادر جان کے استعمال میں رہتی تھی۔

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کرنے سے پہلے اپنی جیب میں سے ایک اور دوا کی خالی شیشی برآمد کی اور برکت بی بی کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "برکت بی بی! اس شیشی کو غور سے دیکھو اور اس کے بارے میں بتاؤ؟"

اس شیشی پر نظر پڑتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ وہ مانع حمل کی گولیوں والی شیشی تھی۔ برکت بی بی نے اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر اس شیشی کا معائنہ کیا پھر جواب دیا۔

"جناب! ایک دو مرتبہ یہ شیشی بھی مجھے کچرے میں سے ملی ہے لیکن ایسا پچھلے پانچ چھ ماہ کے دوران ہی میں ہوا ہے۔ پہلے کبھی میں نے یہ شیشی گھر میں نہیں دیکھی تھی۔"

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس بات پر نازاں تھا اور کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے استغاثہ کے گواہ پر جرح کرنے کے لیے کٹہرے کے قریب آیا پھر برکت بی بی کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"برکت بی بی! تمہیں مقتول نادر جان کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"لگ بھگ پندرہ سال ہو گئے ہیں جی۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری رہائش کہاں پر ہے؟"

اس نے بتایا۔ "کھارادر۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بنگلے میں نہیں رہتی ہو؟"

"جی' میں اپنا کام ختم کر کے واپس اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔"

"تمہاری ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "میں صبح نو دس بجے بنگلے پر آ جاتی ہوں اور چار بجے کے بعد واپس جاتی ہوں۔"

میں نے سوال کیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ سے دو روز پہلے مقتول اور ملزمہ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ کیا تم بتاؤ گی کہ جھگڑے کی کیا وجہ تھی؟"

وہ الجھ گئی۔ "میں یہ بات کیسے بتا سکتی ہوں!"

"کیوں' بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ مجھے جھگڑے کی وجہ معلوم نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ان کے درمیان جھگڑا کتنے بجے ہوا تھا؟"

"دن میں ہی ہوا تھا۔"

"دن میں کتنے بجے؟"

"درست وقت تو میں نہیں بتا سکتی۔" وہ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "دراصل جھگڑے والی بات مجھے عبدالغفور نے بتائی تھی۔"

"یہ عبدالغفور کون ہے؟"

"صاحب جی کا باورچی جناب۔"

مجھے یاد آ گیا۔ استغاثہ کے گواہوں میں عبدالغفور کا نام بھی شامل تھا۔ میں نے پوچھا۔ "برکت بی بی! تمہارے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تم نے اپنی آنکھوں سے مقتول اور ملزمہ کو جھگڑا کرتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ یہ بات تمہیں باورچی عبدالغفور سے معلوم ہوئی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا' میں نے اگلا سوال کیا "برکت بی بی! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے دوا والی ایک ایسی خالی شیشی کو شناخت کیا ہے جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ پچھلے چند ماہ میں ایک دو مرتبہ تمہیں کچرے میں سے ملی تھی۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ میرا واضح اشارہ مانع حمل گولیوں والی شیشی کی جانب تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ دوا کس کام آتی ہے؟"

"یہ تو اس شیشی پر لکھا ہوگا جناب۔" اپنی دانست میں اس نے ایک دانش مندانہ جواب دیا۔ "آپ خود پڑھ سکتے ہیں۔ میں تو انگریزی کیا' اردو بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔"

"یعنی تم بالکل نہیں جانتیں کہ وہ دوا کس مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "برکت بی بی! تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا

ہے کہ تمہیں مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کم و بیش پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ جب تم نے اس بنگلے پر کام شروع کیا تو اس وقت مقتول شادی شدہ تھا؟'' میں نے دانستہ یہ سوال کیا تھا۔

''نہیں جی' ان کی شادی بعد میں ہوئی تھی۔''

''ان کی شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟''

''میرا خیال ہے' دس سال تو ہو گئے ہوں گے۔'' وہ کچھ دیر سوچتے ہوئے بولی۔ ''ان کی شادی میرے سامنے ہی ہوئی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مقتول کے کتنے بچے ہیں؟''

''ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

برکت بی بی کے بعد گھریلو ملازم باورچی عبدالغفور گواہی کے لیے کٹہرے میں آیا۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا پھر وکیل استغاثہ نے اس سے چند رسمی سے سوالات پوچھے۔ سارا زور اسی بات پر تھا کہ وقوعہ سے دو روز پہلے مقتول اور ملزمہ میں اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔ وکیل استغاثہ کے بعد میں جرح کے لیے آگے بڑھا۔

میں نے گواہ عبدالغفور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''عبدالغفور! تمہیں مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''آٹھ سال ہو گئے ہیں جناب۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا میں تمہیں عبدالغفور کے بجائے غفور صاحب یا غفور میاں کہہ کر پکار سکتا ہوں؟''

''آپ کا جو جی چاہے' پکاریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''غفور میاں!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ جب تم نے بنگلے پر کام شروع کیا تو اس وقت تمہارے صاحب یعنی مقتول نادر جان کی شادی ہو چکی تھی؟''

''جی ہاں' اس وقت وہ شادی شدہ تھے۔'' اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''ملزمہ سے ان کی شادی' میرے بنگلے پر آنے سے پہلے ہو چکی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مقتول کا رویہ تمہارے ساتھ کس قسم کا تھا؟''

''بہت اچھا تھا۔''

''یعنی تمہیں ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔''

''جی' بالکل نہیں۔''

''اور ملزمہ کے رویے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ کا رویہ بھی ٹھیک ہی تھا یعنی ان سے بھی تمہیں کوئی شکایت نہیں تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''غفور میاں! اگر تمہیں ملزمہ سے کوئی شکایت نہیں ہے تو پھر تم اس کے خلاف بیان کیوں دے رہے ہو؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صفائی ایک غیر ضروری سوال کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یور آنر! اگر گواہ میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔''

جج نے سوالیہ نظر سے عبدالغفور کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''جناب! مجھے وکیل صاحب کے سوال کا جواب دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے سامنے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے۔ میں جو کچھ بھی بتاؤں گا وہ مبنی بر سچ ہی ہوگا۔ اگرچہ مجھے ملزمہ سے ذاتی طور پر کوئی شکایت نہیں لیکن حقائق کو چھپانا بھی تو مناسب نہیں ہے۔''

عبدالغفور خاصا ہوشیار آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''غفور میاں! تم نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وقوعہ سے دو روز پہلے مقتول اور ملزمہ میں جھگڑا ہوا تھا؟''

''جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ' وہ کون سا دن تھا؟''

وہ کھنک کر بولا۔ ''وہ چھٹی کا دن تھا جناب...... یعنی اتوار۔''

''اور تاریخ کون سی تھی؟''

''بائیس اکتوبر۔''

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ فہمیدہ نے مجھے بتایا تھا کہ مذکورہ روز ان کے درمیان کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ جتنی روانی سے عبدالغفور میرے سوالات کے جواب دے رہا تھا' اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اسے خوب اچھی طرح بیان رٹوایا گیا ہے۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''غفور میاں! جب تم نے جھگڑے کا دن اور تاریخ بتا ہی دی ہے تو اب لگے ہاتھ یہ بھی بتا دو کہ مقتول اور ملزمہ کے درمیان جھگڑا بائیس اکتوبر بروز اتوار کتنے بجے ہوا تھا؟''

''دوپہر کے وقت' لنچ کی میز پر۔''

''کیا اس وقت مقتول کا چھوٹا بھائی قادر جان بھی گھر پر تھا؟''

''جی نہیں' وہ تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے چلے گئے تھے۔''

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"
"شاید کوئی بے وفائی کا معاملہ تھا۔"
"کیسی بے وفائی؟"
عبدالغفور تامل کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے صاحب کو شک تھا کہ ملزمہ ان سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی۔"
"کیا مقتول نے اپنے اس شک کا اظہار تم سے بھی کیا تھا؟"
"وہ اپنی یہ انتہائی ذاتی بات مجھ سے کیسے کرسکتے تھے۔"
"پھر تمہیں ملزمہ کی بے وفائی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔
وہ شپٹا گیا پھر سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے جھگڑے کے دوران میں ان کی گفتگو سے اس بات کا اندازہ لگایا تھا۔"
"کیا وہ تمہاری موجودگی میں جھگڑا کر رہے تھے؟"
"نہیں جناب' میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنی تھیں۔" وہ قدرے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ پھر اضافہ کیا۔ "ویسے باورچی اور ڈرائیور دو ایسے افراد ہوتے ہیں جن سے گھریلو معاملات پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔"
اس کی بات میں خاصا وزن تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ تم خاصے کائیاں شخص معلوم ہوتے ہو۔"
وہ اسے اپنی تعریف سمجھا۔ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں' جی ہاں۔"
عبدالغفور کی اس حرکت پر وکیل استغاثہ نے گھور کر اسے دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ عبدالغفور کی نظر وکیل استغاثہ کی نظر سے ملتی' میں نے اگلا سوال داغ دیا۔
"غفور میاں! کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ چھپ کر کسی کی باتیں سننا بہت بڑا جرم ہے۔ اس پر تمہیں سزا بھی ہوسکتی ہے؟"
"یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی جناب۔"
میں نے پوچھا۔ "عبدالغفور! کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے صاحب کو میری موکلہ ہی نے قتل کیا ہے؟"
وہ جلدی سے بولا۔ "اس میں میرے خیال کی کیا بات ہے جناب۔ ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ بیگم صاحبہ کو پولیس نے گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا ہے اور ان پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ کاش وہ صاحب جی سے بے وفائی نہ کرتیں۔ نہ ان کے درمیان جھگڑا ہوتا اور نہ ہی......" وہ جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ اپنی حماقت کو محسوس کرتے ہی اس نے زبان کو بریک لگائے اور بولا۔ "خیر' اب ان باتوں کا کیا فائدہ ہے۔ تیر کمان سے نکل ہی چکا ہے۔"
میں نے ایک دو سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔
اس کے بعد مقتول کے چھوٹے بھائی قادر جان کو گواہی کے لیے پیش ہونا تھا لیکن وہ غیر حاضر تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔
"جناب عالی! قادر جان کی گواہی تو اب آئندہ پیشی پر ہی ہوسکے گی۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری افسر سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"
"آئی۔او" یعنی انکوائری افسر گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام فضل داد تھا اور اپنے عہدے کے اعتبار سے وہ ایک ایس آئی تھا۔ میں نے تفتیشی افسر کی جانب دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔
"آئی او صاحب!" میں نے پوچھا۔ "آپ کو واردات کی اطلاع کب ملی تھی؟"
وہ اپنے کاغذات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "چوبیس اکتوبر کی صبح سات بجے۔"
"اطلاع کا ذریعہ کیا تھا؟"
"ٹیلی فون کال۔"
"اطلاع کس نے دی تھی؟"
"مقتول کے چھوٹے بھائی قادر جان نے۔"
"آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟" میں نے استفسار کیا۔
"تقریباً آٹھ بجے۔"
"اس تاخیر کی وجہ؟" میں نے پوچھا۔ "جبکہ آپ کا تھانا جائے وقوعہ سے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔"
وہ بولا۔ "ہمیں کچھ اپنی ضروری تیاری بھی کرنا ہوتی ہے وکیل صاحب۔ پھر اس وقت تھانے میں موبائل جیپ بھی موجود نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا خیال ہے' ہم ٹھیک وقت پر ہی پہنچ گئے تھے۔"
میں نے رواداری میں کہا۔ "بجا فرمایا آپ نے۔ پینتالیس منٹ کی تاخیر بھی بھلا کوئی تاخیر ہوتی ہے!"
وہ برا سا منہ بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ اور کون کون تھا؟"
"سپاہی عارف محمود اور حق نواز۔"
"فضل داد صاحب! آپ کے بیان کے مطابق آپ ٹھیک آٹھ بجے صبح موقع واردات پر پہنچ گئے تھے جبکہ ہسپتال کے ریکارڈ کے مطابق آپ مقتول کی لاش کے ساتھ تقریباً سوا دس بجے وہاں پہنچے تھے۔ آپ کو تو چاہیے تھا کہ مقتول کو فوراً ہسپتال پہنچاتے۔ اس کوتاہی کی وجہ بیان کریں گے

آپ؟''

''یہ کوتاہی نہیں تھی جناب۔''

''تو پھر کیا تھا؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔''اگر آپ فوری طور پر مقتول کو ہسپتال پہنچا دیتے تو ممکن ہے' اس کی جان بچ جاتی۔''

وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔''وکیل صاحب! لگتا ہے' آپ نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ غور سے نہیں پڑھی!''

''کیوں!'' میں نے ان جان بن جانے کی اداکاری کی۔''پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کوئی خاص بات لکھی ہوئی ہے؟''

''جی ہاں' خاص بات ہی لکھی ہوئی ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔''اگر آپ نے غور کیا ہوتا تو آپ کو پتا چل جاتا کہ مقتول کی موت رات ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی پھر جلدی یا تاخیر سے اس کی لاش ہسپتال پہنچانے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟''

''اوہ!'' میں نے چہرے پر متاسفانہ تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔''میں سمجھا شاید پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ہر کام میں تاخیر کرنا بہت ضروری ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے انکوائری افسر کی آنکھوں میں جھانکا اور سوال کیا۔''فضل داد صاحب! کیا آپ غیب کا علم بھی جانتے ہیں؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!'' وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔''کیا موقع واردات پر پہنچتے ہی آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ مقتول نے رات ایک اور دو بجے کے درمیان سفر آخرت اختیار کیا تھا؟''

وہ میرے طنز کو سمجھ گیا' کھسیانے انداز میں بولا۔''میں نے مقتول کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ موت سے ہمکنار ہو چکا ہے۔''

''کیا آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔''

''یہ سامنے کی باتیں جاننے کے لیے انسان کا ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں ہے۔'' وہ قدرے بگڑ کر بولا۔''آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''آپ واقعی بہت تجربہ کار ہیں۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا پھر پوچھا۔''سب انسپکٹر صاحب! کیا آپ اس معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ اپنی رپورٹ میں آپ نے مقتول کے بارے میں جو لکھا ہے کہ وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا' یہ بات آپ کو کس ذریعے سے پتا چلی؟''

''مقتول کی لیبارٹری رپورٹ سے۔''

''کیا مرنے کے بعد آپ نے اس کا ٹیسٹ کروایا تھا؟''

''نہیں' یہ رپورٹ اس وقت کی ہے جب وہ زندہ سلامت تھا اور اس نے خود لیبارٹری

ٹیسٹ کروایا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کو یہ رپورٹ کس نے مہیا کی تھی؟''

''قادر جان نے۔''

''کیا آپ نے متعلقہ لیبارٹری سے اس رپورٹ کی تصدیق کر لی تھی؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''کیوں؟''

وہ بولا۔''کیونکہ وہ ایک بہت بڑے پرائیویٹ ہسپتال کی مستند لیبارٹری ہے۔ ان کی رپورٹ پر شک نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں نے رپورٹ کے نتائج کی بات نہیں کی۔'' میں نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔''بلکہ رپورٹ کے ریکارڈ کی بات کی ہے۔ تمام بڑی اور مستند لیبارٹریز اپنے مریضوں کا مکمل ریکارڈ محفوظ رکھتی ہیں۔''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو برآمدے میں چلتے ہوئے جاوید احمد نے مجھ سے پوچھا۔''بیگ صاحب! آپ اب تک کی عدالتی کارروائی سے مطمئن ہیں؟''

''نہ صرف عدالتی کارروائی بلکہ میں اپنی کارکردگی سے بھی مطمئن ہوں۔'' میں نے کہا۔''ہم بالکل صحیح رخ پر جا رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔

میں نے محسوس کیا' وہ کسی الجھن کا شکار تھا۔ میں نے پوچھا۔''کیا بات ہے جاوید صاحب۔ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''پھر کوئی عام بات ہو گی؟''

وہ ٹال کرتے ہوئے بولا''ہاں' عام سی بات ہے۔ خیر اب تو آپ نے میری حفاظت کا مکمل انتظام کر دیا ہے۔ پھر ڈر کی کیا بات ہے۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا' پوچھا''کیا آپ کو پھر کوئی ٹیلیفونک دھمکی دی گئی ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا پھر بولا''لیکن اب میں اس قسم کی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہونے والا۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ حق اور سچائی کے لیے فائٹ کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے نا بیگ صاحب۔''

ہم اسی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے پارکنگ تک پہنچے پھر اپنی ہی گاڑی میں بیٹھ کر سٹی کورٹ کی عمارت سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

یہ آئندہ پیشی سے تین روز پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک رات میں حسب معمول اپنی اسٹڈی میں کسی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے لگ بھگ گیارہ بجے ہوں گے، جب میرے گھر کی اطلاع گھنٹی بج اٹھی۔ اتفاق سے اسٹڈی کی ایک کھڑکی باہر کی جانب کھلتی ہے اور مذکورہ کھڑکی سے گھر کا بیرونی گیٹ بڑا واضح نظر آتا ہے۔ کسی بے اختیار عمل کے تحت میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ مجھے اپنا گھریلو ملازم امتیاز علی دکھائی دیا۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر گیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

تیسری گھنٹی پر اس نے گیٹ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سنسنی خیز منظر میری نگاہ کے سامنے پھیل گیا۔ گھنٹی بجانے والے کا ایک ہاتھ بڑی سرعت سے امتیاز علی کی جانب بڑھا اور پھر ایک ٹی ٹی کی نال اس کی گردن سے لگ گئی۔ اگلے ہی لمحے نووارد نے امتیاز علی کو ٹی ٹی کے زور پر گھر کے اندر دھکیل رہا تھا۔ گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے سے پہلے نووارد نے بیرونی گیٹ بند کر دیا اور ٹی ٹی کو امتیاز علی کے پہلو میں لگا کر آگے بڑھنے لگا۔

میں اپنی اسٹڈی میں ایسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں سے باہر کا منظر تو صاف نظر آتا تھا، لیکن گیٹ کے آس پاس سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ واقعہ میرے لیے حیرت کا باعث تو تھا ہی، لیکن اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ ٹی ٹی بدست اس نوجوان کا مقصد آخر کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بھی ایک نوجوان رات کے وقت دیوار پھاند کر میرے بنگلے میں گھس آیا تھا، تاہم اس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا تھا کہ پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور اس نے چھپنے کے لیے میرے بنگلے کا انتخاب کیا تھا۔ شاید میں اپنی کسی سابقہ کہانی میں اس نوجوان کا ذکر کر چکا ہوں۔

ٹی ٹی بدست نوجوان جب امتیاز علی کے ساتھ میری نظر کی پہنچ سے باہر نکل گیا، تو میں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ آن واحد میں، میں نے میز کی دراز میں سے اپنا لائسنس یافتہ ریوالور برآمد کیا، پھر اس کے چیمبر کو چیک کرنے کے بعد میں اسٹڈی کے داخلی دروازے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ اگر کوئی شخص اسٹڈی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا تو مجھے دروازے کے پٹ کی اوٹ مل جاتی اس طرح میں اندر آنے والے کی نظر سے اوجھل ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اسٹڈی کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ جب وہ دونوں دروازے کے قریب پہنچے تو مجھے اس نوجوان کی باقاعدہ غراہٹ بھی سنائی دی۔ وہ امتیاز علی سے پوچھ رہا تھا۔

''کس طرف ہے وہ تمہارا وکیل کا بچہ؟''

''اسی کمرے میں ہے۔'' امتیاز نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ غالباً اس نے

اسٹڈی کی جانب اشارہ بھی کیا ہوگا، کیونکہ امتیاز کے جواب کے بعد نووارد کی ڈانٹ آمیز آواز ابھری تھی۔

''تم اپنے دونوں ہاتھ اوپر ہی رکھو۔ کوئی چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں پاگل نہیں ہوں جو کوئی چالاکی دکھا کر خود کو موت کے منہ میں دھکیلوں۔'' امتیاز نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا ''کیا بات ہے، اس گھر میں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ وکیل کی فیملی کے لوگ نظر نہیں آرہے۔ کیا کہیں گئے ہوئے ہیں؟''

''اس سوال کا جواب بیگ صاحب ہی دیں گے۔''

''بیگ سے تو میں ابھی نمٹ لیتا ہوں۔'' وہ نوجوان نیچے لہجے میں بولا ''تم دروازے پر دستک دے کر اسے باہر تو نکالو اور دیکھو کوئی ہوشیاری نہ دکھانا۔ میں گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ مجھے چکر دینے کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔''

اگلے ہی لمحے مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں ایکشن کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے دیوار کی جانب منہ پھیر کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آجاؤ امتیاز علی دروازہ کھلا ہے۔''

امتیاز نے دروازہ کھول دیا۔ میں پٹ کے پیچھے اوجھل ہو گیا، پھر جیسے ہی وہ دونوں اسٹڈی کے اندر داخل ہوئے، میں نے برق کی سی پھرتی سے اس نوجوان کے قدموں میں فائر کر دیا۔

وہ اس قسم کے شدید ردعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ بوکھلاہٹ میں وہ اچھلا۔ اسی وقت میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر اس کی تشریف پر ایک دھانسو قسم کی لات جمائی۔ ٹی ٹی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور وہ خود لڑکھڑاتا ہوا مخالف سمت میں زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اپنے ریوالور کا رخ اس کے چہرے کی جانب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہری اَپ!''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، شاید اسے اس کایا پلٹ پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی سانسیں اتنی تیز رفتاری سے چل رہی تھیں جیسے ابھی ابھی اولمپک ریس میں حصہ لے کر آیا ہو۔

وہ اٹھ کر وہیں فرش پر بیٹھ گیا، مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں نے کہا ''بدبخت! تم مجھے جانی یا مالی نقصان پہنچانے کی نیت سے مسلح ہو کر میرے گھر میں گھسے ہو۔ تمہارا یہ عمل قابل دخل اندازی پولیس ہے۔ میں ابھی ایک فون کر کے پولیس کو یہاں بلاتا ہوں۔ اٹھو ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں لہرا گئی تاہم وہ میرے حکم پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔ اس کی عمر لگ بھگ بائیس سال ہوگی۔ شکل و صورت واجبی سی تھی۔ اس کے ایک گال پر کسی گہرے زخم کا نشان بھی تھا۔

میں دوسری طرف سے گھوم کر اپنی کرسی پر آ بیٹھا' پھر اپنا جیبی رومال امتیاز کی طرف اچھالتے ہوئے کہا ''امتیاز! ذرا احتیاط کے ساتھ اس رومال کی مدد سے اس کمبخت کا ٹی ٹی اٹھا کر میرے پاس لے آؤ۔'' پھر میں نے نووارد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم ادھر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے امتیاز کے ہاتھ سے مذکورہ ٹی ٹی لے کر اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا' پھر اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا نام ہے تمارا؟''

وہ ہکلایا ''جواد حسین۔''

میں جواد کو اپنے ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے دیوار گیر الماری کی جانب بڑھا پھر وہاں سے ایک ریڈی کیمرا نکال کر اسی پوزیشن میں اس کی دو تین تصویریں اتار لیں۔ وہ بے حد خوفزدہ نظر آنے لگا۔

''وکیل صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ مردہ سی آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے کیمرے کو واپس الماری میں رکھا اور کہا ''تمارا زہر نکال رہا ہوں موذی۔ کچھ سمجھ میں آیا؟''

''مجھے معاف کر دیں وکیل صاحب!'' وہ منت آمیز لہجے میں گڑگڑایا۔ ''میں آپ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔''

میں نے واپس اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا ''تو تم مجھے کسی بڑی کامیابی پر مبارکباد پیش کرنے یہاں آئے تھے.....ٹی ٹی سے مسلح ہو کر! کیوں؟''

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی ''گر آپ وعدہ کریں کہ پولیس کو نہیں بلائیں گے' تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔''

میں نے کہا ''میں ایسا کوئی وعدہ نہ بھی کروں تو تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''تمہارا ٹی ٹی میری تحویل میں ہے۔ اس پر تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔ تمہاری یہ حرکت تخویف مجرمانہ کے ذیل میں آتی ہے۔ تم پر پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ چار سو باون کا اطلاق ہوتا ہے۔ تمہارا ٹی ٹی تمہاری انگلیوں کے نشانات سمیت میرے پاس محفوظ رہے گا۔ اگر تم نے آیندہ کوئی گڑبڑ کی تو میں اسے تمہارے خلاف استعمال کروں گا' پھر تمہیں جیل جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ کیا سمجھے؟''

''جناب! میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' میں نے کہا ''اب تم وہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور میں جو سوال کروں' اس کا سیدھا اور سچا جواب دیتے جاؤ۔''

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ''آپ پوچھیں' کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے امتیاز علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''امتیاز! تم کچن میں جاؤ اور ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا لاؤ۔'' پھر میں جواد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم یہاں کس مقصد سے آئے تھے؟''

''مجھے آپ کو ڈرانے دھمکانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔''

اس نے جواب دیا۔

''کس نے بھیجا تھا؟''

وہ بولا ''میں اس کا نام نہیں جانتا۔ وہ ادھر کشمیر روڈ پر رہتا ہے۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟''

''خداداد کالونی میں۔''

''غلط بیانی تو نہیں کر رہے؟''

''بالکل نہیں جناب!''

میں نے پوچھا ''تمہارے گھر میں ٹیلیفون کی سہولت موجود ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ''فون نمبر بتاؤ۔''

اس نے میری بات کی تعمیل کی۔ میں نے ایک کاغذ پر وہ نمبر نوٹ کرنے کے بعد پوچھا

''تمہارے والد کا نام کیا ہے؟''

''سجاد حسین۔''

''گھر کا نمبر اور ایڈریس وغیرہ بتاؤ۔''

وہ فرفر بولتا چلا گیا۔ میں نے ٹیلیفون کی جانب ہاتھ بڑھایا اور جواد کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ جلدی سے بولا ''اگر آپ میرے والد سے بات کرنا چاہتے ہیں' تو آپ کو کامیابی نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟''

''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''والدہ حیات ہیں؟''

''جی!''

''کوئی بات نہیں۔ میں انہی سے تصدیق کر لوں گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''تمہاری والدہ کا کیا نام ہے؟''

اس نے نام بتا دیا۔ میں نے ڈائلنگ مکمل کرنے کے بعد جواد کی طرف دیکھا اور پوچھا ''خداداد کالونی یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ رات کے اس پہر تمہیں اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا' لیکن.....''

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر ''ہیلو'' کہا تھا۔ میں

اس جانب متوجہ ہوگیا ”ہیلو! میں جواد کا ایک دوست فیصل بات کررہا ہوں۔ ذرا اس سے بات کرا دیں۔“

”جواد بھائی گھر پر نہیں ہیں۔“ وہ یقیناً جواد کی بہن ہوگی۔

میں نے کہا ”آنٹی نزہت فاطمہ ہیں؟“

”امی سو چکی ہیں۔“ ادھر سے کہا گیا ”آپ کو امی سے کام ہے یا جواد بھائی سے؟“ لڑکی کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی۔

میں نے جواب دینے کے بجائے فون بند کردیا۔ میں جو معلوم کرنا چاہتا تھا‘ اس کی تصدیق ہوگئی تھی‘ پھر میں جواد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”ہاں‘ مسٹر جواد! تو تم اس شخص کا نام نہیں جانتے۔ ویسے یہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کشمیر روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا ہے۔“

”تم مجھے کس سلسلے میں دھمکانے آئے تھے؟“

”وہ شخص چاہتا ہے کہ آپ نادر مرڈر کیس میں ملزمہ فہمیدہ کی وکالت سے باز آجائیں۔“ جواد نے بتایا۔

”تم نے اس کام کے لیے کتنا معاوضہ وصول کیا ہے؟“

”ایک ہزار روپے۔“

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا ”اور جاوید احمد کو فون پر دھمکیاں دینے کے کتنے پیسے ملے تھے؟“

”پانچ سو روپے۔“ وہ بے دھیانی میں بول گیا‘ پھر اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں۔“

مجھے ہنسی آگئی ”تم نے کون سی میری خطرناکی دیکھ لی؟“

اسی وقت امتیاز علی ایک ٹرے میں چائے کے دو کپ سجائے اسٹڈی میں داخل ہوا۔ میں نے ایک کپ جواد کی طرف بڑھا دیا ”لو‘ چائے پیو۔“

”سر! آپ بڑے مختلف آدمی ہیں۔ آپ کا تجزیہ اور اندازہ بہت مضبوط اور حافظہ نہایت قوی ہے۔ آپ یقیناً بہت کامیاب وکیل ہوں گے۔“

”اور تم اس کامیاب وکیل کو ٹی ٹی کے بل بوتے پر دھمکانے چلے آئے تھے؟“ میں نے کہا۔

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا ”سر! میں اپنی اس حرکت پر بہت شرمندہ ہوں۔“

میں نے میز کے نیچے لگے ہوئے ایک بٹن کو آف کردیا۔ اس بٹن کا براہِ راست تعلق مائیکرو ریکارڈنگ سسٹم سے تھا۔ میں نے جب جواد سے گفتگو شروع کی تھی تو اس سسٹم کو آن کردیا تھا۔ ہماری تمام گفتگو ریکارڈ ہوچکی تھی۔ میں نے کیسٹ کو ریوائنڈ کرکے جواد کو سنایا۔ وہ ہکا بکا میری طرف

دیکھتا رہا۔ کیسٹ ختم ہوا تو میں نے کہا۔

”جواد! ویسے تو مجھے امید نہیں کہ کسی مرحلے پر تمہاری گواہی کی ضرورت پیش آئے‘ لیکن ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ اس صورت میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا ”میں ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“

میں نے کہا ”اب تم فوراً گھر چلے جاؤ۔ تمہاری امی تمہارا انتظار کرتے کرتے سو چکی ہیں۔ جوان بہن جاگ رہی ہے۔ یاد رکھو‘ جو لوگ اپنے گھریلو فرائض کو نظرانداز کردیتے ہیں‘ سکھ چین ان سے روٹھ جاتا ہے۔ وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر بولا ”سر! آپ کے گھر میں دوسرے لوگ نظر نہیں آرہے۔ آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

”اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ سلام کرکے جانے لگا تو میں نے تاکیدی لہجے میں کہا ”یاد رکھنا‘ تمہیں یہاں بھیجنے والے کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں کیا کچھ ہوا ہے۔ تم اس سے یہی کہنا کہ تم نے اپنا کام ”تسلی بخش“ طریقے سے کردیا ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب! جو آپ کہہ رہے ہیں‘ میں ویسا ہی کروں گا۔“ جواد حسین نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

قادر جان کے بارے میں مجھے شک تو شروع ہی سے تھا‘ لیکن وہ اس حد تک بھی جاسکتا ہے‘ یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ فہمیدہ کی زبانی مجھے جو حالات معلوم ہوئے تھے‘ ان کے مطابق قادر ایک کینہ پرور اور خبیث انسان تھا اور مجھے اس کی خباثت اور کینہ پروری کا پردہ چاک کرنا تھا۔

☆......☆......☆

منظر اسی عدالت کا تھا!

اکیوزڈ باکس میں فہمیدہ اور وٹنس باکس میں مقتول کا چھوٹا بھائی اور اس مقدمے میں استغاثے کا سب سے اہم گواہ قادر جان کھڑا تھا۔ قادر کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس نے سیاہ پتلون پر چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی اور خاصا ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ قادر جان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے دو چار رسمی سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کردی۔ اس کے بعد میری باری آئی۔ میں جج کی اجازت سے قادر جان کے قریب پہنچا اور جرح کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”قادر جان صاحب! سب سے پہلے تو میں آپ کے بھائی کی موت پر افسوس کا اظہار

کروں گا۔ یقیناً یہ آپ کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوگا۔''

اس نے یک لفظی جواب دیا ''شکریہ!''

میں نے پوچھا ''قادر صاحب! میں نے سنا ہے' آپ ایک طویل عرصہ بیرون ملک گزار کر آئے ہیں؟''

''جی ہاں! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔''

''بیرون ملک جانے سے پہلے آپ نے مقتول سے کاروباری معاملات کا حساب صاف کرلیا تھا۔'' میں نے کہا ''جان برادرز'' جو آپ کے والد کی زندگی میں ''جان محمد اینڈ سنز'' ہوا کرتی تھی' اس میں سے آپ نے اپنا حصہ وصول کرلیا تھا اور ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد مقتول نے اکیلے سارا کاروبار سنبھالا اور کمپنی کا نام ''نادر ٹریڈنگ کمپنی'' ہوگیا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''بیرون ملک سے آپ کی واپسی کی وجوہات کیا ہیں؟''

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ''میرے فاضل دوست غیر متعلقہ بحث میں پڑ کر عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

''میں نے کہا ''جناب عالی! اوّل تو میں عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا' دوسرے میں انتہائی متعلقہ معاملات پر بات کر رہا ہوں۔ اگر وکیل استغاثہ ذرا صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں' تو بات ان کی سمجھ میں آجائے گی۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔

میں نے قادر جان سے مخاطب ہوکر کہا ''آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

وہ بولا ''میں بھائی صاحب سے اپنا کاروبار الگ کرکے..... یعنی اپنے حصے کا سرمایہ لے کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے بیرون ملک میں مختلف کام کیے' لیکن کامیابی نہ ہوسکی اور رقم بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی' چنانچہ میں واپس آگیا۔''

''گویا آپ کی واپسی کی وجوہات میں آپ کی ناکامی بھی شامل تھی؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''کیا یہ سچ ہے کہ جب آپ واپس آئے تو مقتول نے خوشدلی سے آپ کو گلے لگایا تھا؟''

''اس میں کوئی شک نہیں۔ بھائی صاحب بہت عظیم انسان تھے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''قادر صاحب! آپ کے بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کی بیوہ پر ان کے قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ اگر بالفرض اس کیس کی ملزمہ اور میری موکلہ فہمیدہ پر جرم ثابت ہوجاتا ہے' تو اس

صورت میں مقتول کی دولت' کاروبار اور جائیداد کے صرف اور صرف آپ ہی وارث ہوں گے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔''

میں نے اگلا سوال کیا ''قادر صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد میں معزز عدالت کے روبرو جو بیان دیا ہے اس میں آپ نے بتایا ہے کہ وقوعہ سے دو روز قبل مقتول کا ملزمہ سے جھگڑا ہوا تھا۔ آپ نے خود ان کی تلخ وترش گفتگو سنی تھی اور آپ نے جھگڑے کی وجوہات پر بھی خاصی روشنی ڈالی ہے یعنی آپ کی بھابی کی بے وفائی وغیرہ وغیرہ....'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''لیکن استغاثہ کے ایک گواہ مقتول کے باورچی عبدالغفور کے بیان سے آپ کے بیان کے ایک حصے کی تردید ہوتی ہے۔ عبدالغفور کے مطابق جھگڑے کے وقت آپ بنگلے پر موجود نہیں تھے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''میں بنگلے پر ہی تھا۔''

''اس کا مطلب ہے' باورچی نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے؟''

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔''

میں نے پوچھا ''قادر صاحب! استغاثہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ میری موکلہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی اور اپنی بے وفائی کی پردہ پوشی کے لیے وہ مانع حمل ادویہ استعمال کرتی تھی۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں استغاثہ کے موقف سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں۔''

''یعنی آپ کو ملزمہ کی بے وفائی کا یقین ہے؟''

''میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے ایک نامحرم سے ملاقاتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' قادر نے پرجوش لہجے میں کہا ''پھر جب مجھے پتا چلا کہ وہ مانع حمل گولیاں استعمال کر رہی ہے تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی' لیکن اس نے انتہائی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرے سے ہر بات کو جھٹلا دیا۔''

''آپ نے میری موکلہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی یا بلیک میل کرنے کی؟''

''آپ جو مرضی سمجھیں۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا ''لیکن میں نے تو اپنے تئیں اسے سمجھانا ہی چاہا تھا۔''

میں نے کہا ''اور جب آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو آپ نے اپنے بھائی صاحب کو صورتحال سے آگاہ کردیا؟''

''یہ تو میرا فرض بنتا تھا۔''

''پھر آپ کے بھائی صاحب نے کیا کیا؟''

''انہوں نے ملزمہ سے بازپرس کی' لیکن ملزمہ ہر بات سے انکاری تھی۔'' قادر نے

جواب دیا ''اس روز لنچ پر ان کے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوا پھر دو روز بعد بھائی صاحب اپنی خواب گاہ میں مردہ پائے گئے۔ اس نامراد بے وفا عورت نے زہریلا دودھ پلا کر ان کی جان لے لی۔''

میں نے پوچھا ''آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میری موکلہ ہی نے آپ کے بھائی کی جان لی ہے؟''

''اور کس قسم کا ثبوت چاہئے آپ کو وکیل صاحب!'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا ''بھائی صاحب اچھے خاصے سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں گئے' صبح جب میں گاڑی کی چابی لینے وہاں پہنچا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بیڈروم میں سے وہ گلاس بھی مل گیا جس پر ملزمہ اور مقتول کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں اور ان گولیوں کی شیشی بھی جو ملزمہ اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے استعمال کرتی تھی۔''

میں نے کہا ''قادر صاحب! آپ میرے ہر سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دیں۔ یاد رہے کہ آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو رہا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر کہا ''قادر صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز اپنے بیڈروم میں جانے سے پہلے مقتول آپ کے کمرے میں تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''جی ہاں! یہ سچ ہے۔''

''مقتول آپ کے کمرے سے کتنے بجے رخصت ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے' اس وقت گیارہ بجے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا ''جب مقتول آپ کے کمرے سے رخصت ہوا' اس وقت اس کی حالت کیسی تھی۔ میرا مطلب ہے' اس نے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار تو نہیں کیا تھا؟''

وہ جلدی سے بولا ''بالکل نہیں جناب! وہ اچھے خاصے ہشاش بشاش میرے کمرے سے نکلے تھے۔''

''آپ کے کمرے میں اس روز آپ دونوں کے بیچ کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

قادر نے بتایا ''ہماری گفتگو کا موضوع بزنس ہی تھا۔''

میں نے پوچھا ''قادر صاحب! آپ چوبیس اکتوبر کی صبح مقتول کے پاس کیا لینے گئے تھے؟''

اس نے میرے سوال کے جواب میں وہ تفصیل دہرائی جو وہ پولیس کے سامنے بیان کر چکا تھا یعنی اپنے کسی دوست کے ساتھ ایئرپورٹ جانے کا قصہ۔ آخر میں اس نے کہا ''میں گاڑی کی چابی لینے بھائی صاحب کے پاس گیا تھا۔''

''پھر آپ کو چابی مل گئی؟''

''نہیں جناب! چابی تو نہیں ملی' البتہ بھائی کی لاش مل گئی۔''

میں نے کہا ''قادر صاحب! آپ نے پولیس کو اپنے بھائی کے بارے میں ایک میڈیکل

ٹیسٹ کی رپورٹ فراہم کی ہے جس کے مطابق وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا یعنی وہ طبی و جسمانی طور پر مکمل صحت مند ہونے کے باوجود بھی صاحب اولاد نہیں ہو سکتا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گے کہ وہ رپورٹ آپ نے کہاں سے حاصل کی؟''

''وہ رپورٹ بھائی صاحب ہی نے مجھے دی تھی۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا ''دراصل چند ماہ قبل ہمارے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی تھی اور میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے مجھے اپنی وہ رپورٹ دکھائی تھی۔ اتفاق سے وہ رپورٹ میرے پاس ہی رکھی رہ گئی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ میرے پاس موجود تھی تو بر وقت کام آ گئی۔''

''بجا فرما رہے ہیں آپ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں اس کی تعریف کی۔ پھر پوچھا ''قادر صاحب! چند ماہ قبل جب آپ دونوں بھائیوں کے درمیان اس نازک موضوع پر گفتگو ہوئی تھی تو اس کا محرک کیا تھا؟''

''محرک!'' وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ''وہ بات دراصل یہ ہے کہ جب میں اپنے حصے کا سرمایہ لے کر ملک سے باہر گیا تو اس وقت تک بھائی صاحب غیر شادی شدہ تھے۔ واپس آیا تو ان کی شادی کو کئی سال گزر چکے تھے' مگر وہ ہنوز اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔ پھر اولاد کے موضوع پر ہم دونوں میں گفتگو ہونے لگی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ بھابی کو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ اگر اس سلسلے میں کسی علاج معالجے کی ضرورت ہو تو وہ بھی ضرور کریں لیکن اولاد کا ہونا بہت ضروری ہے' ورنہ ان کی نسل ختم ہو کر رہ جائے گی۔ میری بات کے جواب میں انہوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بتایا کہ وہ بھابی کا مکمل چیک اپ کروا چکے ہیں۔ اس میں کوئی نقص یا خرابی نہیں ہے۔ وہ ماں بننے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ ان کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا پھر کیا مسئلہ ہے بھائی صاحب! کیا آپ نے اپنے ٹیسٹ بھی کروائے؟ بھائی صاحب نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھے وہ رپورٹ دکھائی جس کے مطابق قدرت نے انہیں اولاد پیدا کرنے والا جرثوموں سے محروم رکھا تھا۔''

قادر کی طویل وضاحت ختم ہوئی تو میں نے کہا ''اور آپ نے موقع ملتے ہی وہ رپورٹ پولیس کے حوالے کر دی تاکہ میری موکلہ کی بے وفائی پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے؟''

وہ بولا ''یہ تو میرا اخلاقی فریضہ تھا۔ میں نے خود اسے نامحرم لوگوں سے ملاقاتیں کرتے دیکھا تھا۔ اگر بھائی صاحب کی رپورٹ صحت مند ہوتی تو ممکن ہے' ملزمہ کو اپنی کوتاہی چھپانے کے لیے گولیوں کا سہارا نہ لینا پڑتا' لیکن یہ اچھا ہوا کہ میں حقیقت حال سے آگاہ ہو گیا۔''

''قادر صاحب! جب آپ نے مقتول کو ملزمہ کی بے وفائی کے بارے میں بتایا تو اس کا ردعمل کیا تھا؟'' میں نے متحمل لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولا ''پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا پھر جب میں نے دلائل و ثبوت کے ساتھ بات کی تو انہیں تسلیم کرنا پڑا۔ انہوں نے جب اس سلسلے میں ملزمہ سے بازپرس کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

ملزمہ کے اس احمقانہ رویے نے بھائی صاحب کو یقین دلایا کہ وہ قصوروار تھی۔"

"قادر صاحب!" میں نے کہا "بیرون ملک سے آپ کو واپس آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"تقریباً دو سال۔"

"مقتول اور ملزمہ کی شادی کو کم و بیش دس سال گزر چکے ہیں۔" میں نے قادر جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور آپ نے بتایا ہے کہ جب آپ بیرون ملک روانہ ہوئے تو اس وقت مقتول غیر شادی شدہ تھا۔ آپ نے کتنا عرصہ ملک سے باہر گزارہ؟"

اس نے جواب دیا "لگ بھگ دس سال۔"

"اس دوران میں آپ کا مقتول سے رابطہ نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا "میرا مطلب ہے آپ دونوں کے درمیان خط وکتابت یا ٹیلیفونک ملاقات کا کوئی سلسلہ نہیں رہا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا اور بتایا "جب میں نے بھائی صاحب سے الگ ہوکر ملک سے باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہیں یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ میرا خیال ہے' اسی ناراضی کی وجہ سے انہوں نے بعد میں بھی مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔"

"یعنی آپ نے تعلق رکھنے کی کوشش کی تھی؟"

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔"

"اس کے باوجود بھی جب آپ اپنا سرمایہ اجاڑ کر واپس وطن آئے تو مقتول سے آپ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی نہ گئی اور اس نے فوراً آپ کی دستگیری کا بیڑا اٹھالیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بھائی صاحب کی عظمت کی دلیل ہے۔"

"ہاں! تمہارے بھائی صاحب واقعی عظیم انسان تھے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ کٹہرے میں کھڑی ہوئی فہمیدہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "مگر اس عورت نے اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے اس عظیم انسان کی جان لے لی۔"

میں نے اس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا "قادر صاحب! کیا آپ کسی جاوید احمد نامی شخص کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا "یہ شخص ملزمہ سے ڈھکے چھپے ملاقاتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں ایک مارکیٹ میں بھی ملتے ہوئے دیکھا تھا اس کے بعد ہی مجھے ملزمہ کے کردار پر شک ہوا تھا۔ آپ سے پہلے جو وکیل صاحب اس کیس کو ڈیل کر رہے تھے انہیں جاوید احمد ہی نے مقرر کیا تھا۔ آج کل وہ نظر نہیں آ رہا۔"

میں نے کہا "آپ کی دھمکی سے ڈر گیا ہوگا؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ ایسے اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو "میں بھلا کسی کو کیوں دھمکی دوں گا؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا آپ جواد حسین نامی کسی نوجوان کو جانتے ہیں؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "عمر لگ بھگ بائیس سال' رنگ گندمی' دبلا پتلا' دراز قد' گال پر گہرے زخم کا نشان؟"

"یہ..... یہ..... آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟" وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا "میں ایسے کسی نوجوان کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "مذکورہ نوجوان جواد حسین خداداد کالونی کا رہنے والا ہے۔ اس کے والد کا انتقال ہوچکا ہے اور....."

"میں نے کہا نا' میں کسی جواد وواد کو نہیں جانتا۔" اس مرتبہ اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ کے بجائے برہمی تھی۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو آیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ وکیل صفائی فضول اور لایعنی باتوں سے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

میں نے پرزور انداز میں کہا "میرے فاضل دوست! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کے گواہ کو ہراساں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر معزز گواہ ہراساں ہوگیا تو میں سوالات کس سے پوچھوں گا۔" ایک لمحے کو رُک کر میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور دوسری بات یہ کہ..... میرے دوست! آپ کے پاس میری باتوں کے فضول' بے مقصد اور لایعنی ہونے کا کیا ثبوت ہے؟"

وہ غصے سے بولا "یہاں نادر جان مرڈر کیس کی ساعت ہورہی ہے۔ یہ جواد حسین بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا؟"

"جواد حسین اس کیس میں ٹپکا نہیں بلکہ جڑا ہوا ہے۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا "اور اس جڑائی کا سہرا استغاثہ کے معزز گواہ قادر جان کے سر بندھتا ہے۔ کچھ آیا' سمجھ میں؟"

وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے قادر جان کی جانب دیکھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟"

"آف کورس یور آنر۔" میں نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا "میں اپنی بات کی تفصیل تو بعد میں مناسب موقع پر بتاؤں گا البتہ ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں۔"

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا "پھر کوئی نیا ڈرامہ شروع۔"

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا "میرے فاضل دوست'

ڈرامہ تو خاصا پرانا ہے۔ میں نے صرف اس کی تشکیل نئے انداز میں کی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ آپ کے معزز گواہ قادر جان نے اس سلسلے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا۔''

وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر شکایت آمیز سوالیہ نظر سے قادر جان کی طرف دیکھا۔ قادر جان اس کی نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جواد حسین کے بارے میں قادر جان نے اپنے وکیل کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اور یہ یقیناً اس کی ایک سنگین غلطی تھی۔ جیسے ڈاکٹر سے مرض چھپانے والا مریض کبھی شفایاب نہیں ہوسکتا' بالکل اسی طرح وکیل سے حقائق چھپانے والا موکل کبھی مقدمہ نہیں جیت سکتا۔

میں نے اپنی فائل میں سے جواد حسین کی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر برآمد کی پھر اسے قادر جان کو دکھاتے ہوئے کہا ''یہ ہے جواد حسین کی تازہ ترین تصویر'' یہ وہی تصویر تھی جو تین روز پیشتر میں نے اپنی اسٹڈی میں اتاری تھی۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے قادر جان سے کہا ''آپ تو اس نوجوان کو قطعاً نہیں جانتے نا؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' مگر ڈھٹائی سے اپنے بیان پر ڈٹا رہا ''ہاں' میں اس جواد حسین نامی شخص کو بالکل نہیں جانتا۔''

''مگر وہ تو آپ کو بخوبی جانتا ہے؟''

''پھر میں کیا کرسکتا ہوں؟'' وہ غصہ آمیز گھبراہٹ سے بولا ''مجھے تو ہزاروں لوگ جانتے ہیں۔ ممکن ہے' ان میں کسی بھنگی چمار کا نام جواد بھی ہو۔ میں غیر اہم لوگوں کے چہرے یاد نہیں رکھتا۔''

میں نے کہا ''جواد حسین کوئی بھنگی ہے نہ چمار اور نہ ہی میرے خیال میں وہ کوئی غیر اہم آدمی ہے۔ آپ ذرا اس کے بارے میں غور تو کریں۔''

''میں نے کہہ دیا نا' میں اس شخص کو نہیں جانتا۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔

''اِٹس او کے؟'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

اس کے بعد میں نے اپنی جیب میں سے قلم نکال کر جواد حسین کی تصویر کے پیچھے یہ تحریر کیا ''میں اس جواد حسین نامی نوجوان کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس سے میرا کوئی تعلق ہے۔'' پھر میں نے وہ تصویر قادر جان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''قادر صاحب! آپ اس تحریر کے نیچے دستخط کر کے تاریخ ڈال دیں۔''

وہ متذبذب انداز میں کبھی تصویر کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے غصہ دلانے والے لہجے میں کہا ''شاید آپ کی یادداشت واپس آ رہی ہے کیا آپ جواد حسین سے اپنی شناسائی کا اعلان کرنے والے ہیں؟''

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور تصویر کی پشت پر میری تحریر کے نیچے دستخط کر کے تاریخ درج کردی۔ میں نے قادر جان کے ہاتھ سے وہ تصویر لے لی' پھر جج کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس تصویر کو بطور ریکارڈ فائل میں شامل کرلیا جائے۔''

جج نے میرے ہاتھ سے وہ تصویر لے کر بغور اس کا جائزہ لیا پھر اسے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کے درمیان رکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

''بیگ صاحب! آپ گواہ سے اور کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے مودبانہ لہجے میں کہا ''میری جرح مکمل ہوچکی ہے یور آنر۔''

اس کے بعد جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو وکیل استغاثہ نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے میں نے اس کی بکری چرالی ہو۔ میں اس کی نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

اس روز جاوید احمد عدالت نہیں گیا تھا اور ایسا اس نے میری ہدایت پر ہی کیا تھا۔ اس دن قادر جان کا بیان ہونا تھا اور میں ایک خاص مقصد کے تحت ابھی ان کا سامنا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے جاوید کو تاکید کردی تھی کہ وہ شام کو میرے دفتر ضرور آئے۔

حسب وعدہ وہ میرے دفتر آیا تو میں نے اسے اس روز کی عدالتی کارروائی سے آگاہ کیا۔ جواد حسین کا قصہ سنکر وہ پھڑک اٹھا۔

''بیگ صاحب! آپ نے یہ کیا نئی پھلجھڑی چھوڑ دی ہے؟''

''یہ پھلجھڑی نہیں' بلکہ حقیقت ہے۔''

''لیکن آپ نے پہلے تو اس کا ذکر نہیں کیا؟''

میں نے کہا ''یہ تین روز پہلے ہی میرے قابو میں آیا ہے۔''

پھر میں نے جاوید کو تین روز قبل اپنی اسٹڈی میں پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتایا۔ وہ حیرت بھری نظر سے پوری تفصیل سنتا رہا' پھر بولا۔

''یہ تو آپ نے کمال کردیا بیگ صاحب۔''

میں نے کہا ''اسے کہتے ہیں' لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔''

''ہاں' بالکل۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا ''آپ جواد کو ایک گواہ کے طور پر بھی پیش کرسکتے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کچھ رقم بھی خرچ کرنا پڑے تو میں ہاتھ نہیں روکوں گا۔''

میں نے کہا ''اوّل تو رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ میں نے اچھی طرح اس کا ''کام'' کردیا ہے۔ بالفرض اگر جواد نے منہ کھولا بھی تو اسے کچھ نہ کچھ دے دیں گے۔''

جاوید نے کہا ''ضرور' ضرور۔ جواد کو تھوڑی بہت رقم میں ضرور دوں گا۔ ایک غلط کام کے لیے جب اسے پندرہ سو روپے معاوضہ ملا تھا' تو ایک نیک کام کے لیے تو اس سے کچھ زیادہ ہی ملنا چاہیے۔''

''جو دل چاہے' اسے دے دیجئے گا۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

جاوید نے سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”بیگ صاحب! آپ نے آج کی کارروائی میں جواد حسین کو ایکسپوز کر دیا ہے۔ اب یقیناً قادر جان اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں‘ میں نے اس کا بھی بندوبست کر دیا ہے۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”جواد حسین آج صبح ہی میری ہدایت پر اپنی خالہ کے یہاں سکھر روانہ ہو گیا ہے۔ قادر جان اس کی گرد بھی نہیں پا سکے گا۔ جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی‘ میں بلا لوں گا۔“

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔“ جاوید نے کہا پھر تشویش آمیز لہجے میں بولا ”قادر‘ جواد کی والدہ اور بہن وغیرہ کو تو تنگ کر سکتا ہے۔“

”بہن اور والدہ جواد کے ساتھ ہی سکھر گئی ہیں۔“ میں نے کہا۔

جاوید مطمئن ہو گیا۔ پھر کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھنے لگا ”بیگ صاحب! آپ نے ابھی تک جرح کے دوران میں وہ خاص پوائنٹ تو اٹھایا ہی نہیں جس کا ذکر فہمیدہ نے کیا تھا؟“

میں نے کہا ”خاص پوائنٹ تو خاص موقع پر ہی اٹھایا جائے گا نا!“

”تو آپ کے خیال میں ابھی وہ خاص موقع نہیں آیا؟“

”ابھی تو میری موکلہ کا بیان ہونا ہے۔“ میں نے بتایا ”اس کے بعد میں ترتیب وار ساری باتیں سامنے لاؤں گا۔ ویسے میں نے استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں وہ ”ٹیپس“ تیار کر لیے ہیں‘ جہاں مجھے اپنے من پسند ”اسٹروکس“ کھیلنا ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مجھے آپ سے یہی امید تھی بیگ صاحب!“ وہ مسرور لہجے میں بولا۔

پھر کچھ دیر تک ہمارے درمیان اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد جاوید احمد میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

O ☆ O

اگلی پیشی پر سب سے پہلے اس مقدمے کی ملزمہ اور میری موکلہ کا تفصیلی بیان ہوا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے ایک طویل جرح کی۔ فہمیدہ نے میری ہدایت کے مطابق وکیل استغاثہ کے ہر سوال کا جواب دیا۔ وکیل استغاثہ مختلف حیلوں وسیلوں سے فہمیدہ کی زبان سے کوئی ایسی بات اگلوانے کی کوشش کرتا رہا‘ جو اس کے کردار کو داغدار کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہو لیکن میں نے جو اہم پوائنٹس اسے ذہن نشین کرائے تھے‘ انہیں اس نے کسی بھی مرحلے پر فراموش نہیں کیا تھا۔

وکیل استغاثہ کے بعد میں نے ملزمہ سے چند سوالات کیے‘ جن میں سب سے اہم سوال وقوعہ سے دو روز قبل ہونے والے جھگڑے سے متعلق تھا۔ میں نے پوچھا۔

”فہمیدہ صاحبہ! استغاثہ کا پورا زور اس بات پر ہے کہ وقوعہ سے دو روز قبل یعنی بائیس اکتوبر کی دوپہر‘ لنچ کی میز پر آپ کا اپنے شوہر سے کوئی شدید جھگڑا ہوا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

فہمیدہ نے کہا ”استغاثہ کے اس دعوے میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔ چھوٹی موٹی نوک جھوک کی بات الگ ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں ہمارے درمیان کبھی کوئی سنگین لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ وقوعہ سے دو روز قبل بھی ہم نے نہایت ہی اطمینان سے اور حسب معمول لنچ کیا تھا۔“

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔“ اتنا کہہ کر میں اپنی مخصوص نشست پر آ بیٹھا۔

وکیل استغاثہ نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”یور آنر! میرے فاضل دوست نے صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کے کیا ارادے ہیں؟“

جج نے میری طرف ایسی نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو.... ہاں بھئی بیگ صاحب! بتائیں آپ کے کیا ارادے ہیں؟

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عرض کیا ”جناب عالی! صفائی کے گواہوں کی فہرست میں نے اس لیے داخل نہیں کی کہ اس سے عدالتی کارروائی میں روک پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ اب مقدمہ اس رُخ پر آ گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو میں چند معزز پیشہ افراد کو یہاں آنے کی زحمت ضرور دوں گا‘ لیکن اس سے پہلے میں معزز عدالت کے علم میں‘ ایک جائزہ پیش کر کے چند اہم باتیں لانا چاہتا ہوں۔“

”کس قسم کا جائزہ بیگ صاحب؟“ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا ”یور آنر! میری موکلہ بے قصور اور بے گناہ ہے۔ اس نے اپنے شوہر نادر جان کو قتل نہیں کیا بلکہ باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ میں....“

”آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“ وکیل استغاثہ نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا ”آپ نے اپنے موقف کے ذیل میں ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت معزز عدالت میں پیش نہیں کیا۔“

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے وکیل سرکار کو دیکھا اور کہا ”مائی ڈیئر کونسلر میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔“ پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! استغاثہ کے تمام گواہوں کے بیانات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ میری موکلہ ایک بیوفا عورت تھی۔ اپنی بے وفائی کی پردہ پوشی کے لیے وہ مانع حمل ادویہ استعمال کرتی رہی۔ جب اس کی بے وفائی کا راز مقتول پر کھلا اور اس نے ملزمہ سے بازپرس کی تو ان کے درمیان ایک شدید قسم کا جھگڑا ہوا۔ نتیجتاً دو روز بعد ملزمہ نے مقتول کو دودھ میں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔“

ایک لمحے کو رُک کر میں نے باری باری جج اور وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا ”اس کے ساتھ ہی استغاثہ کے سب سے اہم گواہ مقتول کے بھائی قادر جان نے نہ صرف انکشاف کیا‘ بلکہ میڈیکل

رپورٹ کی صورت میں ایک ثبوت بھی پولیس کو فراہم کر دیا کہ مقتول باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ یہ میری موکلہ کی بے وفائی پر مہر تصدیق ثبت کرنے والی بات تھی' جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

میں نے ڈرامائی انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا' وہ جلدی سے بول اٹھا ''تو حقیقت کیا ہے' ذرا یہ بھی بتا دیں؟''

''ضرور' ضرور'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا ''جناب! حقیقت یہ ہے کہ میری موکلہ بے وفا تھی' نہ وہ مانع حمل ادویہ استعمال کرتی تھی اور نہ ہی مقتول کسی ایسی طبی محرومی کا شکار تھا کہ باپ نہ بن سکتا۔ میری موکلہ کی آوارگی اور مقتول کی ناکارگی سوائے بے بنیاد الزامات کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور..... اور اس بات میں بھی کوئی سچائی نہیں کہ وقوعہ سے دو روز قبل میاں بیوی میں طوفانی قسم کا کوئی جھگڑا ہوا تھا۔''

میں خاموش ہوا تو جج نے دلچسپی آمیز حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا ''بیگ صاحب! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں نے کہا ''جناب عالی! کسی انکشاف سے پہلے میں استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کی طرف آتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''یور آنر! استغاثہ کی گواہ گھریلو ملازمہ برکت بی بی کے بیان کے مطابق' اس نے مقتول اور ملزمہ کو جھگڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا' بلکہ یہ بات اسے باورچی عبدالغفور نے بتائی تھی پھر اس نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں مانع حمل گولیوں والی شیشی کو شناخت کیا ہے۔ اس شناخت سے کسی بھی طور یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ واقعی میری موکلہ کے استعمال میں تھی۔ کوئی بھی سازشی شخص ایسا تاثر قائم کرنے کے لیے مذکورہ دوا کی خالی شیشی کچرے میں پھینک سکتا ہے۔ برکت بی بی کو نہ تو جھگڑے کی وجہ معلوم ہے اور نہ ہی اس نے اپنی آنکھوں سے میاں بیوی کو جھگڑتے ہوئے دیکھا..... اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ جس خالی شیشی کے بارے میں اس سے تصدیق کی جا رہی ہے' وہ دوا کس مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

''جناب عالی! اب گواہ عبدالغفور کے بیان کو لے لیجیے۔ گواہ' مقتول اور ملزمہ کے جھگڑے کو دیکھنے اور چھپ کر ان کی باتیں سننے کا دعویدار ہے۔ اس کے مطابق مقتول ملزمہ کی بے وفائی پر اس سے باز پرس کر رہا تھا' حالانکہ نہ تو میری موکلہ بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی اور نہ ہی اس روز ان کے مابین کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ ازیں علاوہ عبدالغفور نے بتایا ہے کہ اس موقع پر قادر جان گھر میں موجود نہیں تھا' جبکہ قادر جان کا دعویٰ ہے کہ وہ جھگڑے کے وقت بنگلے میں ہی موجود تھا۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں میں سے ایک گواہ دروغ گوئی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔''

میں نے دیکھا' وکیل استغاثہ کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر اپنے دلائل جاری رکھے اور جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے

کہا۔

''جناب عالی! اس مقدمے کے تفتیشی افسر سب انسپکٹر فضل داد نے بتایا ہے کہ مقتول کی ناکارگی کی میڈیکل ٹیسٹ رپورٹ گواہ قادر جان نے انہیں مہیا کی تھی۔ جس کی تصدیق کرنے کی انہوں نے زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ بہت ضروری تھا۔ مقدمے کی فائل میں مذکورہ رپورٹ موجود ہے۔ اس رپورٹ پر درج تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ مقتول نے وہ ٹیسٹ وقوعہ سے آٹھ ماہ پہلے کروایا تھا۔ یہ بات ناقابل فہم ہے۔ مقتول کی شادی کو کم و بیش دس سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ منطقی طور پر ایسے ٹیسٹ عموماً شادی کے بعد دو چار سال میں کروا لیے جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ مقتول نے وہ ٹیسٹ شادی کے نو' ساڑھے نو سال بعد میں کروایا تھا۔''

چند لمحات کے توقف کے بعد میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''جناب عالی! دیگر گواہوں کی طرح استغاثہ کے نہایت ہی اہم گواہ قادر جان کے بیان میں بھی بہت سی خامیاں بہ الفاظ دیگر ''دروغ'' موجود ہیں۔ گواہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے میری موکلہ کو بے وفائی کا ارتکاب کرتے ہوئے خود دیکھا تھا۔ جب وہ کسی نامحرم شخص سے ملاقات کر رہی تھی پھر اس نے وقوعہ سے دو روز قبل مقتولہ اور ملزمہ کے مابین جھگڑے کی تصدیق بھی کی ہے جبکہ گواہ عبدالغفور کے مطابق قادر جان اس وقت موقع پر موجود ہی نہیں تھا۔ اس تضاد سے دونوں میں سے کسی ایک گواہ کے دروغ گو ہونے کا پتا چلتا ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے یور آنر جس میں میری بے گناہ موکلہ کو پھانسا گیا ہے اور میں......''

وکیل استغاثہ نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی اور بیچ میں بول اٹھا ''جناب عالی! وکیل صفائی ایک درجن مرتبہ ملزمہ کو بے گناہ' بے قصور' معصوم اور مظلوم گردان چکے ہیں لیکن ابھی تک اس سلسلے میں انہوں نے ایک بھی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ اس لمبی چوڑی تقریر سے آخر ان کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''میرے فاضل دوست! اس تقریر سے میرا صرف ایک مقصد ہے' اپنی موکلہ کی بے گناہی ثابت کرنا اور...... یہ بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ میں پہلے معزز عدالت کے سامنے اپنی موکلہ کی وفاداری' مقتول کی ''اہلیت'' ثابت کروں اور اس سازش کا انکشاف کروں جس کے تحت میری موکلہ کو ایک قاتلہ کی حیثیت سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا ہے۔''

''تو پھر انتظار کس بات کا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ''اگر اس سلسلے میں آپ کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں تو معزز عدالت کے سامنے پیش کریں۔''

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بیگ صاحب! آپ کون سے ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اپنی فائل سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھا دیے۔ وہ مقتول اور ملزمہ

کی مختلف میڈیکل رپورٹس تھیں جن کو جمع کرنے میں مجھے خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔ فہمیدہ اور دیگر متعلقہ افراد کے تعاون سے بہرحال میں وہ تمام اہم کاغذات اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ جج نے ان کاغذات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میری جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولنا شروع کیا۔

''جناب عالی! اس سرگزشت کا آغاز کم و بیش آٹھ سال پہلے ہوتا ہے۔ شادی کے دو سال بعد تک بھی جب مقتول کے آنگن میں کوئی پھول نہ کھلا تو ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا' جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ مقتول نے اپنی بیوی' ملزمہ فہمیدہ کو ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر سلطانہ فرید کو دکھایا۔ کسی قسم کے علاج معالجے سے قبل لیڈی ڈاکٹر نے دونوں میاں بیوی کے کچھ لیبارٹری ٹیسٹ کروائے۔ ان ٹیسٹس کے نتیجے میں مقتول کو میڈیکلی فٹ قرار دیا گیا۔ وہ باپ بننے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا تاہم ملزمہ کے ایک ٹیسٹ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے یوٹرس میں چند فائبرائڈز (Fibroids) موجود تھے۔ فائبرائڈز یعنی ریشے دار رسولیاں۔ تین ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹر سلطانہ فرید نے ملزمہ کو مشورہ دیا کہ وہ فائبرائڈز کو آپریٹ کروالے۔ ڈاکٹر کے خیال میں وہ رسولیاں قرار حمل میں رکاوٹ بن رہی تھیں (واضح رہے کہ اس زمانے میں ''آئی یو آئی' آئی وی ایف اور اے آئی ایچ'' جیسے غیر فطری طریقہ ہائے قرار حمل ابھی پاکستان میں متعارف نہیں ہوئے تھے۔ آجکل اس کا رواج عام ہے۔

''ملزمہ نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا اور ایک چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے رحم کی رسولیوں سے نجات حاصل کر لی۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اس سلسلے کی تمام رپورٹس انہی کاغذات میں شامل ہیں۔ شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس آپریشن کے باوجود بھی ملزمہ کی گود ہری نہ ہوسکی۔ مزید ایک سال کے علاج معالجے کے بعد وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ ایسے معاملات میں مرد کو عموماً صبر آ جاتا ہے لیکن عورت اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہے خاص طور پر ایسی صورت میں جب اسے پتا چل جائے کہ خرابی اس کے اندر ہے۔

''ایک سال کے وقفے کے بعد ڈاکٹروں کے کلینکس کے چکر لگنے لگے۔ اس بھاگ دوڑ میں ایک دن یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ ملزمہ ''کارسی نوما'' یعنی سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ (Carcinoma) بذات خود ایک وحشت ناک لفظ ہے جو مریض کو ادھ موا کر دیتا ہے۔ شہر کے ایک معتبر آن کالوجسٹ (On cologist) کی رپورٹ کے مطابق ملزمہ کے یوٹرس میں ایک ٹیومر بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ماہر سرطان ڈاکٹر مبشر زیدی نے ملزمہ کے یوٹرائن ٹیومر کے علاج کے سلسلے میں چند ماہ کیموتھراپی کی پھر مایوس ہونے کے بعد آپریشن تجویز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی باور کروا دیا کہ آپریشن کوئی حتمی علاج نہیں ہے۔ زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ ملزمہ کا یوٹرس ہی نکال دیا جائے۔

''آن کالوجسٹ مبشر زیدی کے بعد چند دیگر ماہرین سے مشورہ کیا گیا۔ جب سب نے

مبشر زیدی کے مشورے پر صاد کیا تو بہ حالت مجبوری مقتول کو اپنی بیوی کا آپریشن کروانا پڑا۔ تین' ساڑھے تین سال قبل میری موکلہ کو یوٹرس سے محروم کر دیا گیا۔''

یہاں پر پہنچ کر میں ایک دم خاموش ہوگیا۔ عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ جس طرح شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی بالکل اسی طرح عدالت میں بھی ہر بات کھلے ڈلے انداز میں کی جاتی ہے۔ مجرمانہ حملے کے کیسوں میں تو جرح کے دوران میں اس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ انہیں ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔

جج تھوڑی دیر تک میری فراہم کردہ رپورٹس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ اس کی الجھن آمیز پریشانی قابل دید تھی۔ جج میری جانب متوجہ ہوا تو میں نے کہنا شروع کیا۔

''یور آنر! ایک ایسی عورت جسے رحم (Uterus) جیسے انتہائی اہم عضو سے محروم کر دیا گیا ہو اس کے پاس مانع حمل گولیوں کے استعمال کا جواز کیا رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مانع حمل گولیوں والا ڈرامہ اور مقتول کی ناکارگی کی رپورٹ اسی گہری سازش کا ایک حصہ ہے جس کے تحت میری موکلہ کو اپنے شوہر کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا ''یور آنر! میری موکلہ بے گناہ ہے۔ اس لئے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ سنجیدگی سے فہمیدہ کی رہائی کے بارے میں غور کرے۔''

''وکیل استغاثہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''میرے فاضل دوست! میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق شیشے کے گلاس پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں اور پوسٹ مارٹم سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مقتول کے معدے میں پائے جانے والے زہر اور دودھ کے گلاس میں موجود زہر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں پوسٹ مارٹم اور میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹس کی تردید نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا ''مقتول کی موت واقعی زہریلا دودھ پینے سے واقع ہوئی ہوگی لیکن اس کی ذمے دار میری موکلہ نہیں ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''یہ میں ایسے کہہ سکتا ہوں کہ میری موکلہ کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''استغاثہ نے حالانکہ ایسا جواز پیش کیا ہے جو اب طفلانہ بلکہ احمقانہ ثابت ہو رہا ہے۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا وکیل استغاثہ صاحب؟'' ایک لمحے کو رک کر میں نے طنزیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور کہا ''میری موکلہ پر الزام ہے کہ اس نے مانع حمل گولیوں کے استعمال سے اپنی بے وفائی چھپانے کی کوشش کی لیکن حقیقت اب آپ کے سامنے ہے پھر جس سنگین جھگڑے کا تذکرہ کیا گیا ہے' اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ باورچی عبدالغفور اور مقتول کے بھائی قادر جان نے

جھگڑے کی تصدیق کی ہے۔ یہ دونوں گواہ دروغ گو ثابت ہو رہے ہیں۔ قادر جان نے پولیس کو جو نقلی رپورٹ فراہم کی ہے اس کے بعد کیا آپ اسے نہایت ہی معتبر انسان سمجھ رہے ہیں۔''

وہ متذبذب انداز میں بولا ''ابھی تک اس رپورٹ کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکا۔''

میں نے کہا ''میں نے ابھی معزز عدالت کو مقتول اور ملزمہ کی جو میڈیکل رپورٹس پیش کی ہیں' ان کے مقابلے میں گواہ قادر جان کی فراہم کردہ رپورٹ باطل ہو جاتی ہے بلکہ اس کا پورا بیان ہی جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوتا ہے۔''

پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا ''یور آنر! میرے فراہم کردہ ثبوتوں اور حالات و واقعات کی روشنی میں میری موکلہ کے خلاف دائر استغاثہ جھوٹ کے پلندے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نے آن کالوجسٹ ڈاکٹر مبشر زیدی اور گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر سلطانہ فرید سے بات کر لی ہے۔ اگر معزز عدالت کا حکم ہو تو میں انہیں گواہی کیلئے بھی پیش کر دوں گا۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ''جناب عالی! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا' پڑھے لکھے کو فارسی کیا...... کے مصداق میری موکلہ اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ کسی بھی ڈایا گنوسٹک سنٹر سے اس کی سونوگرافی کروائی جا سکتی ہے۔ الٹرا ساؤنڈ رپورٹ سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

جج نے ہونٹوں کو سکیڑ کر معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ میں نے کہا ''جناب عالی! اس کے ساتھ ہی معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ دروغ گوئی کے شہنشاہ استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے چھوٹے بھائی قادر جان کو بھی شامل تفتیش کرنے کے احکامات جاری کیے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر پولیس اس پر ''طبع آزمائی'' کرے تو نادر جان قتل کے سلسلے میں حقائق کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔''

جج نے انکوائری افسر کو ہدایت کی کہ وہ گواہ قادر جان کو شامل تفتیش کر کے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرے پھر مجھ سے کہا ''بیگ صاحب! آپ آئندہ پیشی پر مذکورہ ڈاکٹر صاحبان کو گواہی کیلئے پیش کریں۔''

میں نے کہا ''یور آنر!'' معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ کوئی نزدیکی تاریخ دی جائے تاکہ جلد از جلد اس کیس کو نمٹایا جا سکے۔''

جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆......☆......☆

آئندہ پیشی پر میں نے ڈاکٹر سلطانہ فرید اور آن کالوجسٹ مبشر زیدی کو عدالت میں پیش کر کے جج کے روبرو گواہی دلوا دی۔ اس دوران میں میری موکلہ کی تازہ ترین الٹرا ساؤنڈ رپورٹ بھی آ گئی تھی۔ مجھے اپنے موقف کو ثابت کرنے کیلئے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تاہم اس موقع پر ایک دلچسپ انکشاف ہوا۔

انکوائری افسر نے اطلاع دی کہ استغاثہ کا گواہ قادر جان اچانک منظر سے غائب ہو گیا

تھا۔ قادر کی اس حرکت نے اس کی ذات کو مشکوک شبہات کی دبیز چادر میں لپیٹ دیا۔ آئی او کا انکشاف سن کر جج برہم ہو گیا تھا۔

جج نے انکوائری افسر کو حکم دیا کہ وہ جلد از جلد قادر جان کو گرفتار کر کے نئے سرے سے تفتیش کرے اور عرصہ پندرہ یوم کے اندر اندر نیا چالان عدالت میں پیش کرے پھر جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ نے جواد حسین نامی ایک نوجوان کی تصویر میرے پاس رکھوائی تھی۔ وہ کیا سلسلہ ہے' آپ نے ابھی تک وضاحت نہیں کی؟''

میں نے کوٹ کی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''آج میں اس کی بھی وضاحت کا انتظام کر کے آیا ہوں۔ بڑا دلچسپ قصہ ہے یور آنر۔''

پھر میں نے کوٹ کی جیب سے ایک ہینڈی کیسٹ پلیئر برآمد کیا اور اپنی سٹڈی میں ریکارڈ کی جانے والی گفتگو بھری عدالت میں جج کو سنائی۔ جواد حسین اور میرے درمیان ہونے والی باتیں سن کر ساری حقیقت جج کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کے بعد میں نے وہ واقعہ تفصیلاً بتانے کے بعد کہا۔

''جناب عالی! اگر معزز عدالت کا حکم ہو تو میں جواد حسین کو بھی گواہی کیلئے عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

جج نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لیکن جواد حسین کو عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ دو روز بعد پولیس نے قادر جان کو اس کے ایک دوست کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ پولیس کی کسٹڈی میں ایک رات گزارنے کے دوران ہی میں اس نے سب کچھ اگل دیا۔ قادر جان نے اپنے بڑے بھائی کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکلہ فہمیدہ کو باعزت بری کر دیا۔

چلتے چلتے قادر جان کے بارے میں چند ضروری باتیں بھی بیان کر دوں۔ قادر جان نے اپنے بھائی کی تمام دولت' جائیداد اور کاروبار ہڑپ کرنے کیلئے ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ اس قتل کے الزام میں اس کی بھاوج کو پھانسی ہو جائے۔

قادر جان کی کمینگی' احسان فراموشی اور بدذاتی کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہوئے میں صرف آپ کو یہ بتاؤں گا کہ اس نے کس طرح اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ وقوعہ کی رات مقتول اپنے بیڈ روم میں جانے سے پہلے قادر جان کے کمرے میں تھا۔ قادر جان نے مقتول کو ایک کیپسول کھانے کو دیا اور کہا کہ یہ ہائی بلڈ پریشر میں بہت مفید ثابت ہو گا۔ نادر جان ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا اور اس کیلئے باقاعدگی سے گولی بھی کھاتا تھا۔ اس نے قادر جان کے کہنے پر مذکورہ کیپسول پانی کے گھونٹ سے نگل لیا۔

اس کیپسول میں قادر جان نے ایک سریع الاثر زہریلی دوا بھری ہوئی تھی۔ قادر اس با
سے آگاہ تھا کہ مقتول سونے سے پہلے دودھ پینے کا عادی تھا۔ اگلی صبح وہ مقتول کے بیڈروم میں پہ
بہانہ گاڑی کی چابی لینے کا تھا حالانکہ وہ اپنے منصوبے کے آخری حصے کی تکمیل کیلئے وہاں پہنچا
فہمیدہ کو باتوں میں الجھا کر اس کی بے خبری میں قادر جان نے دودھ کے استعمال شدہ گلاس میں
اسی زہریلے سفوف کی قلیل مقدار ڈال دی۔ قادر کو یقین تھا کہ اس گلاس پر فہمیدہ کی انگلیوں
نشانات ثبت ہوں گے۔ فہمیدہ کی بے وفائی اور اس کے مانع حمل گولیوں کے استعمال کو ثابت کر
کیلئے اس نے بھائی کی جعلی میڈیکل ٹیسٹ رپورٹ کا بھی سہارا لیا۔

ذہین سے ذہین مجرم بھی اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سراغ ضرور چھوڑتا ہے۔ اگرچہ قادر جا
نے بڑا جامع منصوبہ بنایا تھا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ دوسری جانب قدرت بھی مصروف عمل تھی۔
فہمیدہ کی میڈیکل رپورٹس سے بے خبر تھا چنانچہ اس نے فہمیدہ کو پھانسنے کیلئے جو جال پھیلایا تھا
ہی اس میں گرفتار ہوگیا۔

جھوٹ اور جرم زیادہ دیر تک پھیلتے نہیں ہیں۔ اللہ کی پکڑ اور جکڑ بڑی سخت ہے۔ جب
انصاف کرنے پر آتا ہے تو قادر جان جیسے مار آستین ناہنجار اسی طرح اپنے عبرت ناک انجام کو
ہیں۔

☆......☆......☆

بے ترتیب

حقیقی خوشی کا حصول بہت سہل ہے!

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ اتنی بڑی بات میں نے کتنی آسانی سے کہہ دی۔ جی
ات بڑی ہو یا چھوٹی، سادہ و پرکار الفاظ ہی میں بیان کرنا چاہئے۔ سچی خوشی درحقیقت وہ روحانی
ری ہے جس سے بہت کم افراد روشناس ہیں۔ یہ روشنی انسان کے اندرون سے پھوٹتی ہے اور اس
ے بدل کو حاصل کرنے کے لئے کڑی محنت یا کسی خاص مشقت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم عموماً مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند میں خوشیوں کو تلاشتے ہیں۔ دولت کی طاقت اور
ہ کاری سے انکار ممکن نہیں۔ بے شک یہ انسان کے لئے بہت سی آسانیاں اور آسائشیں فراہم کر
ہے۔ اسی طرح رشتہ و پیوند کی حقیقت اور سماجی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر یہ سب کچھ بتان وہم و
ا ہیں جو اگر ایک طرف ذہنی آسودگی اور عارضی خوشیاں مہیا کرتے ہیں تو دوسری جانب دائمی
ا سے بھی نوازتے ہیں۔ بے انتہا دولت مند اور صاحب اختیار افراد میں سے کتنے ایسے ہیں جو
سے خوش ہوں!

دلی مسرت کا راز الفاظ کے مناسب استعمال میں مضمر ہے جس طرح حرکات و سکنات
انسان کی جسمانی حالت اور جسمانی حالت سے اس کی صحت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اسی طور
کے استعمال سے انسان کے اخلاق اور اخلاق سے اس کے کردار کا اظہار ہوتا ہے، گویا الفاظ کی
سے انسان کے قول کا حال کھلتا ہے اور اس کے فعل کی سمت کا تعین ہوتا ہے چنانچہ موزوں الفاظ
ہتاؤ میں احتیاط لازم ہے۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس آتا ہے، نہ شیشے میں آیا ہوا بال نکل سکتا
ر نہ ہی الفاظ کا گھاؤ، کسی بھی صورت مندمل ہوتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ خوشیاں آپ کے قدموں کی زمین بن جائیں تو خود سے وابستہ
کے احساسات و جذبات سے مت کھیلیں۔ یاد رکھیں۔ ایک ظالم، ناانصاف اور دوسروں کی دل
ی کرنے والا شخص سکون کی دولت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ اکتوبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں حسب معمول اپنے دفتر میں موجود تھا کہ دو عورتیں میرے چیمبر میں داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ ایک چار پانچ سالہ بچی بھی تھی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔

وہ دونوں بیٹھ گئیں تو ان میں سے ایک عورت نے پوچھا "آپ مرزا امجد بیگ ہی ہیں نا...... وہی جو وکیل ہیں؟"

"جی بالکل۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا "میں ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں۔ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہی عورت گویا ہوئی جس نے پہلے سوال کیا تھا "میرا نام عارفہ ہے۔ یہ میرے ساتھ سلمیٰ ہیں...... میری پڑوسن۔ ہم ایک بہت ضروری کام سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ بس یوں سمجھیں کام تو میرا ہی ہے۔ سلمیٰ تو بس سہارے کے طور پر میرے ساتھ آئی ہے۔ مجھے حور بانو نے آپ کے دفتر کا پتا بتایا تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے۔"

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا "عارفہ صاحبہ! حور بانو کون ذات شریفہ ہیں؟"

"کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟"

"معاف کیجئے گا، اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "ذرا تفصیلی تعارف کروائیں۔"

عارفہ کی ساتھی عورت سلمیٰ نے جلدی سے کہا "وکیل صاحب! عارفہ اس حور بانو کا ذکر کر رہی ہے جس کا مقدمہ آپ نے جیتا تھا۔ جب وہ محمود آباد میں رہتی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا، حور بانو کے دیور نے اس کی بچی کو اغوا کر لیا تھا اور ان کے مکان پر قبضہ کر بیٹھا تھا۔"

"ہاں ہاں، یاد آ گیا۔" میں نے پیشانی سہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا "کیا حور بانو اب محمود آباد میں نہیں رہتی؟"

"نہیں جناب، وہ کافی عرصہ پہلے اپنا مکان بیچ کر گارڈن کے علاقے میں جا چکی ہے۔" عارفہ نے بتایا "آج فون پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے فوراً آپ سے ملنے کو کہا تھا۔"

حور بانو کا کیس مجھے یاد آ گیا تھا۔ وہ حسین وجمیل مظلوم عورت اپنے دیور کے ہاتھوں بہت ستم اٹھا چکی تھی۔ اس کے دیور رجب علی کی کارستانی نے حور بانو کے شوہر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا تھا۔ ازاں بعد شقی القلب رجب علی نے اپنی سگی بھتیجی فوزیہ کو غنڈوں کی مدد سے اغوا کرا لیا تھا اور اپنے بھائی کے مکان پر قبضہ کرنے کی بہت کامیاب منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اچانک میری انٹری نے اس کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتا

اس کیس کی کامیابی میں میری کوششوں کے ساتھ ساتھ حور بانو کا بھی پورا ہاتھ تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ تمام واقعات میرے تصور کی نگاہ کے سامنے سے گزر گئے۔ قارئین کو بھی حور بانو کی کہانی یاد ہوگی!

میں نے عارفہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ جس کام کے سلسلے میں میرے پاس آئی ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ بولی "میرا شوہر جیل میں بند ہے۔"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر استفسار کیا "کس جرم میں؟"

"جرم بے گناہی میں۔" اس کے لہجے میں اداسی بھری ہوئی تھی۔

میں نے کہا "میں کچھ سمجھا نہیں خاتون؟"

وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی "جہانگیر پر قتل کا الزام ہے۔"

جہانگیر یقیناً اس کے شوہر کا نام تھا۔ میں نے پوچھا "وہ کب سے جیل میں بند ہے؟"

"تقریباً دو ہفتے سے۔" عارفہ نے جواب دیا۔

"قتل کون ہوا ہے؟"

"جہانگیر کا باس۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولی "اس فیکٹری کا مالک فرقان حمیدی جہاں جہانگیر کام کرتا تھا۔"

"اور آپ کا خیال ہے کہ آپ کا شوہر بے گناہ ہے؟"

"مجھے صد فی صد یقین ہے کہ وہ قتل جہانگیر نے نہیں کیا۔" وہ قطعیت سے بولی "جہانگیر اتنا سنگین قدم اٹھا ہی نہیں سکتا۔ اسے کسی غلط فہمی یا سازش کے تحت پھانسا گیا ہے اور میں اس کی بریت ہی کے سلسلے میں آپ کے پاس مدد حاصل کرنے آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جہانگیر کا مقدمہ آپ لڑیں۔"

عارفہ کی عمر لگ بھگ اٹھائیس سال تھی۔ وہ ایک اوسط شکل وصورت کی عورت تھی۔ تاہم اس کے چہرے میں ایک مخصوص کشش پائی جاتی تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے پھول دار شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ چار پانچ سالہ بچی، عارفہ کی اکلوتی بیٹی فائزہ تھی۔ عارفہ کے ساتھ آنے والی سلمیٰ نامی وہ عورت ادھیڑ عمر کی ایک فربہ خاتون تھی۔

میں نے عارفہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "خاتون! آپ نے بتایا کہ جہانگیر دو ہفتے سے جیل میں بند ہے۔ کیا اسے باقاعدہ سزا سنائی گئی ہے؟"

"شاید میں پریشانی میں کچھ غلط کہہ گئی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی "جہانگیر کو جیل گئے صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے ایک ہفتہ وہ تھانے کی حوالات میں بند رہا تھا۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "جہانگیر کو غالباً بارہ تاریخ کو گرفتار کیا گیا تھا۔"

"یعنی بارہ اکتوبر؟"

"جی ہاں، اسی ماہ کی بارہ تاریخ کو۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ جمعے کا

دن تھا۔“

میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی۔ بارہ اکتوبر کو واقعی جمعے کا دن تھا۔ میرے استفسار پر عارفہ نے بتایا کہ گرفتاری سے اگلے روز پولیس نے جہانگیر کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اس کے شوہر پر اچھا خاصا تشدد بھی کیا گیا تھا جیسا کہ روایت ہے۔ ریمانڈ کے بعد جب جہانگیر کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا تو اس وقت تک اس کے لئے کسی مناسب وکیل کا انتظام نہیں ہو سکا تھا لہٰذا اس کی ضمانت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

میں نے پرسوچ لہجے میں کہا ”عارفہ صاحبہ! آپ پہلے مجھے اس واقعے کے بارے میں بالتفصیل بتائیں پھر ہی میں آپ کی قانونی مدد کے بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کر سکوں گا۔“

چند لمحات تک وہ اپنے پراگندہ خیالات کو مجتمع کرتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر اپنے شوہر جہانگیر کو پیش آنے والے واقعات کے متعلق بتانے لگی۔ میں یہاں پر عارفہ کے بیان کا خلاصہ تحریر کروں گا تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ اس کیس کے عواقب و جوانب سے پوری طرح آگاہ ہوں اور آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں مختلف ذرائع سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں نے پولیس کی پیش کردہ چالان، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، فنگر پرنٹس کی تجزیاتی رپورٹ اور کیس فائل کے تفصیلی معائنے کے بعد ملزم جہانگیر کی پیروی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ملزم جہانگیر اپنی بیوی عارفہ اور اکلوتی بیٹی فائزہ کے ساتھ محمود آباد میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش دو چھوٹے کمروں والے ایک کوارٹر نما مکان میں تھی جس کا کرایہ چار سو روپے ماہوار تھا۔ عارفہ کا تعلق ایک انتہائی غریب خاندان سے تھا جو اعظم بستی میں سال ہا سال سے مقیم تھا۔ ان کی شادی کو لگ بھگ سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ فائزہ ان کی واحد اولاد تھی جس کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ میرے موکل جہانگیر کی عمر اکتیس بتیس سال تھی۔ وہ پستہ قامت کا قدرے فربہ شخص تھا۔

مقتول فرقان حمیدی کی رہائش محمد علی سوسائٹی کے ایک شاندار بنگلے میں تھی۔ اس کے کپڑے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ”حمیدی ٹیکسٹائل ملز“ سائٹ کے علاقے میں واقع تھی۔ فرقان حمیدی کو مذکورہ فیکٹری میں ہی قتل کیا گیا تھا۔ اس کی لاش اس کے لئے مخصوص دفتری کمرے سے ملی تھی۔ فیکٹری کے ایک حصے میں چار پانچ کمرے دفتری استعمال کے لئے خاص طور پر بنائے گئے تھے جہاں مقتول فرقان حمیدی کے علاوہ فیکٹری کا جنرل منیجر، اکاؤنٹینٹ، کیشئر، کلرک اور دیگر اسٹاف ممبران اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ ملزم جہانگیر کو اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے کم و بیش آٹھ سال ہوئے تھے۔ وہ ایک کثیر المقاصد ملازم تھا۔ چپڑاسی سے لے کر آؤٹ ڈور کلرک تک مختلف کام اس کی ذمہ داری کا حصہ تھے۔ اس نے مڈل تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ تاہم بہت سے بی اے پاس افراد سے زیادہ مستعد اور مفید ملازم تھا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر فرقان حمیدی تنخواہ کے علاوہ بھی اسے

پانچ سو روپے اپنی جیب خاص سے دیا کرتا تھا۔ جہانگیر کی تنخواہ پندرہ سو روپے تھی جو باس کی عنایت کے بعد پورے دو ہزار روپے ہو جاتی تھی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ بارہ اکتوبر کی سہ پہر جہانگیر کو اس کے گھر واقع محمود آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری فرقان حمیدی کے قتل کے سلسلے میں تھی۔

وقوعہ کے روز ملزم جہانگیر نے اپنے باس مقتول فرقان حمیدی سے آدھے دن کی چھٹی لے لی تھی اور وہ دوپہر کے وقت دفتر سے گھر آ گیا تھا۔ اس شام وہ اپنی بیوی کو ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے معمول کے مطابق دفتر سے نکلتا تو لیڈی ڈاکٹر تک رسائی ممکن نہ ہوتی۔ جہانگیر کی ڈیوٹی صبح نو بجے سے رات سات بجے تک ہوتی تھی۔ اسے فیکٹری پہنچنے کے لئے کم و بیش ایک گھنٹا پہلے سے گھر سے نکلنا پڑتا تھا، اسی طرح وہ چھٹی کے ایک گھنٹے بعد گھر پہنچتا تھا جب کہ مذکورہ لیڈی ڈاکٹر شام پانچ سے رات آٹھ بجے تک بیٹھتی تھی۔

عارفہ نے مجھے بتایا کہ جہانگیر گزشتہ کچھ دنوں سے پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی پریشانی کا سبب بھی جانتی تھی۔ دراصل ان دنوں اپنے ذاتی گھر کی خواہش اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ اختر کالونی میں اسی گز پر بنا ہوا ایک گھر دو لاکھ روپے میں مل رہا تھا جس کی نقد ادائیگی ایک لاکھ روپے تھی۔ باقی ایک لاکھ قسط وار ادا کرنا تھے۔ جہانگیر نے مختلف بیسیاں (کمیٹیاں) ڈال کر پچاس ہزار روپے جمع کر رکھے تھے۔ وہ مکان حاصل کرنے کے لئے اسے مزید پچاس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں جہانگیر نے اپنے باس سے بات کی۔

”سر! آپ بطور قرض مجھے پچاس ہزار روپے دے دیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

وہ آٹھ اکتوبر کی شام تھی۔ فیکٹری کے ملازمین کو ہر ماہ کی سات تاریخ کو تنخواہ دی جاتی تھی۔ اکتوبر کی سات تاریخ کو چونکہ اتوار پڑ گیا تھا۔ اس لئے اس ماہ آٹھ تاریخ کو تنخواہ بانٹی گئی تھی۔ جہانگیر اپنی تنخواہ حاصل کرنے کے فوراً بعد فرقان حمیدی کے پاس قرض کی بات کرنے پہنچ گیا تھا۔

فرقان حمیدی نے گمبھیر لہجے میں کہا ”پچاس ہزار روپے ایک بہت بڑی رقم ہوتی ہے جہانگیر...... اور فیکٹری کے حالات بھی آج کل کچھ زیادہ ٹھیک نہیں ہیں۔“

جہانگیر نے منت آمیز انداز میں کہا ”سر! میں آپ کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔ میں ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک مخصوص رقم کٹوایا کروں گا۔“

فرقان حمیدی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”جہانگیر! اگر تم ہر ماہ اپنی پوری تنخواہ بھی قرض کی قسط کے طور پر کٹوا دو تو بھی تمہیں یہ رقم ادا کرنے میں لگ بھگ تین سال تو لگ ہی جائیں گے۔“

”سر، آپ یقین کریں، میں آپ کی رقم واپس لوٹا دوں گا۔“ جہانگیر کے انداز میں خوشامد در آئی۔ ”میں پورے پانچ سو روپے ماہوار کٹوانے کو تیار ہوں۔“

''یعنی ادائیگی میں تم آٹھ نو سال کا پروگرام بنائے بیٹھے ہو!'' فرقان حمیدی نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔

جہانگیر نے کہا ''سر! ذاتی گھر میرا برسوں کا خواب ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو میرا یہ خواب پورا ہوسکتا ہے۔ آپ کے پاس کسی چیز کی کمی ہے۔ اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ پچاس ہزار روپے کی آپ کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''تم حقائق سے شاید واقف نہیں ہو جہانگیر!''

''کیسے حقائق سر!'' جہانگیر نے الجھی ہوئی نظروں سے اپنے باس کو دیکھا۔

''کاروباری حقائق۔'' فرقان حمیدی نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''تم نہیں جانتے کہ آج کل فیکٹری چلانا کس قدر دشوار ہو چکا ہے۔ ہم جاپان اور دیگر ممالک سے جو ریشمی دھاگا امپورٹ کرتے ہیں، اس کے دام اور اس پر لگائی جانے والی ڈیوٹی اب آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔ اسی طرح ایکسپورٹ کوالٹی کا کپڑا جو ہم ملک سے باہر بھیجتے ہیں، اس پر بھی اخراجات اس قدر بڑھا دیئے گئے ہیں کہ میں تو یہ فیکٹری بند کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں پھر دیگر محصولات اور بجلی کے نرخوں میں ہوش ربا اضافہ اس کے علاوہ ہے۔''

''سر! اگر آپ فیکٹری بند کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو یہاں کام کرنے والے ملازمین کا کیا ہوگا۔'' جہانگیر کا لہجہ تشویش سے پر تھا۔

فرقان حمیدی نے کہا ''بس یہی ایک سوچ مجھے ابھی تک ایسا کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ میں سوچتا ہوں، فیکٹری کے بند ہوتے ہی درجنوں افراد بے روزگار ہو جائیں گے، ان درجنوں افراد سے کئی درجن بلکہ سینکڑوں افراد کا رزق وابستہ ہے۔ میرے دل میں بڑا درد ہے ان لوگوں کے لئے مگر مجبوری میں تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا نا۔ پہلے میں اپنے ذاتی اخراجات کے لئے فیکٹری کے اکاؤنٹ سے تیس چالیس ہزار روپے لے لیا کرتا تھا لیکن اب یہ رقم نکالنا ممکن نہیں رہا۔ فیکٹری مسلسل خسارے میں جارہی ہے۔ ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات نکالنے کے لئے مجھے اپنے پاس سے ملانا پڑ رہا ہے۔ دیکھو، کتنے دن تک میں یہ دباؤ برداشت کرسکتا ہوں۔''

فرقان حمیدی نے اپنے مسائل کا رونا رو کر جہانگیر کی درخواست ایک طرح سے رد کردی تھی گویا اسے چٹا جواب دے دیا تھا۔ تاہم اس نے آخری کوشش کرنا ضروری سمجھا۔

''سر! میرے سلسلے میں تو کچھ گنجائش نکالیں نا!'' وہ پرامید نظر سے اپنے باس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔'' فرقان حمیدی اچانک ایک مصروف باس نظر آنے لگا۔

''گویا میں کچھ دن بعد امید رکھوں!''

''تمہیں ایسی کوئی امید نہیں رکھنا چاہئے۔''

''سر، میں باقاعدہ ادائیگی کروں گا۔''

فرقان حمیدی نے خشک لہجے میں کہا ''میرا نو دس سال فیکٹری چلانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں آج کل بیرون ملک سیٹل ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

جہانگیر نے اتمام حجت کے طور پر کہا ''سر! میں نے پورے آٹھ سال تک آپ کی خدمت کی ہے۔ کچھ تو اس فیکٹری پر میرا بھی حق بنتا ہے۔''

''اگر تم نے آٹھ سال یہاں کام کیا ہے تو اس کی باقاعدہ تمہیں تنخواہ ملتی رہی ہے بلکہ طے شدہ تنخواہ سے زیادہ ہی میں نے تمہیں دیا ہوگا۔ موجودہ حالات میں تنخواہ بھی باقاعدہ سے ملتی رہے تو غنیمت جانو۔ ایڈوانس رقم یا کسی قسم کے قرض کا خیال دل سے نکال دو۔''

جہانگیر نے شکایتی لہجے میں کہا ''سر! میری معلومات کے مطابق انہی دگرگوں حالات میں ایک ماہ قبل آپ نے جی ایم صاحب کو نئی گاڑی خریدنے کے سلسلے میں پورے ایک لاکھ روپے قرض دیئے ہیں!''

فرقان حمیدی نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا ''تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ دوسروں کی ٹوہ لگانے سے تم کوئی نقصان بھی اٹھا سکتے ہو، اور اب تم جاسکتے ہو۔''

جہانگیر کیلئے باس فرقان حمیدی کے کمرے میں رکنے کیلئے اب کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ وہ شکستہ دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ فرقان حمیدی کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

عارفہ کے مطابق اس روز کے بعد سے جہانگیر بہت افسردہ اور ملول رہنے لگا تھا۔ اس کا خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔ منزل پر پہنچ کر بھی وہ منزل سے بہت دور تھا۔ جو لوگ اپنی آنکھوں سے بڑا خواب دیکھ لیتے ہیں اس کی تعبیر کیلئے انہیں ہر پل جگر جلانا پڑتا ہے۔

پچاس ہزار روپے کی رقم فرقان حمیدی جیسے کروڑ پتی صنعتکار کیلئے بہت معمولی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم اس نے بھی دیگر سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کی اکثریت کی طرح اپنے مسائل کی بپتا سنا کر جہانگیر کو کورا جواب دے دیا تھا حالانکہ جہانگیر بے چارے نے بھیک نہیں بلکہ قرض مانگا تھا۔

میری معلومات کے مطابق فرقان حمیدی کی فیملی صرف دو افراد پر مشتمل تھی یعنی فرقان حمیدی جواب خود مقتول ہو چکا تھا...... اور اس کی بیوی ستارہ بیگم' ان کی اکلوتی بیٹی فرحین نے نوجوانی میں خودکشی کر لی تھی۔

کالج کے زمانے میں فرحین کو ایک لڑکے سے عشق ہو گیا تھا۔ اس وقت فرحین ٹین ایج کی پانچویں سیڑھی پر تھی۔ یعنی اس کی عمر محض سترہ سال تھی۔ انیس سالہ عاطف نامی وہ لڑکا فرحین کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ مقتول فرقان حمیدی نے بیٹی کو سمجھانے کی ہر ممکنہ کوشش کر ڈالی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ فرقان حمیدی کا خیال تھا کہ عاطف محض دولت کے لالچ میں وہ عشقیہ ڈراما رچا رہا تھا کیونکہ عاطف کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا اور وہ کسی بھی طور (فرقان حمیدی کے مطابق) فرحین کے لائق نہیں تھا۔ الغرض جب فرقان حمیدی نے بیٹی پر زیادہ سختی کی تو فرحین نے اسے سنگین ترین نتائج کے بارے میں بتا کر خودکشی کی دھمکی دے دی۔ فرقان نے بیٹی کی

خودکشی والی دھمکی کو "جذباتی ڈائیلاگ" کے خانے میں فٹ کرتے ہوئے فرحین پر پابندیاں اور سختیاں مزید بڑھا دیں۔ نتیجے میں ایک رات فرحین نے کثیر تعداد میں خواب آور گولیاں نگل کر اپنی جان دے دی۔ کچھ عرصے بعد عاطف موٹر سائیکل کے حادثے میں مارا گیا تھا۔

تین افراد کی وہ فیملی پہلے دو افراد میں بدلی اور پھر فرقان حمیدی کے قتل کے بعد یہ فیملی صرف اور صرف ستارہ بیگم پر مشتمل رہ گئی تھی۔ ستارہ اپنے مقتول شوہر کی تمام دولت جائیداد اور کاروبار کی بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھی۔

واقعات کے مطابق وقوعہ کے روز ملزم جہانگیر اپنے باس مقتول فرقان سے دن ایک بجے چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا۔ بعدازاں فیکٹری کے جنرل منیجر کو مقتول کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں اسے اپنے باس کی لاش ملی۔ مقتول کی پشت میں لفافے کھولنے والی اسٹیل کی چھری پیوست تھی۔ مذکورہ چھری کو مقتول کی پشت میں عین دل کے مقام پر گھونپا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

جی ایم (جنرل منیجر) خاور محمود نے فوراً پولیس اسٹیشن فون کر کے اس سانحے کی اطلاع دی۔ کچھ دیر بعد پولیس کی گاڑی موقع واردات پر پہنچ گئی۔ فیکٹری کے دفتری حصے میں موجود اسٹاف ممبران کے بیانات کے بعد جی ایم کی نشان دہی پر پولیس ملزم جہانگیر کو گرفتار کرنے محمود آباد روانہ ہو گئی۔ جی ایم خاور محمود کے مطابق وہ قتل جہانگیر نے کیا تھا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ مقتول کے کمرے میں گیا تھا۔ علاوہ ازیں مقتول کی جانب سے ملزم کا دل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ کیونکہ مقتول نے ملزم کی درخواست پر چند روز قبل ایک بھاری رقم بطور قرض دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت بارہ اکتوبر بروز جمعہ دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا سبب وہی پیپر نائف (لفافہ کھولنے والی چھری) تھا جو مقتول کی پشت سے داخل ہو کر اس کے دل کو پھاڑ گیا تھا۔ آلہ قتل یعنی پیپر نائف پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔

فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو بغور پڑھنے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پولیس نے موقع کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد فرقان حمیدی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی تھی اور ملزم جہانگیر کو حوالہ حوالات کر دیا گیا تھا۔

ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس نے اپنے آزمودہ ہتھکنڈوں کی بدولت ملزم سے اقبال جرم کروا لیا تھا تاہم عدالت میں جا کر جج کے سامنے جہانگیر نے صحت جرم سے انکار کر دیا تھا۔ جہانگیر کی طرف سے مناسب اور معقول وکالت کی عدم دستیابی کے باعث ملزم کو جیل کسٹڈی ہوگئی تھی۔

اس کے علاوہ بھی مجھے بہت سی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں جن کا ذکر سر دست مناسب نہیں ہوگا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ مرحلہ وار ہر بات سے آگاہ ہوتے جائیں گے۔ میں نے

اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ آئندہ پیشی میں ابھی دس دن باقی تھے۔ یہ عرصہ میں پوری توجہ سے کیس فائل کا بھرپور مطالعہ کرنے پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگلی پیشی سے قبل میں نے جیل میں ملزم اور اپنے مؤکل سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کر لی تھی۔

منظر سٹی کورٹ کی ایک عدالت کا تھا۔

میں نے ملزم جہانگیر کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ عدالت میں دائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی پیش کر دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور پھر اس کیس میں تو آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے واضح نشانات بھی پائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں باوجود کوشش کے عارفہ کسی معقول اور قابل اعتماد ضمانتی کا انتظام بھی نہیں کر پائی تھی۔

میں نے اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے اپنے مؤکل کی ضمانت کے سلسلے میں دلائل دینا شروع کیے لیکن باوجود کوشش کے بھی میں جہانگیر کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے پاس ترپ کے جو چند پتے تھے۔ میں انہیں بہت سنبھال کر مناسب موقع پر کھیلنا چاہتا تھا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

عارفہ اس روز کی عدالتی کارروائی سے خاصی دل برداشتہ تھی۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"بیگ صاحب! آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا!"

شاید پہلی مرتبہ اس کا عدالتی معاملات سے واسطہ پڑا تھا اس لیے وہ بددل ہو رہی تھی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "عارفہ صاحبہ! اگر ملزم کی ضمانت نہیں ہو سکی تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں اس مقدمے کو جیتنے کیلئے اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کروں گا۔ آپ کی فیس ضائع نہیں جائے گی"۔

وہ شکایتی لہجے میں بولی "اگر آج جہانگیر کی ضمانت ہو جاتی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوتی مگر ......خیر......"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "خاتون جب آپ کا شوہر اس الزام سے باعزت بری ہو جائے گا تو آپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ایک بڑی خوشی کے حصول کے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے نا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "کہیں میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لیجئے گا۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ملزم کی ضمانت کروانے میں ناکام رہا ہوں۔"

وہ معتدل لہجے میں بولی "خوشیوں کے بارے میں آپ کے فلسفے سے میں پوری طرح اتفاق کرتی ہوں مگر بعض خاص مواقع کیلئے کوئی معمولی خوشی بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟"

میں نے یہ جملہ دانستہ کہا تھا حالانکہ اس میں نہ سمجھنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس طرح میں

یہ چاہتا تھا کہ اگر عارفہ کے ذہن میں کوئی خاص نکتہ موجود تھا تو وہ اس کی زبان پر آ جائے۔

اس نے وضاحت آمیز انداز میں کہا "دراصل کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ میں چاہتی تھی کہ جہانگیر اس موقع پر ہتھکڑی کے بغیر گھر پر موجود ہوتا۔ کاش ایسا ہو جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!"

"اوہ!" میں نے تاسف آمیز انداز میں کہا "آپ کی سوچ فطری ہے مگر افسوس کہ ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔"

وہ چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ اسی دوران میں میں چلتے ہوئے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا تو عارفہ نے کہا۔

"اب تو آپ سے پندرہ روز بعد ہی ملاقات ہوگی بیگ صاحب!"

"ہاں کہیے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ عدالت کے احاطے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی "وہاں جیل کی گاڑی کھڑی ہے جو تھوڑی دیر میں دیگر قیدیوں کے ساتھ جہانگیر کو بھی لے جائے گی۔ کیا آپ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہانگیر سے میری مختصر ملاقات کروا سکتے ہیں؟"

"بالکل کروا سکتا ہوں۔" میں نے یقینی لہجے میں کہا "آپ آئیں میرے ساتھ۔"

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے مطلوبہ مقام پر پہنچے پھر میں نے مخصوص "کوششوں" سے عارفہ کی خواہش پوری کرنے کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ انہیں آپس میں گفتگو کرنے کیلئے محض چند منٹ ہی ملے تھے تاہم عارفہ اس ملاقات سے خاصی ریلیکس ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اب اداسی کی جگہ قدرے اطمینان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

جیل کی گاڑی جہانگیر کو لے کر چلی گئی تو عارفہ نے تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا "میں آپ کے شوہر کا وکیل ہوں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "آپ اب یہاں سے سیدھی گھر جائیں گی؟"

"جی ہاں، مجھے گھر ہی جانا چاہیے۔" اس نے جواب دیا "فائزہ سکول سے آ گئی ہوگی۔ آ کیا گئی ہوگی بلکہ میری پڑوسن سلمٰی اسے لے آئی ہوگی۔ فائزہ کو سکول میں ڈالے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میں صبح عدالت آتے ہوئے سلمٰی کو فائزہ کے بارے میں تمام ہدایات دے آئی تھی۔ سلمٰی عادت کی بہت اچھی اور ہمدردانہ رویہ رکھنے والی عورت ہے۔ فائزہ اس وقت اسی کے گھر میں ہوگی۔"

وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "آپ یہاں سے کس طرح محمود آباد تک جائیں گی؟"

"میں باہر سے ٹیکسی لے لوں گی۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے رہی تھی۔ میں نے اسے کسی قسم کی خفت میں مبتلا کیے

بغیر کہا "مجھے اس وقت ایک ضروری کام سے کارساز کی طرف جانا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری گاڑی میں میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو راستے میں نرسری کے سٹاپ پر ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ متذبذب دکھائی دینے لگی۔

میں جانتا تھا، وہ سٹی کورٹ سے دو بسیں یا ویگنیں بدل کر محمود آباد پہنچتی۔ ٹیکسی میں وہ ہرگز نہ بیٹھتی۔ وہ تو اس نے مجھے سنانے کیلئے کہا تھا۔ اس کی خاموشی طول پکڑنے لگی تو مجھے اندازے کی سچائی کا یقین ہو گیا۔ میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو ٹیکسی والا کرایہ مجھے دے دیجئے گا۔"

وہ بے اختیار مسکرا دی۔ گویا اس نے میری گاڑی میں سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میری گاڑی سٹی کورٹ کے احاطے سے باہر آ رہی تھی۔ عارفہ گاڑی کی عقبی نشست پر خاموش بیٹھی تھی۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی بہت سست، پیچیدہ اور قانونی قسم کی ہوتی ہے جس میں زیادہ تر باتیں خشک اور ٹیکنیکل نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جن میں قارئین کیلئے دلچسپی کا سامان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ان طول طویل اور بور کارروائیوں کا ذکر حذف کرتے ہوئے براہ راست استغاثہ کے گواہوں کی طرف آتا ہوں۔

استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی جو فہرست پیش کی گئی تھی اس میں نصف درجن سے زیادہ افراد کے نام شامل تھے لیکن میں یہاں پر صرف اہم چند گواہوں پر جرح کا احوال بیان کروں گا۔

استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے "حمیدی ٹیکسٹائل ملز" کا چوکیدار گواہی کیلئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروایا۔ مذکورہ گواہ کا نام گل زمان خان تھا اور عمر لگ بھگ پچاس سال ہوگی۔

وکیل استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کیلئے گواہ کے کٹہرے کی جانب بڑھا۔ اس نے ملزموں والے کٹہرے میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گل زمان خان! تم اس شخص کو پہچانتے ہو نا؟"

"بالکل جانتا ہوں وکیل صاحب" گل زمان نے پر وثوق لہجے میں جواب دیا۔

"اور تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہ آج یہاں کیوں کھڑا ہے؟"

گل زمان نے کہا "جی اس بدبخت نے صاحب کو قتل کیا ہے۔"

صاحب سے گواہ کی مراد فرقان حمیدی تھا۔

وکیل استغاثہ نے ہونٹوں پر فتح مندی کے تاثرات سجاتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت خاصی بچگانہ لگی۔ وہ گواہ کی طرف مڑتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو گل زمان خان۔"

مجھے فوراً مداخلت کرنا پڑی۔ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا ''آبجیکشن یور آنر۔''

جج نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنا اعتراض بیان کیا ''جناب عالی! وکیل استغاثہ کا انداز کیا معنی رکھتا ہے۔ میرا مؤکل اس کیس کا ملزم ہے۔ اس پر کوئی جرم ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا اور ابھی تو عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا ہے۔ وکیل استغاثہ کا گواہ کے اس جواب کو سراہنا ''جی اس بدبخت نے صاحب کو قتل کیا ہے'' اور بعدازاں تبصرہ کرنا ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو گل زمان خان''۔ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ میرا مؤکل مجرم ثابت ہو چکا ہے۔ آخر وکیل استغاثہ ایسے ریمارکس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وکیل موصوف کو قانون کے دائرے میں رہنے کی تاکید کی جائے''۔

میرا اعتراض جان دار تھا لہٰذا جج نے وکیل استغاثہ کو ایک مختصر سی تنبیہہ کر دی۔ وکیل استغاثہ نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے گل زمان خان سے اگلا سوال کیا۔

''گل زمان خان! تمہیں وہ دن تو یاد ہوگا جس روز فرقان صاحب کا قتل ہوا تھا؟''

''میں اس دن کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''پھر تو تمہیں یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ وقوعہ کے روز ملزم نے فیکٹری سے نکلنے سے قبل تم سے کچھ بات چیت کی تھی؟''

گل زمان نے اثبات میں سر ہلا دیا ''اس روز جمعہ کا دن تھا اور جمعہ کی نماز کا وقت بھی قریب تھا اس لیے بس دو چار باتیں ہی ہو سکی تھیں۔''

''اس روز تم دونوں کے درمیان کس موضوع پر بات ہوئی تھی؟''

''کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔'' اس نے ٹالنا چاہا۔

''پھر بھی؟''

''ملزم جہانگیر صاحب کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔''

''کیا برا بھلا کہہ رہا تھا؟''

''وہ صاحب کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا ''اس وقت ملزم کی ظاہری حالت کیسی تھی؟''

''وہ سخت غصے میں تھا۔''

اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں وکلاء کے پوچھے گئے سوالات اور ملزم یا گواہوں کے دیئے گئے جوابات کو ساتھ ساتھ ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ ریکارڈ سے میری مراد ''ٹیپ ریکارڈ'' نہیں ہے بلکہ جج کی اجازت سے یہ کام اسٹینوگرافر کرتا ہے جو باقاعدہ عدالتی عملے کا ایک رکن ہوتا ہے۔

اپنی باری پر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سوالات کیلئے وٹنس باکس (گواہوں والا کٹہرا) کے

پاس آ گیا جہاں استغاثہ کا گواہ گل زمان خان چوکیدار آف ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز'' کھڑا تھا۔ میں نے گواہ سے پوچھا۔

''گل زمان خان! کیا میں آپ کو صرف ''خان صاحب'' کہہ سکتا ہوں؟''

''بالکل کہہ سکتے ہیں''۔

میں نے کہا ''خان صاحب! آپ کدھر رہتے ہو؟''

''جی میں فیکٹری میں چوکیداری کرتا ہوں۔''

''میرا مطلب تھا کہ آپ کی رہائش کدھر ہے۔''

اس نے جواب دیا ''میرا گھر بنارس میں ہے۔''

''آپ روزانہ فیکٹری سے بنارس جاتے ہیں؟''

''روزانہ نہیں، ہفتے میں ایک دن۔'' اس نے جواب دیا ''چھٹی کے روز میں بھی چھٹی کرتا ہوں''۔

''میں دانستہ گواہ گل زمان خان سے اس قسم کے غیر متعلقہ سوالات کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''آپ کو مقتول کی فیکٹری میں ''چوکیداری'' کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا ''پانچ سال''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم آپ سے زیادہ پرانا ملازم تھا؟''

''جی وہ مجھ سے پہلے سے فیکٹری میں کام کر رہا تھا''۔

''خان صاحب! آپ کا اور ملزم کا ساتھ لگ بھگ پانچ سال کا تھا''۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اس عرصے کے دوران میں آپ کے ملزم سے کیسے تعلقات رہے تھے؟''

''تعلقات!'' اس نے زیرلب دہرایا۔

میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلتے ہوئے جلدی سے کہا ''میرا مطلب یہ ہے کہ ان پانچ سالوں میں ملزم کا آپ کے ساتھ رویہ کیسا رہا تھا؟''

''اس کا رویہ ٹھیک ہی تھا۔''

''کبھی آپ دونوں کا آپس میں جھگڑا وغیرہ بھی ہوا؟''

''نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''کسی اور ملازم سے ملزم کا لڑائی جھگڑا ہوا ہو؟''

''بالکل نہیں جناب''۔

''اس کا مطلب ہے، ملزم ایک صلح جو انسان تھا؟''

''اس کا مطلب تو یہی ہے لیکن ''صاحب'' کو قتل......''

خان صاحب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کے نامکمل جملے کو نظرانداز کرتے

ہوئے پوچھا "گل زمان! یہ بتائیں ملزم فیکٹری میں کیا کام کرتا تھا؟"

"وہ کوئی ایک کام نہیں کرتا تھا۔"

"ایک نہیں تو دو چار بتا دیں؟"

گل زمان نے بتایا "ملزم مختلف قسم کے کام کرتا تھا۔ وہ فیکٹری کے دفتر کا چپراسی بھی تھا۔ صاحب کے کمرے کی ڈسٹنگ بھی کرتا تھا۔ صاحب جب فیکٹری آتے تھے تو وہی گاڑی میں سے نکلتے ہی صاحب کا بریف کیس تھامتا تھا اور صاحب کے پیچھے چلتے ہوئے ان کا بریف کیس ان کے کمرے تک پہنچاتا تھا۔ صاحب فیکٹری سے باہر بھی مختلف نوعیت کے کاموں کے لیے اسے دوڑاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ صاحب اس سے عام قسم کی ڈاک کھلوانے کا کام بھی لیتے تھے۔"

گل زمان کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے کہا "تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ ملزم اس دفتر کا خاصا مصروف ملازم تھا۔"

"جی بالکل ایسا ہی تھا"۔

"کیا وہ تمام کام ایک تنخواہ میں کرتا تھا؟"

"ظاہر ہے جناب' تنخواہ تو اسے ایک ہی ملتی ہوگی۔"

میں نے پوچھا "ملتی ہوگی...... کیا مطلب؟"

وہ گڑبڑا گیا۔ جلدی سے بولا "تنخواہوں کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا پھر پوچھا "یہ تو تمہیں یاد ہوگا کہ وقوعہ کے روز فیکٹری سے نکلنے سے پہلے ملزم نے تم سے بات چیت کی تھی؟"

"جی ہاں' اچھی طرح یاد ہے۔" وہ پرجوش لہجے میں بولا "میں نے ابھی ابھی دوسرے وکیل صاحب کو بھی بتایا ہے۔"

میں نے کہا "خان صاحب! دوسرے وکیل صاحب کو تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم بہت غصے میں تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا "اور تم نے "دوسرے وکیل صاحب" کو یہ نہیں بتایا کہ ملزم کے غصے کی وجہ کیا تھی؟"

"وجہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتی ہے!"

"پھر کس سبب ملزم مقتول کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا"۔ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا "تم نے وکیل استغاثہ کو یہ بات بتائی تھی نا؟"

"جی بتائی تھی"۔ وہ نحیف سی آواز میں بولا "مگر مجھے ملزم کے غصے کا سبب معلوم نہیں ہے۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں"۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم نے کہا اور میں نے یقین کر لیا۔ واقعی ایسا ہوا ہوگا۔ ملزم

ے میں ہوگا اور تمہیں اس غصے کی وجہ معلوم نہیں ہوگی"۔ میں اسے آہستہ آہستہ گھسیں رہا تھا "لیکن ان صاحب! تمہیں یہ تو معلوم ہوگا اس روز تم دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

یہی سوال وکیل استغاثہ نے بھی اس سے کیا تھا جسے گل زمان نے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ ں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس "گریز" کے پیچھے کوئی اہم نکتہ تھا یا خان صاحب نادانستگی میں ایسا کر گیا تھا۔

وہ بولا "وکیل صاحب! کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ بس ملزم اپنی بیوی کے رے میں بتا رہا تھا۔ اس کی بیوی کو عورتوں والی کوئی مخصوص بیماری تھی اور ملزم اسے اس روز کسی لیڈی اکٹر کے پاس لے جانے والا تھا۔ وہ بیوی کی بیماری کی وجہ سے خاصا پریشان تھا۔"

"وہ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا" میں نے پرخیال انداز میں گواہ کے واب کا آخری حصہ دہرایا "یعنی وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش جھلکتی تھی کیوں...... ان صاحب! ایسا ہی تھا نا؟"

"جی وکیل صاحب! وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔" گل زمان خان نے میری توقع ور "محنت" کے مطابق جواب دیا۔

اس جواب پر وکیل استغاثہ نے گھور کر خان صاحب کو دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وکیل ستغاثہ منہ سے کچھ بولتا' میں نے گل زمان کو اپنے اگلے سوال میں الجھا لیا۔

"خان صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیل ستغاثہ کے سوال "اس وقت ملزم کی ظاہری حالت کیسی تھی؟" کے جواب میں بتایا تھا "وہ سخت غصے ں تھا۔" ابھی تم مجھے بتا رہے ہو کہ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ خصوصاً "گھبرایا ہوا ہونا" اور "غصے ں ہونا" دو مختلف حالتیں ہیں جو بیک وقت ممکن نہیں ہیں۔ تمہارے کون سے جواب کو درست مانا ائے؟"

گل زمان الجھ گیا۔ اس نے فوراً امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وکیل استغاثہ ی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ فوراً بیچ میں کود پڑا۔ اس نے چیختی ہوئی آواز میں اپنا احتجاج نوٹ روایا۔

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔"

جج نے سوالیہ انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا اور پوچھا "آپ کو کس بات پر اعتراض ہے ل صاحب؟"

وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! وکیل صفائی ایک سیدھے ادے پٹھان چوکیدار کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بے چارہ کیا انے کہ "غصہ اور گھبراہٹ" دو الگ الگ حالتیں ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا "میرے فاضل دوست! میں مانتا ہوں گواہ گل زمان خان ایک

سیدھا سادہ انسان ہے۔ ممکن ہے وہ بے چارہ بھی ہو لیکن آپ تو سیدھے سادے ہیں اور نہ ہی کہیں سے بے چارے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہی میرے سوال کا جواب دے دیں؟''

''میں کوئی ماہر نفسیات نہیں ہوں۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔

''حالانکہ ایک اچھے وکیل کو ماہر نفسیات بھی ہونا چاہیے۔'' میں نے چوٹ کی ''باقاعدہ نفسیات کی درسی تعلیم نہ بھی حاصل کی ہو لیکن انسانی رویوں' احساسات اور جذبات کی نفسیات تو اسے معلوم ہی ہونا چاہیے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

''میں نے لفظ ''اچھے وکیل'' پر خاصا زور دیا تھا۔ وکیل استغاثہ میرے اس ''وار'' سے بلبلا اٹھا' جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا ''اگر معزز گواہ کا بیان ہے کہ ملزم اس وقت غصے میں تھا اور سخت گھبرایا ہوا بھی تھا تو یہ ناممکن نہیں ہے۔ ان کیفیات کی واضح وجوہات موجود تھیں۔''

''اور وہ وجوہات کیا تھیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

وکیل استغاثہ نے کہا ''ملزم اپنی بیوی کی بیماری کے سبب گھبرایا ہوا تھا اور غصہ اس مقتول پر تھا اسی لیے وہ مقتول کو گندی گالیاں بھی دے رہا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''اب آپ یہ سوال کریں گے کہ ملزم کو مقتول پر غصہ کیوں تھا!''

میں نے جلتی پر تیل ڈالنا بلکہ چھڑکنا عین مناسب اور اشد ضروری سمجھا ''چلیں' لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں وکیل صاحب!''

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور خفگی آمیز لہجے میں بولا ''ملزم جہاں بیٹھتا تھا' مقتول کی برائی کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ کئی افراد اس بات کے گواہ ہیں۔''

اپنی بات ختم کر کے وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اسی دوران میں جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''بیگ صاحب! آپ گواہ سے کوئی اور سوال کریں گے یا آپ کی جرح ختم ہو چکی ہے؟''

''میری جرح ابھی جاری ہے جناب۔'' میں نے مودبانہ لہجے میں کہا اور وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ چوکیدار گل زمان خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''خان صاحب! وقوعہ کے روز ملزم فیکٹری سے جانے سے پہلے کتنی دیر تمہارے پاس رکا تھا!''

''تقریباً آدھا گھنٹا۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ ملزم کتنے بجے وہاں سے روانہ ہوا تھا؟''

''مجھے ٹھیک وقت تو یاد نہیں۔'' وہ پر سوچ لہجے میں بولا ''لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس وقت دوپہر کا ڈیڑھ بجا ہو گا۔ ملزم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔''

''کیا ہم اس ڈیڑھ بجے کے وقت کو بڑھا کر پونے دو کر سکتے ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''یہ وقت ایک پچیس تو ہو سکتا ہے مگر پونے دو ہرگز

نہیں کیونکہ پونے دو بجے تو میں مسجد میں جمعہ کی نماز کیلئے وضو کر رہا تھا۔''

فیکٹری کی مسجد تک جانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

میں نے پوچھا۔

''تقریباً پندرہ منٹ۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالیٰ۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے گواہ گل زمان پر اپنی جرح ختم کر دی۔

اگلا گواہ ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز'' کا اکاؤنٹنٹ قیصر عباس تھا۔ ایک بات میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دو گواہوں کے درمیان بعض اوقات کئی کئی ماہ کا وقفہ حائل ہوتا ہے۔ کبھی گواہ موجود ہے تو جج غیر حاضر' کبھی وکیل صاحب کسی ضروری کام کے باعث چھٹی پر چلے جاتے ہیں اور کبھی گواہ بیماری کا سرٹیفکیٹ بھیج کر گول ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ زندگی کا حصہ ہے اور ہمارے عدالتی معمولات کا اہم جزو بھی لیکن جب میں عدالتی کارروائی کا ذکر کرتا ہوں تو درمیانی تاخیری عرصے کو حذف کر کے سلسلہ براہ راست جاری رکھتا ہوں۔

قیصر کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ دراز قامت' جسم دبلا پتلا' کلین شیو اور تعلیم ''بی کام'' تک تھی۔ وہ اس وقت پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا اور خاصا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔

قیصر نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان کے مطابق وقوعہ کے روز وہ حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ملزم جہانگیر اس کے پاس آیا اور بتایا کہ وہ آج جلدی گھر جا رہا ہے۔ صاحب سے اس نے چھٹی لے لی ہے اور بس اب فیکٹری سے نکلنے ہی والا ہے۔ گواہ نے ملزم سے پوچھا کہ اس کے ایڈوانس کا سلسلہ کہاں تک پہنچا تو ملزم نے یہ سنتے ہی مقتول کی شان میں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر میں خود ہی بتایا کہ آج اس کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دفتر سے اسی لیے جلدی چھٹی کر رہا ہے کہ بیوی کو لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے لے جانا ہے۔ قیصر عباس نے اپنے بیان میں مزید بتایا کہ ملزم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد فیکٹری کا جنرل منیجر خاور محمود اس کے پاس پہنچا اور گھبراہٹ آمیز لہجے میں دریافت کیا کہ جہانگیر کدھر ہے؟ گواہ نے جی ایم کو بتایا کہ ملزم تو صاحب سے چھٹی لے کر گھر چلا گیا ہے۔ اس پر جی ایم نے ملزم کو ایک عدد شاہکار گالی سے نوازنے کے بعد گواہ کو بتایا کہ ملزم فرقان حمیدی کو قتل کر کے وہاں سے گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی گواہ کے بیان میں چند چھوٹی موٹی باتیں تھیں جن کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

وکیل استغاثہ جرح کیلئے گواہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گواہ قیصر عباس سے پہلا سوال کیا۔

''قیصر صاحب! آپ ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز'' میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیش کے معاملات کو بھی آپ ہی دیکھتے ہیں چنانچہ یہ بات طے ہے کہ ملازمین کو تنخواہوں کے علاوہ بطور قرض دی جانے والی رقوم کے بارے میں بھی آپ کو پوری آگاہی رہتی

ہے۔کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

گواہ نے وکیل استغاثہ کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا ”بالکل بجا
آپ نے۔“اس کے علاوہ مجھے یہ بھی خبر رہتی ہے کہ فیکٹری کا کون سا ملازم آئندہ قرض یا ایڈوان
خواہاں ہے......اور یہ کہ وہ اس قرض کی واپسی کیسے کرنا چاہتا ہے۔میرا مطلب ہے وہ ماہانہ کونس
مد میں کتنے روپے افورڈ کر سکتا ہے“۔

”بہت خوب۔“ وکیل استغاثہ نے گواہ کو سراہا پھر بولا ”آپ کو یہ بات تو اچھی طرح یا
گی کہ ملزم مقتول سے ایک بھاری رقم بطور قرض لینا چاہتا تھا“۔

قیصر نے اثبات میں جواب دیا بتایا ”ملزم نے مقتول سے اس سلسلے میں بات کرنے
پہلے مجھ سے بھی مشورہ مانگا تھا لیکن میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ فیکٹری کے مالی حال
ان دنوں ٹھیک نہیں ہیں لہٰذا مجھے نہیں امید کہ مقتول، ملزم کی درخواست پر غور کرے اس لیے بہتر
ہے کہ وہ قرض کے خیال کو دل سے نکال دے“۔

”تو کیا ملزم نے یہ خیال دل سے نکال دیا تھا؟“

”بالکل نہیں جناب“۔ گواہ نے نفی میں گردن کو جنبش دی ”وہ اپنی ضد کا پکا ہے۔ا
دعویٰ تھا کہ مقتول اس کی درخواست کو رد کر ہی نہیں سکتا“۔

”پھر اس کا دعویٰ کہاں تک سچا ثابت ہوا؟“

”کہیں تک بھی نہیں“۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ مقتول نے قرض دینے سے صاف انکار کر دیا تھا“۔

”پھر کیا ہوا تھا؟“

”ہونا کیا تھا، ملزم کے تعزیے ٹھنڈے ہو گئے۔“

وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”مقتول کے کورے انکار پر ملزم
کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟“

”وہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا اور غصے میں مقتول کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا“۔گواہ نے جواب
”حالانکہ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہا
بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔اپنی عیاشیوں کیلئے تو بہت رقم ہے صاحب کے پاس اور
سوکھا ہی ٹرخا دیا۔اس کے علاوہ وہ مقتول کو گالیاں بھی دے رہا تھا“۔

وکیل استغاثہ نے سوال کیا ”ملزم نے مقتول سے کب قرض مانگا تھا؟“

”پچھلے سال آٹھ اکتوبر کو“۔گواہ نے جواب دیا۔

واضح رہے کہ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے اس وقت تک آٹھ نو ماہ کا عرصہ گزر
تھا۔

”ملزم نے آٹھ اکتوبر کو قرض مانگا اور بارہ اکتوبر کو فرقان حمیدی کا قتل ہو گیا“۔وکیل
استغاثہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”قیصر صاحب! آٹھ
اکتوبر سے بارہ اکتوبر کے درمیان ملزم کا رویہ کیسا رہا تھا؟“

”بہت اکھڑا ہوا“۔وہ دوٹوک لہجے میں بولا ”اٹھتے بیٹھتے وہ مقتول کے خلاف کچھ نہ کچھ
بولتا رہتا تھا“۔

اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور حسب معمول ہلکے پھلکے سوالات
سے جرح کا آغاز کیا۔

”قیصر عباس صاحب! آپ کی ہائیٹ کتنی ہے؟“

”چھ فٹ، دو انچ اونلی“۔

”اونلی!“ میں نے زیر لب دہرایا پھر قدرے اونچی آواز میں کہا ”بہت خوب قیصر
صاحب! آپ خاصے زندہ دل انسان ہیں۔آپ سے مل کر خوشی ہوئی“۔

گواہ نے خوش دلی سے سر ہلایا لیکن میں نے نوٹ کیا میرے ان ریمارکس پر وکیل
استغاثہ کھول کر رہ گیا تھا۔میں نے اس کی پرواہ کیے بغیر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

”قیصر صاحب! آپ کو ”حمیدی ٹیکسٹائل ملز“ میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”جناب! میں فیکٹری میں کام نہیں کرتا“۔قیصر عباس نے جلدی سے کہا۔

”میرا مطلب تھا، فیکٹری کے دفتر میں“۔

گواہ نے جواب دیا ”آئندہ ماہ چھ سال ہو جائیں گے“۔

”اس دفتر میں آپ کس حیثیت سے کام کر رہے ہیں“۔

”ایز اے اکاؤنٹنٹ“۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کیش کو بھی آپ ہی دیکھتے ہیں؟“

”آپ کی معلومات درست ہیں۔“ گواہ نے کہا ”میں اس فیکٹری کا اکاؤنٹنٹ بھی ہوں
ر کیشیئر بھی“۔

”کیا فیکٹری آپ کو دو تنخواہیں دیتی ہے؟“

”نہیں تو!“ وہ خاصا متعجب تھا۔

میں نے کہا ”جب آپ دو ذمے داریاں نبھا رہے ہیں تو آپ کو تنخواہیں بھی دو ہی ملنا
ہئیں نا!“

”ہاں، ملنا تو چاہئیں لیکن ملتی نہیں ہیں۔“ وہ قدرے افسوس ناک لہجے میں بولا
پرائیویٹ اداروں کا چلن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔مالک کی پالیسی ہوتی ہے کہ ایک ملازم سے
ادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔اس طرح ملازمین کی تعداد کم ہوگی تو ایک طرف اخراجات میں کمی

آئے گی تو دوسری جانب اندرون خانہ سیاست کے امکانات کم سے کم ہوں گے۔'' ایک لمحے کو دم سانس لینے کے لئے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''میں اپنی ملازمت کے ابتدائی چار سال تک صرف اکاؤنٹینٹ تھا۔ کیش کے معاملات ایک اور صاحب دیکھتے تھے جو بعدازاں اپنے بعض گھپلوں کے باعث نکال دیئے گئے اور کیش کی ذمے داری بھی مجھے سونپ دی گئی اور اس سلسلے میں میری تنخواہ میں ایک ہزار روپے کا اضافہ کردیا گیا۔ اگر فل فلیج کیشیئر اپائنٹ کیا جاتا تو اسے اسکیل کے مطابق پوری تنخواہ دینی پڑتی۔''

''مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔'' اس کا طویل مکالمہ ختم ہوا تو میں نے کہا ''اس دنیا میں کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ بے چارہ ملزم بھی کئی کام کرتا تھا لیکن تنخواہ ایک ہی پاتا تھا۔''

قیصر عباس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ''اسے تو فرقان صاحب علیحدہ سے بھی کچھ رقم دیتے تھے۔ میرا مطلب ہے، تنخواہ کے علاوہ۔''

''آپ کو یہ راز کیسے معلوم ہوا؟''

''ایک روز ملزم نے خود ہی بتایا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''اس دن وہ مقتول کی کچھ زیادہ ہی تعریف کررہا تھا۔ جوشِ جذبات میں وہ یہ راز بھی اگل گیا تھا۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم سادہ دل ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹ کا ہلکا بھی ہے۔''

قیصر عباس خاموش کھڑا رہا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا ''قیصر صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جب مقتول نے ملزم کو قرض دینے سے انکار کردیا تو ملزم خاصا برہم ہوگیا تھا اور مقتول کو اچھی خاصی گالیاں دی تھیں بلکہ مقتول کے انکار کے بعد وہ اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا اور اٹھتے بیٹھتے مقتول کو کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا یعنی ...... برا بھلا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے سانس لیا پھر سلسلہ سوالات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں، میں نے وکیل استغاثہ کو یہی بتایا تھا۔''

''قیصر صاحب! ملزم نے مقتول سے قرض حاصل کرنے کے لئے پچھلے سال آٹھ اکتوبر کو بات کی تھی اور مقتول کا قتل اسی ماہ کی بارہ تاریخ کو ہوا۔ آپ کے بیان کے مطابق آٹھ اور بارہ اکتوبر کے درمیانی عرصے میں ملزم مقتول کی جانب سے خاصا خفا نظر آتا تھا اور گاہے بہ گاہے اس کے خلاف کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تھا۔ میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ آیا ملزم آٹھ اکتوبر سے قبل بھی مقتول کے خلاف کبھی گالی گفتار کا مرتکب ہوا تھا؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا ''نہیں، پہلے اس نے ایسی حرکت کبھی نہیں کی تھی۔''

میں نے پوچھا ''قیصر صاحب! آپ کے بیان کے مطابق آپ لگ بھگ چھ سال سے

اس فیکٹری کے دفتری عملے میں شامل ہیں۔ ملزم اسی وقت میں آپ سے دو سال پہلے سے یعنی آٹھ سال سے کام کررہا تھا۔ ذرا سوچ کر بتائیں، آپ کے چھ سالہ ساتھ کے دوران میں ملزم نے آپ کے ساتھ کبھی کوئی جھگڑا یا گالم گلوچ کیا ہو؟''

''ایسا ناخوشگوار واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔''

''عملے کے کسی اور فرد کے ساتھ ملزم کا کوئی تنازع ہوا ہو؟''

''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

میں نے سوال کیا ''قیصر صاحب! آپ نے اپنے عدالتی بیان میں بتایا کہ ملزم نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ صاحب سے چھٹی لے کر آج جلدی گھر جانا چاہتا ہے۔ جلدی چھٹی کرنے کی وجہ بھی اس نے بتائی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہتا تھا۔ ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز ملزم کتنے بجے آپ کے پاس آیا تھا؟''

''تقریباً ایک بجے دوپہر۔'' اس نے جواب دا۔

''اور وہ آپ کے پاس کتنی دیر ٹھہرا تھا؟''

''زیادہ سے زیادہ تین چار منٹ۔''

میں نے گواہ گل زمان کے بیان کی تصدیق کرنے کی خاطر پوچھا ''قیصر صاحب! ان تین چار منٹ میں آپ نے ملزم کی کیفیت پر غور کیا تھا؟''

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ملزم کی ذہنی کیفیت اور احساسات کس قسم کے تھے؟''

قیصر عباس نے جواب دیا ''میں اس وقت کام میں مصروف تھا۔ وہ جو کچھ بولتا رہا، میں سنتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصا پریشان تھا، شاید بیوی کی بیماری کی وجہ سے۔''

''وہ بیوی کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا اور مقتول کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے گواہ قیصر عباس کو دیکھا۔

''جی ہاں، ایسا کچھ ہی تھا۔''

میں نے اگلا سوال کیا ''قیصر صاحب! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ملزم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد آپ کی فیکٹری کا جنرل منیجر آپ کے پاس پہنچا اور ملزم کے بارے میں استفسار کیا۔ جب آپ نے جی ایم کو بتایا کہ ملزم جاچکا ہے تو اس نے آپ کو بتایا کہ ملزم نے فرقان حمیدی کو قتل کردیا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''جنرل منیجر، ملزم کے رخصت ہونے کے کتنی دیر بعد آپ کے پاس آیا تھا؟'' میں نے

استفسار کیا۔

''تقریباً پانچ منٹ بعد۔''

''یعنی کم و بیش ایک دس پر؟''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''اس کے بعد ہم دونوں یعنی میں اور جی ایم صاحب فیکٹری کے بیرونی گیٹ کی جانب لپکے تھے لیکن وہاں پر موجود چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ ملزم وہاں سے جا چکا تھا۔''

واضح رہے کہ عدالت میں اس وقت میں صرف ایک گواہ کو پیش کیا جاتا ہے اور دوسرے گواہ اس گواہ کے بیان اور جرح کے نتیجے میں دیئے گئے جوابات سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ احتیاط اس لئے برتی جاتی ہے کہ ایک گواہ کی گواہی سے دوسرے گواہ کا بیان متاثر نہ ہو۔ چوکیدار گل زمان خان نے بتایا تھا کہ ملزم کم و بیش آدھا گھنٹہ اس سے بات چیت کرتا رہا تھا یعنی ایک بجے سے لے کر ایک تیس تک گواہ قیصر عباس کا کہنا تھا کہ ملزم ایک بجے اس کے پاس آیا تھا، تین چار منٹ کی گفتگو کے بعد چلا گیا تھا اور اس کے پانچ منٹ بعد جنرل منیجر اس کے پاس پہنچا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ملزم گواہ گل زمان کے پاس ایک بجے کے بجائے ''ایک تین'' یا ''ایک چار'' پر پہنچا ہو لیکن یہ کسی بھی طور ممکن نہیں تھا کہ جب ایک بج کر دس منٹ پر گواہ قیصر اور جی ایم دونوں چوکیدار کے پاس پہنچے تو ملزم وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ گل زمان خان نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ ملزم لگ بھگ ڈیڑھ بجے اس کے پاس سے گیا تھا۔

میں نے کہا ''قیصر عباس صاحب! معزز عدالت کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم لگ بھگ ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک چوکیدار گل زمان خان کے پاس رک کر بات چیت کرتا رہا تھا اور آپ فرما رہے ہیں کہ ایک بجکر دس منٹ پر جب آپ جی ایم کے ساتھ فیکٹری کے بیرونی گیٹ پر پہنچے تو ملزم وہاں سے جا چکا تھا؟''

وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا ''پھر ہم ڈیڑھ بجے ہی چوکیدار کے پاس پہنچے ہوں گے۔'' اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

وکیل استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپکا ''قیصر صاحب، شاید کچھ بھول رہے ہیں یا حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ دونوں ڈیڑھ بجے ہی بیرونی گیٹ پر پہنچے تھے۔''

''بہت خوب...... ونڈر فل مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ''آپ کی سپورٹ قابل تعریف ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا ''میرے فاضل دوست! استغاثہ کا معزز گواہ مسٹر قیصر عباس کامرس گریجویٹ ہے۔ وہ کیش اور اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ ہے اور ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز'' میں گزشتہ چھ سال سے تسلی بخش کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس

سے حساب کتاب کی گڑبڑ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آخر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ کے بجائے گواہ قیصر عباس نے جواب دیا ''وکیل صاحب کی بات میں وزن ہے۔ آج میں ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہوں۔ جی ایم صاحب ڈیڑھ بجے ہی میرے پاس آئے تھے اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ فیکٹری کے بیرونی گیٹ پر پہنچے تھے۔ مجھے اپنی مسٹیک کا احساس ہو گیا ہے۔''

میں نے ایک دوسرے زاویے سے اس کی گھسائی کی ''قیصر صاحب! ابھی آپ نے کہا ہے کہ آج آپ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہیں لیکن مجھے تو اس کے برعکس دکھائی دے رہا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں!'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں نے کہا ''مجھے تو خاصے ''سیٹ اپ'' نظر آ رہے ہیں۔''

''شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔'' وہ کھسیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا ''کیا ہمارا آپس میں مذاق ہے؟''

''نن...... نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پرزور لہجے میں کہا ''قیصر صاحب! جب میں نے آپ پر اپنی جرح کا آغاز کیا تھا تو آپ خاصے ہشاش بشاش اور زندہ دل دکھائی دے رہے تھے۔ یاد رہے، آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا ''چھ فٹ دو انچ اونلی'' آپ کے اس جواب پر میں نے آپ کو ''زندہ دل انسان'' قرار دیا تھا۔ میرے ان ریمارکس پر آپ نے خوش دلی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا ''مجھے تو آپ ابھی تک ویسے ہی زندہ دل اور پرمزاح نظر آ رہے ہیں مگر آپ کا کہنا ہے کہ آج آپ خاصے ''اپ سیٹ'' ہیں۔ وہاٹس رانگ ودھ یو؟''

''بس کچھ گھریلو مسائل ہیں۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ''میں یہاں ان کی وضاحت مناسب نہیں سمجھتا۔''

''او کے قیصر صاحب۔'' میں نے تعاون آمیز لہجے میں کہا ''میں نجی مسائل کی وضاحت کے لئے آپ پر زور نہیں دوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور سوال کیا ''تو آپ کے اس جواب کو عدالت کے ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جائے کہ وقوعہ کے روز جی ایم صاحب لگ بھگ ڈیڑھ بجے آپ کے پاس آئے تھے اور آپ کو بتایا تھا کہ ملزم نے آپ کے مل اونر فرقان حمیدی کو قتل کر دیا ہے؟''

''جی بالکل، میرا فائنل جواب یہی ہے۔''

''کنفیڈنٹ؟''

''یس، کنفیڈنٹ۔''

''کیا آپ لوگوں نے چوکیدار کو فرقان حمیدی کے قتل کے بارے میں بتایا تھا؟''

قیصر عباس نے نفی میں جواب دیا۔ ''بالکل نہیں جناب!'' اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ساعت ختم ہوگیا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! آپ کی جرح ختم ہوگئی یا آئندہ پیشی پر بھی آپ گواہ قیصر عباس سے سوالات کریں گے۔''

میں نے کہا ''گواہ سے مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔''

جج نے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو میرے موکل کی زوجہ عارفہ بھی میرے ساتھ تھی۔ برآمدے میں آکر اس نے پوچھا ''بیگ صاحب! کیا عدالتوں میں تمام مقدمات اسی طرح چلتے ہیں یا ہمارے ساتھ ہی ایسا ہو رہا ہے؟''

''ہمارے ساتھ ایسا کیا ہو رہا ہے؟'' میں چلتے چلتے رک گیا۔

''کتنا ہی عرصہ گزر گیا لیکن ابھی تک جہانگیر کو رہا نہیں کیا گیا۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا ''کیا آپ کا پہلے کسی عدالتی معاملے سے واسطہ پڑا ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا ''اس لئے آپ الجھن کا شکار ہو رہی ہیں حالانکہ ہمارا مقدمہ تو متوقع رفتار سے بھی زیادہ تیز چل رہا ہے۔''

''کیا آپ اپنی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟''

''صد فی صد۔''

''لیکن ابھی تک تو آپ جہانگیر کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکے!''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''میں اب تک جتنی محنت کر چکا ہوں، وہ جہانگیر کو بے گناہ ثابت کرنے ہی کی ایک کڑی ہے۔ آپ کی چوں کہ عدالت کے طریقہ کار سے واقفیت نہیں ہے اس لئے آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ مطمئن ہو جائیں، مقدمے کی ڈور پوری طرح میرے ہاتھ میں ہے۔ ان شاء اللہ آپ کا شوہر بہت جلد باعزت بری بھی ہو جائے گا۔''

وہ شک آمیز انداز میں بولی ''آپ مجھے بہلا تو نہیں رہے؟''

''میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے کلائنٹس کو جھوٹے خواب دکھاتے ہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''آپ کلی طور پر بے فکر ہو جائیں۔ کیس پر میری گرفت بہت زبردست ہے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے پر وثوق لہجے میں کہا ''دراصل میں اپنے ذہن میں جن نکات کو جما کر قدم قدم آگے بڑھا رہا ہوں، آپ ان سے بے خبر ہیں اس لئے ابھی آپ کی تسلی نہیں ہو رہی۔''

''اور وہ اہم نکات کون سے ہیں؟'' عارفہ نے سوال کیا۔

''یہ اہم ترین گفتگو یہاں عدالت کے برآمدے میں کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتی۔'' میں نے دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے کہا ''آپ کسی وقت میرے دفتر تشریف لائیں، پھر میں آپ کو تفصیلات بتاؤں گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر اچانک پوچھا ''بیگ صاحب! آج کی عدالتی کارروائی کے دوران میں متعدد بار میری بیماری کا تذکرہ ہوا ہے حالانکہ یہ کوئی تشویش ناک یا اہم ترین بات نہیں تھی۔ خدانا خواستہ مجھے ایسی کوئی خطرناک بیماری بھی نہیں ہے کہ جسے جہانگیر کی پریشانی سے منسوب کر کے یوں اچھالا جاتا۔''

''آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں گی۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''لیکن عدالتی معاملات بعض اوقات عام یعنی غیر عدالتی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ ذہنی قلابازیوں کا ایک اچھوتا کھیل ہے۔ بات میں سے بات اور واقعات میں سے انکشافات برآمد ہوتے ہیں۔ انتہائی غیر متعلقہ اور معمولی بات بھی بعض اوقات مقدمے کا پاسا پلٹ دیتی ہے۔ اس لئے معاملات کی ظاہری کیفیت سے زیادہ اس کے عواقب و جوانب پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔''

''آپ کی باتیں سن کر تو میرا سر دکھنے لگا ہے۔''

''آپ اپنے دماغ کو نہ تھکائیں تو بہتر ہے'' میں نے کہا ''یہ کام آپ اپنے وکیل کے لئے چھوڑ دیں۔''

''سچ سچ بتائیں۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''آپ روزانہ کتنے بادام کھاتے ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔'' میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے باوجود بھی آپ......!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متعجب انداز میں دیکھنے لگی۔ میں نے اس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا ''......ذہنی کرتبوں میں مصروف رہتا ہوں۔''

وہ بے اختیار مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ تصنع سے پاک تھی۔

میں نے استفساریہ لہجے میں کہا ''تو آپ میرے دفتر آ رہی ہیں۔''

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور دو روز بعد آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ آئندہ پیشی دس روز بعد تھی۔

جج کرسی انصاف پر براجمان تھا۔

☆......☆......☆

دیگر عدالتی عملہ اور مقدمے سے متعلق اہم افراد بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ میرا موکل جہانگیر اکیوزڈ باکس میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ دوسری جانب وٹنس باکس میں استغاثہ کی گواہ

اور مقتول کی بیوہ ستارہ بیگم بڑے طمطراق سے جلوہ افروز تھی۔ اس نے فیروزی رنگ کی ایک بنارسی ساری زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس کے لگ بھگ لگایا۔ وہ پرکشش شخصیت کی مالک ایک جاذب نظر عورت تھی۔ اس کے انداز و حرکات سے شائبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ قبل اس کا شوہر قتل ہو چکا تھا۔

ستارہ بیگم کی گواہی سے قبل گزشتہ دو تین ماہ میں تین ایسے گواہ بھی بھگتائے جا چکے تھے جن کے بیانات یا ان پر ہونے والی جرح میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی اس لئے میں نے ان کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی دوران میں ملزم کی بیوی عارفہ سے بھی میری دو تین...... ملاقاتیں ہوئی تھیں جس کے بعد سے شوہر کے بارے میں اس کے تفکرات میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی۔ اب وہ خاصی مطمئن اور پرامید دکھائی دیتی تھی۔

ستارہ بیگم نے اپنا مختصر سا حلفیہ بیان ریکارڈ کروادیا تو وکیل استغاثہ اس کی جانب بڑھا۔ اس نے دو چار سرسری نوعیت کے سوالات کیے اور جرح ختم کردی۔

اپنی باری پر جرح کا آغاز کرتے ہوئے میں نے ستارہ بیگم کو یوں مخاطب کیا ”ستارہ صاحبہ! آپ کا نام بہت خوبصورت ہے۔“

”تھینک یو۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے گالوں کے ڈمپل واضح کردیئے۔

میں نے کہا ”ستارہ صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی ناگہانی موت کا گہرا صدمہ ہے۔ آپ کے دکھ، درد اور پریشانی کا حساب و شمار ممکن نہیں ہے۔“

یہ بات خاص طور پر میں نے اس لئے کہی تھی کہ اس کی حرکات و سکنات سے کہیں بھی زیاں کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ میری بات کی گہرائی تک پہنچے بغیر بولی ”جی ہاں، آپ درست کہہ رہے ہیں۔“

”میں نے مزید کہا ”آپ بڑی ہمت والی خاتون ہیں۔ شوہر کی موت کا صدمہ تو جاں کاہ ہے ہی، اس سے کچھ عرصہ قبل آپ جوان بیٹی کی جدائی...... ابدی جدائی کو بھی فیس کر چکی ہیں۔“

اس کے چہرے پر افسردگی کا گزران ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہوا، سادے سے لہجے میں بولی ”کیا کریں، یہ سب تو دستور زمانہ ہے۔ وقت کا مرہم ہر زخم بھر دیتا ہے۔“

”اور خاص طور پر جب کچھ ہم دردوں کا ساتھ ہو تو یہ مرہم کچھ زیادہ ہی سرعت سے کام کرتا ہے۔“ میں نے بھی سادے سے لہجے میں کہا ”آپ اس حوالے سے خاصی خوش قسمت واقع ہوئی ہیں۔ دو چار نہ سہی لیکن آپ کو ایک ایسی ہم درد ہستی میسر ہے جس کا سہارا آپ کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“

میں نے گزشتہ چند ماہ کی محنت اور اسی محنت کے نتیجے میں حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں یہ بات کہی تھی۔ ستارہ بیگم نے میری توقع کے مطابق کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ خاور نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔“

خاور سے اس کی مراد ”حمیدی ٹیکسٹائل ملز“ کا جی ایم خاور محمود تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ فرقان حمیدی کے قتل کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی ستارہ بیگم کے قریب نظر آنے لگا تھا۔

میں نے اپنی جرح کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے ذرا مختلف انداز میں سوال کیا ”ستارہ صاحبہ! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کی اکلوتی صاحبزادی مرحومہ فرحین کسی عاطف نامی لڑکے کے عشق میں گرفتار تھی اور مقتول کی سخت پابندیوں سے عاجز آ کر اس نے خودکشی کرلی تھی؟“

”آبجیکشن یور آنر۔“ ستارہ بیگم کے بولنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے جمپ کی ”گواہ کی بیٹی کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ وکیل صفائی خواہ مخواہ ایسی غیر متعلقہ گفتگو کو چھیڑ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں ایسے ہتھکنڈوں سے روکا جائے۔“

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ”جناب عالی! اگر معزز گواہ کو میرے سوال کا جواب دینے میں کوئی اعتراض ہو تو میں اس موضوع کو ختم کردوں گا۔“

اس مرتبہ جج نے استفہامیہ نظر سے ستارہ بیگم کو دیکھا، وہ سنجیدگی سے بولی ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”آپ کی معلومات درست ہیں وکیل صاحب۔ کیا آپ اس سلسلے میں کوئی اور سوال بھی پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے پوچھا ”مقتول کی آپ کے ساتھ رفاقت کا عرصہ کتنا ہے؟“

وہ ایک لمحہ حساب لگانے کے بعد بولی ”لگ بھگ بیس سال۔“

”اس دوران میں آپ نے انہیں کیسا پایا؟“

”آپ کا سوال میں پوری طرح سمجھ نہیں پائی؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میرا مطلب ہے، وہ مزاج کے کیسے تھے؟“

”مرحوم مزاج کے اچھے ہی تھے۔“ اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

میں نے سوال کیا ”میرا اشارہ ان کے مزاج کی اس خصوصیت کی طرف ہے جس کے سبب آپ کی اکلوتی صاحب زادی اپنی جان دینے پر مجبور ہوئی؟“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! وکیل استغاثہ احتجاجی لہجے میں چلایا ”وکیل صفائی بار بار آؤٹ ٹاپک بات کرنے لگتے ہیں۔ انہیں موجودہ مقدمے تک محدود رہنا چاہئے۔“

”بیگ صاحب!“ جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کیا آپ کے اس سوال کا زیر سماعت مقدمے سے کوئی تعلق ہے؟“

”جی بالکل ہے۔“ میں نے یقینی لہجے میں کہا ”مناسب وقت آنے پر میرے سوال اور اس کے نتیجے میں حاصل شدہ جواب کا مفہوم، اہمیت اور افادیت ظاہر ہوجائے گی۔ سردست میں اس کی وضاحت ایک خاص مقصد کے تحت نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس سے آئندہ گواہیوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔“

جج نے تفہیمی انداز میں گردن ہلائی اور گواہ ستارہ بیگم کو میرے سوال کا جواب کی تاکید کی۔
ستارہ بیگم نے میری جانب دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں کہا ”وکیل صاحب! آپ اپنا سوال سادہ الفاظ میں دہرائیں پلیز!“

اس نے لفظ ”پلیز“ کی ادائیگی ایک خاص انداز میں کی تھی جس میں درخواست نما شوخی پائی جاتی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وضاحتی لہجے میں کہا۔

”ستارہ صاحبہ! مقتول کی روک ٹوک، سختی، پابندیاں اور غصے کی وجہ سے فرحین کو وہ قدم اٹھانا پڑا جو اس صورت میں وہ ہرگز نہ اٹھاتی اگر اسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کی بات کو توجہ سے سنا جاتا اور اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جاتا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”آپ سے آسان الفاظ میں میرا سوال یہ ہے کہ آیا مقتول کا یہ سخت گیر رویہ صرف فرحین کے معاملے تک محدود تھا یا وہ گھر اور باہر دوسرے افراد کے ساتھ بھی اسی غصیلے اور سخت برتاؤ کا مظاہرہ کرتے تھے...... خصوصاً آپ کے ساتھ؟“

ستارہ بیگم نے ساری کا پلو درست کرنے کے بعد جواب دیا۔ ”بیگ صاحب! میرے ساتھ تو ان کا سلوک مناسب ہی تھا لیکن یہ بات ہے کہ وہ خاصے غصیلے، سخت اور شکی مزاج تھے۔“

بے دھیانی میں وہ بہت بڑی بات کہہ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کی گہرائی یا اپنے جواب کی اہمیت کو محسوس کر پاتی، میں نے بالکل مختلف انداز میں اگلا سوال کر دیا۔

”ستارہ بیگم! ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز مقتول نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟“

”کاٹن کا شلوار قمیص...... کلف دار...... سفید۔“

میں نے پوچھا ”کیا وہ عموماً یہی لباس پہنتے تھے۔ میرا مطلب شلوار سوٹ سے ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی ”وہ عموماً پینٹ شرٹ پہنتے تھے۔ موسم سرما میں جو کراچی میں چند روزہ ہی ہوتا ہے، وہ فل سوٹ پہنا کرتے تھے۔“

”ستارہ صاحبہ! وقوعہ کے روز شلوار سوٹ پہننے کی خاص وجہ تھی؟“

”وہ جمعے کا دن تھا۔“ ستارہ بیگم نے کہا ”ہر جمعے کو وہ عوامی سوٹ میں فیکٹری جاتے تھے۔“

میں نے کہا ”پینٹ شرٹ پہننے والے افراد عموماً جمعہ کے روز شلوار سوٹ اس لئے پہنتے ہیں کہ انہیں جمعہ کی نماز ادا کرنا ہوتی ہے۔ کیا مقتول بھی جمعے کی نماز ادا کرتے تھے؟“

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال کر دیا ”تو کیا پینٹ شرٹ میں نماز نہیں ہو سکتی۔ کیا اس سلسلے میں کوئی شرعی مسئلہ ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”اس میں نہ تو کوئی شرعی مسئلہ ہے اور نہ ہی کوئی معاشرتی قباحت۔ دراصل یہ ہمارے ہاں کی روایت سی بن گئی ہے۔ میں نے اسی حوالے

سے سوال کیا تھا۔“

وہ معتدل لہجے میں بولی ”بس وہ بھی روایتاً ہی شلوار سوٹ پہن لیا کرتے تھے ورنہ نماز تو انہوں نے کبھی عید بقرعید کی بھی ادا نہیں کی تھی۔“

میں نے پوچھا ”ستارہ صاحبہ! آپ کو اپنے شوہر کے قتل کی اطلاع کس نے دی تھی؟“

”خاور نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔“

”کیا آپ اس وقت اپنی رہائش گاہ...... واقع محمد علی سوسائٹی میں ہی تھیں؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا ”بالکل میں اپنے گھر پر ہی تھی۔“

”خاور محمود نے آپ کو کتنے بجے اطلاع دی تھی؟“

”دوپہر ایک بجکر پینتیس منٹ پر۔“

”اتنا درست وقت آپ بتا رہی ہیں۔“ میں نے اپنے چہرے پر حیرت کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا ”کیا آپ نے اس وقت باقاعدہ گھڑی دیکھی تھی؟“

”جی ہاں، میں نے دیوار گیر کلاک میں وقت دیکھا تھا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ”دراصل اس روز مجھے اپنی ایک دوست کے پاس ٹھیک دو بجے ڈیفنس سوسائٹی جانا تھا یعنی دو بجے وہاں پہنچنا تھا۔ میں بالکل تیار تھی اور گھر سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ خاور کا فون آ گیا چنانچہ میں نے فی الفور اپنی دوست کے پاس جانے کا پروگرام کینسل کر دیا اور فیکٹری کے لئے روانہ ہو گئی۔“

”آپ گھر سے کتنے بجے روانہ ہوئی تھیں؟“

”اسی وقت۔“ وہ قطعیت سے بولی ”ایک پینتیس پر یا زیادہ سے زیادہ ایک سینتیس پر۔ خاور کا فون سننے کے بعد میں نے صرف ایک فون کر کے اپنی دوست کو پروگرام کینسل ہونے کے بارے میں بتایا اور پھر فیکٹری پہنچنے کے لئے گھر سے نکل پڑی تھی۔“

”آپ کتنے بجے فیکٹری پہنچی تھیں۔“

”ٹھیک دو بجے۔“

”یعنی صرف تیئس چوبیس منٹ میں آپ محمد علی سوسائٹی سے سائٹ کے علاقے میں پہنچ گئی تھیں؟“

”بالکل، میں نے آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کی تھی۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولی ”کیا یہ ناممکنات میں سے ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی اور کہا ”آندھی اور طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کر کے تو اس سے پہلے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ یقیناً آپ ٹھیک دو بجے فیکٹری پہنچ گئی ہوں گی۔“ ایک لمحے کو میں سانس لینے کے لئے رکا پھر سوال کیا۔ ”ستارہ صاحبہ! فیکٹری پہنچ کر آپ نے سب سے پہلا کام کیا کیا؟“

آپ نے بتایا ''خاور مجھے اپنے ساتھ فرقان کے کمرے میں لے گیا تھا جہاں میں نے اپنے شوہر کو مردہ حالت میں دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کا سر میز پر ٹکا ہوا تھا۔ ان کی پشت میں لفافے کھولنے والی چھری پیوست تھی جہاں سے ان کی قمیص خون میں تربہ تر تھی۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''پھر میرے کہنے پر خاور نے نزدیکی پولیس سٹیشن فون کیا تھا۔''

''پولیس کتنے بجے وقوعہ پر پہنچی تھی؟''

''تقریباً آدھے گھنٹے بعد۔''

''یعنی ڈھائی بجے؟''

''جی ہاں، کم و بیش ڈھائی بجے۔''

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا ''جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے انکوائری افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

''کیا گواہ ستارہ بیگم پر آپ کی جرح مکمل ہوگئی ہے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

جج کے حکم پر انکوائری افسر عابد حسین وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوگیا۔ عابد حسین رینک کے حساب سے سب انسپکٹر تھا۔ وہ ایک چاق و چوبند اور ذہین پولیس افسر نظر آتا تھا۔ کلف دار وردی میں وہ خاصا اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس اثنا میں استغاثہ کی گواہ ستارہ بیگم کو عدالت کے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔''

''آئی او صاحب!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے انکوائری افسر کو مخاطب کیا ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''جنرل منیجر خاور محمود نے۔''

''اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''

''دو بج کر دو منٹ پر۔''

''آپ جائے واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''لگ بھگ ڈھائی بجے۔''

میں نے پوچھا ''آپ نے استغاثہ میں جائے واردات کے نقشے کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے جس سے لگتا ہے آپ نے خاصی باریک بینی سے مشیر نامہ تیار کیا تھا۔''

وہ میرے منہ سے تعریفی کلمات سن کر خوش ہوگیا، تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا میں نے کہا ''آپ نے بتایا ہے کہ مقتول کی میز پر بہت سے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ ذرا سوچ کر بتائیں، وہ کس قسم کے کاغذات تھے۔ آپ نے رپورٹ میں کاغذات کی نوعیت کا ذکر نہیں کیا؟''

انکوائری افسر نے جواب دیا ''ان میں زیادہ تر بینک سے متعلق کاغذات تھے۔ اسٹیٹ

منٹس، استعمال شدہ چیک بکس۔ کچھ کھلی ہوئی فائلیں تھیں جن میں سے ایک فائل کے اندر چیک بکس کے کاؤنٹر فائلز کا اندراج تھا۔ اسی نوعیت کے دوسرے کاغذات بھی تھے۔''

میں نے پوچھا ''جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو اس وقت مقتول اس دار فانی سے کوچ کر چکا تھا یا ابھی اس کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی؟''

''میں چالان میں اس کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''جب ہم وقوعہ پر پہنچے تو مقتول کا وجود زندگی سے خالی ہو چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ ہم دو بج کر تیس منٹ پر جائے وقوعہ پر پہنچے تھے لہٰذا اس بات میں کسی شک و تردید کی گنجائش باقی نہیں کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مقتول کا وصال ہو چکا تھا۔''

''شکریہ سب انسپکٹر صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''آپ لگ بھگ ڈھائی بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ ملزم کو آپ نے ساڑھے چار بجے گرفتار کیا۔ کیا سائٹ سے محمود آباد تک سفر میں آپ کو دو...... گھنٹے لگ گئے تھے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل فیکٹری پہنچنے پر ہم موقع کی ضروری کارروائی میں مصروف ہوگئے تھے اس لئے ملزم کی گرفتاری میں کچھ تاخیر ہوگئی۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرے موکل ہی نے مقتول کی جان لی ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا ''آپ نے ملزم جہانگیر کے بجائے کسی اور کو کیوں نہ گرفتار کرلیا؟''

''دیکھیں جناب۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا ''پولیس کے پاس جادو کا چراغ نہیں ہوتا جس کو رگڑنے کے بعد وہ ہر ''ناممکن'' کو ''ممکن'' بنالے۔ نہ ہی ہم ٹیلی پیتھی کے ماہر ہوتے ہیں کہ کسی انسانی مدد یا سہارے کے بغیر مجرم کی گردن ناپنے پہنچ جائیں۔ ہم بھی آپ جیسے عام انسان ہوتے ہیں۔ ہمارے کام کا ایک طریقہ کار ہے۔ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول اور واقعاتی شہادتوں کے زور پر چلتی ہے۔ ہم موقع کے گواہوں کے بیانات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موقع کے کسی گواہ نے آپ کو بتایا تھا کہ فرقان حمیدی کو میرے موکل جہانگیر نے قتل کیا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''اسی لئے آپ سیدھے محمود آباد کی جانب میرے موکل کو گرفتار کرنے دوڑ پڑے؟''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ تصدیقی لہجے میں گویا ہوا۔ ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز کے جنرل منیجر نے اس جانب ہماری رہنمائی کی تھی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اور جی ایم صاحب کی یہ راہنمائی بروقت تھی۔ بعد میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ نے بھی یہ بات ثابت کردی۔ آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے واضح نشانات پائے گئے ہیں۔''

''تھینک یو سو مچ مائی ڈیئر انکوائری افسر۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اپنی جرح ختم کردی۔

''عدالت کا وقت ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے لہٰذا جج نے اگلی تاریخ دے کر

عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

☆......☆......☆

وٹنس باکس میں خاور محمود کھڑا تھا۔

خاور محمود "حمیدی ٹیکسٹائل ملز" کا جنرل منیجر اور استغاثہ کا سب سے اہم گواہ تھا۔ اس کی ع
پینتالیس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ اس کی صحت اچھی تھی تاہم اس کے سر کا "ایم بہت تیزی سے "ی
میں تبدیل ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک خوش شکل اور گراں ڈیل شخص تھا۔ اس نے موسم کی مناسبت
سے سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد خاور محمود نے عدالت کے روبرو جو بیان دیا میں اس کی
تفصیل میں جائے بغیر براہ راست جرح کا احوال بیان کرتا ہوں۔ قارئین دوران سوال و جواب اس
کے بیان سے خود ہی آگاہی حاصل کر لیں گے۔ گواہ کا بیان ریکارڈ ہونے کے بعد وکیل استغاثہ نے
سرسری سی جرح کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ملزم، مقتول کے خلاف دل میں عناد رکھتا تھا اور قرض
سے انکار کے بعد وہ مقتول کے خلاف گفتگو کرنے لگا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی باری پر جرح کے لئے آگے بڑھا اور کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا "خاور صاحب! میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے!"

"کس سلسلے میں جناب؟"

"آپ بہت انسان دوست ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں!" اس کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

میں نے کہا "آپ نے کڑے وقت میں ستارہ بیگم کی بہت مدد کی ہے۔ اگر آپ کا تعاون
انہیں حاصل نہ ہوتا تو "حمیدی ٹیکسٹائل ملز" کبھی کی بند ہو چکی ہوتی۔ بیگم صاحبہ کو تو فیکٹری چلانے
کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن آپ کی بھرپور گائیڈنس اور براہ راست نگرانی نے کام اور فیکٹری کے
معاملات میں رتی برابر فرق نہیں آنے دیا۔ آپ واقعی تعریف کے قابل ہیں۔"

وہ بولا "آپ تو خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں وکیل صاحب۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

"ہر وفادار ملازم اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔" میں نے ذومعنی لہجے میں کہا
"آپ کی فیکٹری سے وفاداری بھی شک وشبے سے بالاتر ہے۔"

وہ جلدی سے بولا "وکیل صاحب! ایک بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ
مرحوم فرقان صاحب نے کبھی مجھے ملازم نہیں سمجھا تھا۔ وہ کہتے تھے، میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میں
نے بھی کبھی ملازموں کی طرح ڈیوٹی نہیں بھگتائی بلکہ اس کام کو ہمیشہ اپنا سمجھ کر کیا ہے۔"

"مقتول کے قتل کے بعد تو آپ کی ذمے داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔" میں نے کہا
"اب تو آپ کو اپنی بھاوج کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیوں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

خاور نے جھینپ کر پہلے جج کو اور پھر وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس کی نظر میں چور واضح

ائی دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے نگاہ ملائے بغیر بولا۔ "آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ بھابی ستارہ
ب مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی ہیں۔ فرقان صاحب کی موت کے بعد وہ بہت زیادہ تنہا ہو گئی
ہیں۔"

"اور آپ ان کی تنہائی دور کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے
میں کہا "بعض اوقات تو آپ کو خاصی دیر تک رات میں ان کے پاس رکنا پڑتا ہے...... اور کبھی کبھار
آپ رات بھی انہی کے بنگلے پر گزارتے ہیں۔ ہیں نا؟"

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی "آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی ایک مرتبہ پھر آؤٹ
آف روٹ جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ موجودہ گفتگو کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں میرے فاضل دوست؟" میں نے وکیل استغاثہ کو گھورا۔

"میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات تو روز
روشن کی طرح عیاں ہے۔"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنے سوال کا زیر سماعت
مقدمے سے روٹ ثابت کریں۔"

"آل رائٹ یور آنر۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اس مقدمے میں مقتول کو مرکزی
حیثیت حاصل ہے جبکہ خاور محمود اور ستارہ بیگم استغاثہ کے اہم ترین گواہ ہیں۔ یہ تینوں ایسے سٹیشن ہیں
جو ایک ہی روٹ پر پڑتے ہیں اس لئے ان تینوں کے بارے میں گفتگو کسی بھی طور "آؤٹ آف دی
روٹ" نہیں ہو سکتی۔"

"جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے شکایتی لہجے میں کہا "وکیل صفائی الفاظ سے کھیلنے کی
کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میرے فاضل دوست! الفاظ کا سچا کھلاڑی درحقیقت وکیل ہی ہوتا ہے۔ وہ
دلائل پیش کر کے مقدمہ جیتتا ہے، وہ الفاظ پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ کیا آپ الفاظ کا سہارا لئے بغیر
معزز عدالت سے یہ شکایت کر سکتے ہیں کہ میں الفاظ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

وکیل استغاثہ کھسیانا سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

جج نے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔"

"خاور محمود صاحب!" میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
"فرقان صاحب کی زندگی میں آپ کو فیکٹری سے کتنی تنخواہ ملتی تھی؟"

"یہ تو سراسر انکم ٹیکس کا معاملہ ہے۔" وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "آپ اپنی اصل آمدن نہ بتائیں۔ بس اسی رقم کا ذکر کریں جو آپ کو بطور
تنخواہ ملتی تھی؟"

اس نے جواب دیا "فرقان صاحب نے کبھی میرے ساتھ ملازموں والا برتاؤ نہیں کیا تھا

اس لئے ہمارے درمیان حساب کتاب نامی کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔'' اس نے ٹال مٹول سے کام لینے کی کوشش کی۔

میں نے کہا ''فیکٹری کے سیلری رجسٹر میں تنخواہ کی مد میں آپ کو کی جانے والی ادائیگی کا اندراج ہوتا ہے وہ رقم بتادیں۔''

''آٹھ ہزار روپے۔''

''سالانہ یا روزانہ؟''

''ماہانہ۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''خاور محمود صاحب!'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''فرقان صاحب کے قتل کے بعد جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے آپ اعتراف بھی کر چکے ہیں، آپ کی ذمے داریوں میں بے انتہا اضافہ ہوگیا ہے۔ فیکٹری میں جو کام فرقان حمیدی سنبھالتے تھے، وہ بھی آپ ہی کو دیکھنا پڑ رہا ہے، علاوہ ازیں اپنی منہ بولی بھاوج کی دل جوئی کے لئے بھی آپ کو خاصا وقت دینا پڑتا ہے۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ ذمے داریوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ آیا آپ کی تنخواہ میں بھی کوئی صحت مند اضافہ ہوا ہے؟''

وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا، مجھے ملازم نہیں سمجھا جاتا۔''

''پھر کیا سمجھا جاتا ہے؟''

''یہ میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''میں زور بھی نہیں دوں گا۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا ''البتہ یہ بات تو آپ کو بتانا ہی ہوگی کہ اگر آپ کو فیکٹری کا ملازم نہیں سمجھا جاتا تو کیا آپ خود کو فیکٹری کا مالک سمجھتے ہیں؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''آپ کو 'حمیدی ٹیکسٹائل ملز' میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''تقریباً پندرہ سال۔''

میں اس قسم کے سوالات دانستہ کر رہا تھا جو بظاہر غیر متعلق محسوس ہوتے تھے لیکن ان کے پیچھے میرا ایک خاص مقصد پوشیدہ تھا۔ جج کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرے مقصد تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

میں نے گواہ خاور محمود سے پوچھا۔ خاور صاحب! آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟''

''گلشن اقبال میں۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے تین بچے ہیں؟'' میں نے بڑی محنت سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں سوال کیا۔

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''کیا یہ بھی سچ ہے کہ آپ کی بیوی کا تعلق حیدرآباد سے ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے اگلا سوال کیا ''خاور صاحب! کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ کراچی میں آپ کا کوئی نزدیکی رشتے دار نہیں ہے؟''

''میں انکار نہیں کروں گا۔'' وہ بڑی شرافت سے بولا ''ثریا کے گھر والے اور دیگر رشتہ دار حیدرآباد میں ہیں۔ میں بھی کراچی میں اکیلا ہوں۔ میرے خاندان کے تمام افراد لاہور میں ہوتے ہیں۔ سال ہا سال سے میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ بس کچھ اندرون خانہ رنجشیں ہیں جو ملنے نہیں دیتیں۔''

''اور اب آپ اپنے گلشن اقبال والے گھر میں بھی کچھ نئی قسم کی رنجشوں کے بیج بونے کی تیاری کر رہے ہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''کراچی میں آپ کا اور آپ کے بیوی بچوں کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار موجود نہیں ہے' اس کے باوجود بھی آپ ستارہ بیگم کی ''دل داری'' کی خاطر اکثر اپنی فیملی کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں؟''

خاور نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایسی نظر سے جج کی جانب دیکھا جیسے دال میں کچھ کالا ہو۔ مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں چاہیے تھا۔ میں اپنی کوشش میں خاصا کامیاب رہا تھا۔ میں نے اپنی جرح جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''خاور صاحب! آپ ہی وہ شخص ہیں جس نے سب سے پہلے مقتول کی لاش کو دیکھا تھا۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں' آپ درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''آپ ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ مقتول ہو چکے تھے؟''

''جی ہاں...... جی نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا اور پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولنا چاہا ہی تھا کہ جج بول اٹھا۔ ''مسٹر خاور محمود! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔ ''ہاں'' میں یا ''نہ'' میں۔''

خاور محمود کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ چہرے کے تاثرات سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بری طرح پھنس گیا ہو۔ جواب دینا بھی ضروری تھا۔ بہ حالت مجبوری اس نے بتایا۔

''جب میں فرقان صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنی میز پر گردن ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔ میں ان کے قریب گیا تو ان کی پشت میں پیوست نائف پر میری نظر پڑ گئی اور پھر ساری صورتحال میری سمجھ میں آ گئی۔''

''یعنی آپ نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ قتل میرے موکل نے کیا تھا؟''

"جی ہاں...... جی ہاں۔" وہ بے ترتیب لہجے میں بولا "اور بعدازاں فنگر پرنٹس کی رپورٹ سے اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔"

میں نے پوچھا "خاور صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا اور مقتول کا کمرا برابر برابر ہے یعنی دونوں کمروں کی دیوار مشترک ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "مقتول نے بہ قول آپ کے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور جب آپ وہاں پہنچے تو وہ قتل ہو چکے تھے۔ آپ نے اپنے کمرے سے نکل کر مقتول کے کمرے میں جانے میں کتنا وقت لگایا تھا؟"

"وہ...... وہ......" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں کچھ بتانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا وہ وہ؟"

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ فرقان صاحب نے دس پندرہ منٹ پہلے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔" خاور محمود بات بتاتے ہوئے بولا "انہوں نے کہا تھا کہ اس وقت جہانگیر میرے پاس ہے۔ یہ چلا جائے تو تم آ جانا...... لل...... لیکن میں کام میں اتنا مصروف تھا کہ ایک دو منٹ کے بجائے پورے پندرہ منٹ بعد ان کے کمرے میں پہنچا تھا لیکن اس وقت تک ملزم اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔"

اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے کر صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی ڈھیل دے کر کھینچنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے سوال کیا۔

"خاور صاحب! کیا آپ نے مقتول کو دیکھتے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا کام تمام ہو چکا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا "یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ زندہ ہوتا۔ آپ نے مقتول کو طبی امداد دینے کے بارے میں کیوں نہ سوچا؟"

"ایسی کوئی بھی کوشش فضول ہوتی۔" وہ قطعیت سے بولا "مجھے یقین تھا کہ میں اپنی ایک قریب ترین ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا ہوں۔"

"وہ ہستی آپ سے جدا ہو گئی تھی یا آپ اس ہستی سے جدا ہو گئے تھے؟"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا "آپ جو بھی سمجھ لیں۔"

میں نے کہا "خاور صاحب! جب آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ کی عزیز ترین ہستی آپ سے بچھڑ چکی ہے تو آپ نے سب سے پہلے کیا کیا تھا؟"

"میں نے فی الفور ملزم کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"سب سے پہلے آپ نے اسے کہاں تلاش کیا؟"

"قیصر عباس کے کمرے میں۔"

"وہیں کیوں...... کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"ملزم اکثر و بیشتر وہیں نظر آتا تھا۔" جی ایم نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "پھر کیا آپ ملزم کو پانے میں کامیاب ہو گئے؟"

"نہیں، ملزم وہاں سے جا چکا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں قیصر کے ساتھ فیکٹری کے بیرونی گیٹ پر پہنچا اور چوکیدار سے ملزم کے بارے میں نفسار کیا۔" خاور نے بتایا "لیکن چوکیدار سے معلوم ہوا کہ ملزم اپنے گھر جا چکا ہے۔"

میں نے پوچھا "جب آپ قیصر عباس کے ساتھ فیکٹری کے بیرونی گیٹ پر پہنچے تو اس ت چوکیدار کیا کر رہا تھا؟"

"وہ جمعے کی نماز کیلئے جانے کا ارادہ کر رہا تھا؟"

"کیا آپ نے اسے فرقان حمیدی کے قتل کے بارے میں بتایا تھا؟"

"جی ہاں، سرسری سا ذکر کیا تھا؟"

"پھر اس کا ردعمل کیا تھا؟"

"اس نے کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور نماز پڑھنے چلا گیا۔"

وہ ایک غیر منطقی بات کر رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ چوکیدار گل زمان خان قتل کی ایک خبر سن ر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ قتل کی اطلاع گل زمان کو دی ہی نہیں گئی ی۔ استغاثہ کے گواہ قیصر عباس نے میری جرح کے جواب میں عدالت کے روبرو یہ اقرار کیا تھا کہ ہوں نے چوکیدار کو فرقان حمیدی کے قتل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ظاہر ہے خاور محمود ہی دروغ وئی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اسے رگڑا دیتے ہوئے سوال کیا۔

"خاور صاحب! کیا یہ بات کچھ عجیب سی نہیں لگتی کہ گل زمان اتنی بڑی خبر سننے کے بعد ی خاموشی سے نماز پڑھنے چلا گیا تھا...... بغیر کوئی ردعمل ظاہر کیے؟"

وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا "میں آپ کے سوال کا جواب اس کے علاوہ اور کیا دے کتا ہوں کہ گل زمان خان ایک پٹھان آدمی ہے جو نماز کے بہت پابند ہوتے ہیں۔"

"یہ آپ گل زمان خان کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقید؟" "آپ جو چاہے سمجھ لیں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے اگلا سوال کیا "اس کے بعد آپ نے کون سا لی قدم اٹھایا تھا خاور محمود صاحب؟"

میں چاہتا تو اس بات کا حوالہ دے سکتا تھا کہ استغاثہ کا گواہ قیصر عباس واشگاف الفاظ میں عزز عدالت کو بتا چکا ہے کہ انہوں نے چوکیدار سے فرقان حمیدی کے قتل کے بارے میں کوئی بات ہیں کی تھی لیکن میں نے دانستہ اس بحث کو فی الحال نظرانداز کرنا ہی بہتر جانا۔ ویسے فکر کی کوئی بات ہیں تھی یہ حقیقت عدالت کے ریکارڈ پر آ چکی تھی اور تصدیق کے لیے گواہ قیصر عباس کو دوبارہ دالت میں بلایا جا سکتا تھا۔

خاور محمود نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ’’پھر میں نے فوراً پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے ٹیلیفون کیا تھا؟‘‘

’’یہ کتنے بجے کی بات ہے؟‘‘

’’ایک پینتیس کی۔‘‘

’’پولیس کو فون کرتے وقت آپ کے ساتھ اور کون تھا‘‘

’’قیصر عباس۔‘‘

’’اس کے علاوہ؟‘‘

’’کوئی نہیں۔‘‘

’’اس کے بعد آپ نے کہیں اور بھی فون کیا تھا؟‘‘

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر کہا ’’ہاں‘ میں نے ایک فون ستارہ بیگم کو بھی کیا تھا ان کے شوہر کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں مطلع کرنے کیلئے۔‘‘

’’یہ فون آپ نے کتنے بجے کیا تھا؟‘‘

’’تقریباً ایک بج کر چالیس منٹ پر۔‘‘

’’بیگم صاحبہ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچی تھیں؟‘‘

’’لگ بھگ دو بجے۔‘‘

’’اور پولیس؟‘‘

’’وہ لوگ ڈھائی بجے پہنچے تھے۔‘‘

’’حیرت ہے۔‘‘ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ’’ستارہ بیگم تو دور دراز علاقے محمد علی سوسائٹی سے کم و بیش پچیس منٹ میں وہاں پہنچ گئیں اور پولیس کو نزدیکی تھانے سے آتے ہوئے لگ بھگ ایک گھنٹہ لگ گیا۔‘‘

’’آپ اپنی حیرت کا اظہار پولیس والوں کے سامنے کریں۔‘‘ خاور محمود بے پروائی سے بولا ’’وہی آپ کی تسلی کر سکیں گے۔‘‘

’’میں نے ان سے ذکر کیا تھا۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ’’اور اس سلسلے میں ستارہ بیگم سے بھی مکالمہ ہو چکا ہے...... معزز عدالت کے روبرو لیکن ان دونوں نے میرے سوالات کے جواب میں ایک انوکھی کہانی سنائی ہے۔‘‘ میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں توقع کر رہا تھا کہ میرے چپ ہوتے ہی خاور محمود کچھ بولے گا لیکن وہ الجھن زدہ سی نظر سے مجھے تکتا رہا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’خاور صاحب! آپ نہ بھی سننا چاہیں لیکن میں آپ کو وہ انوکھی کہانی ضرور سناؤں گا۔‘‘

ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ’’خاور صاحب! پولیس کے مطابق آپ نے انہیں اس واقعے کی اطلاع دو بج کر دو منٹ پر دی تھی۔ پولیس کے

روزنامچے میں بھی یہی وقت درج ہے۔ اس کے علاوہ ستارہ بیگم نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے ان کی موجودگی میں لگ بھگ اتنے ہی بجے پولیس کو فون کیا تھا۔ آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟‘‘

’’اجی! ہماری پولیس کی دروغ گوئی تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔‘‘ وہ جانے کس ترنگ میں تھا جو اتنا غیر محتاط ہو گیا تھا۔ بے پروائی سے بولا ’’وہ اپنی نالائقیوں کو چھپانے کیلئے وقت کا ہیر پھیر کرتی ہی رہتی ہے۔‘‘

اس کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے دیکھا‘ انکوائری افسر کینہ توز نگاہ سے خاور کو گھور رہا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک اور کاری ضرب لگائی۔

’’خاور صاحب! چلیں مان لیا‘ پولیس کی ہیرا پھیری اور چکر بازیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں لیکن اپنی ولی نعمت ستارہ بیگم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ کیا ان کا بیان بھی مبنی بر دروغ ہے؟‘‘

اس کے پاس میرے سوال کا کوئی مناسب جواب نہیں تھا اس لیے اس نے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ میں نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ میں عدالت کے علم میں جو بات لانا چاہتا تھا۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ میری کامرانی کا سفر کڑی در کڑی خاطر خواہ آگے بڑھ رہا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ مجھے کسی کام کی جلدی نہیں تھی۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ خاور محمود پر میں اپنی جرح مکمل کر چکا تھا۔ جج نے آئندہ پیشی کیلئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

منظر اسی عدالت کا تھا اور میرا موکل جہانگیر وکیل استغاثہ کی جرح کا سامنا کر رہا تھا۔ وکیل مخالف کا انداز بہت جارحانہ‘ تیور معاندانہ اور لہجہ فرعونانہ تھا۔

’’ملزم جہانگیر! کیا یہ سچ ہے کہ فرقان حمیدی کو تم نے قتل کیا ہے؟‘‘

’’یہ سفید جھوٹ ہے۔‘‘ میرے موکل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے جہانگیر کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وکیل استغاثہ کا سامنا کرتے ہوئے اسے کون سے سوال کا جواب کیا اور کس انداز میں دینا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ میری توقعات پر پورا اترے گا۔ میں نے اسے جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی بھی تاکید کی تھی۔ جوش میں آ کر ہوش کھونا کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا ’’ملزم جہانگیر! تم نے ’’حمیدی ٹیکسٹائل ملز‘‘ میں کتنا عرصہ کام کیا تھا؟‘‘

’’گرفتاری کے وقت تک مجھے وہاں کام کرتے ہوئے لگ بھگ آٹھ سال ہوئے تھے۔‘‘

جہانگیر نے معتدل لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا ''کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ ''حمیدی ٹیکسٹائل ملز'' میں ملازم ہونے سے پہلے تم ایک ٹریڈنگ کمپنی میں آؤٹ ڈور کلرک کے طور پر کام کرتے تھے۔''

''یہ سچ ہے اس لیے مجھے انکار کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔''

''اس ٹریڈنگ کمپنی کا نام کیا تھا؟''

''کے این ڈی ٹریڈنگ کمپنی۔''

''تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا۔'' وکیل استغاثہ نے تیز نظر سے ملزم کو گھورتے ہوئے سوال کیا ''مذکورہ کمپنی میں چوری ہوگئی تھی اور اس چوری کے الزام میں تمہیں جیل ہوگئی تھی۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کا بیان آدھے سچ پر مشتمل ہے۔''

''آدھا سچ' کیا مطلب؟''

ملزم نے نہایت ہی سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا ''کے این ڈی ٹریڈنگ کمپنی میں واقعی چوری ہوئی تھی اور اس چوری کے ذیل میں مجھے جیل بھیج دیا گیا تھا لیکن تین ماہ بعد ہی اصل چور پکڑا گیا تھا اور مجھے سزا کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی باعزت رہا کر دیا گیا تھا۔ کمپنی کے مالک نے میرے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کے ازالے کیلئے میری تنخواہ میں گراں قدر اضافہ بھی کیا تھا اور ایک خاصی معقول رقم سے میری اشک شوئی کی کوشش بھی فرمائی تھی۔ میں نے ہتک عزت کے زمرے میں وہ معقول رقم تو وصول کر لی تھی البتہ اس کمپنی میں مزید کام کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ آپ اب تو آدھے سچ کی حقیقت کو سمجھ گئے ہیں یا مزید تشریح کی ضرورت ہے!''

وکیل استغاثہ نے شکست خوردہ نظر سے ملزم کو دیکھا۔ واضح طور پر جہانگیر نے وکیل مخالف کی چال اسی پر لوٹا دی تھی۔ وکیل استغاثہ اتنی آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھا اس نے قدرے تیز لہجے میں اپنی جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ملزم جہانگیر! میرے ریکارڈ کے مطابق کے این ڈی ٹریڈنگ کمپنی' میں کام کرنے سے پہلے تم ایک شپنگ کمپنی میں کام کرتے تھے۔ اس شپنگ کمپنی کا نام ''سیون سیز'' تھا؟''

ملزم نے نہایت ہی متحمل لہجے میں جواب دیا ''آپ کا ریکارڈ درست ہے۔''

''وہاں تم نے صرف ایک سال کام کیا تھا؟''

''پھر تمہیں وہاں سے نکال دیا گیا تھا؟''

''آپ کا خیال غیر صحت مندانہ ہے۔''

''کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ اس شپنگ کمپنی کے مالک کو تم پر شک ہوگیا تھا کہ تم اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں اس کی بیگم کو آگاہ کرتے رہتے ہو۔ وہ تمہیں اپنی بیگم کا جاسوس سمجھنے لگا تھا پھر جب اس نے تمہیں خریدنے کی کوشش کی اور جواباً بیگم صاحبہ کی جاسوسی پر مامور کرنا چاہا تو تم اپنی ''کارروائیوں'' ہی سے مکر گئے اور نتیجتاً تمہیں نوکری سے نکال دیا گیا؟''

''میں نے عرض کیا نا' وکیل صاحب! آپ کے دعوے کی صحت مشکوک ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کی معلومات انتہائی ناقص اور یکطرفہ ہیں۔ حقیقت سے آپ کوسوں دور ہیں۔''

''اور حقیقت کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

''حقیقت یہ ہے جناب کہ میں ایسی کسی بھی غیر اخلاقی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔''

جہانگیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''کمپنی کے مالک کو اگرچہ مجھ پر شبہ تھا اس سلسلے میں لیکن باوجود ہزار کوشش کے بھی وہ مجھ پر یہ الزام ثابت نہیں کر سکا تھا۔ شپنگ کمپنی کے دفتر میں اس بات کا خاصا چرچا ہوا تھا لہٰذا میں نے خود ہی اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ کمپنی کی فائلوں میں میرا وہ استعفیٰ اب بھی کہیں موجود ہوگا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ میں نے خود اپنی مرضی سے وہ ملازمت ترک کی تھی اور یہ کہ...... مجھے نوکری سے ہرگز ہرگز نہیں نکالا گیا تھا۔''

جج بہت دلچسپی سے ملزم کے مدبرانہ اور پرمغز جوابات سن رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کو اپنے مقصد میں ایک بار پھر ناکامی ہوئی تو وہ قدرے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ وہ حتی الوسع ملزم کی کردار کشی کا عزم کیے کھڑا تھا۔

اس نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا ''ملزم جہانگیر! غزالہ والے واقعے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

لگتا ہے وکیل استغاثہ نے ملزم کے حالات زندگی پر ''پی ایچ ڈی'' کر رکھا تھا۔ وہ کھود کھود کر ایک ایک واقعے کو نکال رہا تھا لیکن میرا موکل بھی پوری طرح فارم میں تھا اور بہت سنبھل سنبھل کر اسٹروک کھیل رہا تھا۔ اس نے لاتعلقانہ انداز میں استفسار کیا۔

''کون غزالہ؟''

''وہی غزالہ جسے تم چھیڑنے کے جرم میں ذلیل و رسوا ہوئے تھے۔''

''میں تو ایسی کسی غزالہ سے واقف نہیں ہوں۔''

''ذہن پر زور ڈالو گے تو سب کچھ یاد آ جائے گا۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا پھر خود ہی وضاحتی لہجے میں کہا ''ٹھہرو' میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''سیون سیز شپنگ'' کمپنی میں ملازمت سے پہلے تم ایک ریٹائرڈ افسر کے بنگلے پر کام کرتے تھے۔ اس ریٹائرڈ افسر کی نوجوان بیٹی کا نام غزالہ تھا! کچھ یاد آیا؟''

''اچھا' اچھا' آپ اس غزالہ کا تذکرہ کر رہے ہیں۔''

ملزم نے بے اعتنائی سے کہا ''وہ غزالہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''جی ہاں' میں اسی غزالہ کی بات کر رہا ہوں۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی ''جب مذکورہ غزالہ نے اپنے ڈیڈی سے تمہاری نازیبا حرکت کی شکایت کی تو اس کے ڈیڈی نے تمہیں سخت سست کہنے کے بعد فوراً نوکری سے نکال دیا تھا۔ کتنے بے آبرو ہو کر تم اس بنگلے سے نکلے تھے؟''

ملزم جہانگیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''جناب وکیل محترم! پہلی بات تو یہ کہ میں اس بنگلے سے قطعاً بے آبرو ہو کر نہیں نکلا تھا کیونکہ میں نے آپ کے بیان کے مطابق کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی اور......''

''پھر غزالہ نے تمہاری شکایت کیوں کی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا ''آخر تم نے کچھ نہ کچھ بے ہودگی تو کی ہو گی نا؟''

جہانگیر نے باری باری مجھے وکیل استغاثہ اور جج کو دیکھا پھر ایک لمحے کے توقف سے بولنا شروع کیا ''میں نے کوئی نازیبا حرکت کی تھی اور نہ ہی کوئی بے ہودہ بات مگر......''

وکیل استغاثہ نے دوبارہ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا پھر تم نے کیا کیا تھا؟''

''میں نے یہ کیا تھا!'' جہانگیر نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر لگاوٹ آمیز انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکرانے لگا۔

وکیل استغاثہ بوکھلا گیا ''یہ تم کیا حرکت کر رہے ہو؟''

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' جہانگیر نے بے خودی کے عالم میں کہا۔

''تم ہوش میں تو ہو۔'' وکیل استغاثہ نے سخت لہجے میں کہا ''یہ عدالت کا کمرا ہے کوئی سینما ہال نہیں۔''

جج نے ملزم کو سرزنش کی ''عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔''

اس مقدمے کے ملزم اور میرے موکل جہانگیر نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''جناب عالی! میں معزز عدالت کے وقار کو مجروح کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے تو معزز وکیل استغاثہ کے سوال کا عملی جواب پیش کیا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جج خاصا متعجب تھا۔

ملزم نے کہا ''جناب عالی! وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے غزالہ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ان کے جواب میں میں نے یہ بتایا ہے کہ میں نے غزالہ کے حسن کی تعریف کی تھی جیسے عملی طور پر میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیل کو کہا ہے...... آپ بہت خوب صورت ہیں...... بالکل ایسے ہی میں نے غزالہ سے بے ساختہ کہا تھا...... آپ بہت خوب صورت ہیں۔ اس میں بھلا نازیبا یا بے ہودہ بات کون سی ہے۔ کسی کی تعریف کرنا کسی بھی طور جرم کے ذیل میں نہیں آتا۔ غزالہ مجھے اچھی لگی' میں نے اس کے حسن کے بارے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا۔ وہ میری اس بے باکی کو جانے کیا سمجھی کہ اپنے ڈیڈی سے تذکرہ کر بیٹھی۔ اس کے ڈیڈی نے مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی کوشش کی اور زمانے کی اونچ نیچ بتانے لگے۔ انہوں نے مجھے ذلیل و رسوا کیا تھا اور نہ ہی میں ان کے بنگلے سے بے آبرو ہو کر نکلا تھا بلکہ میں نے خود ہی وہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اس میں میری بے اختیاری کو خاص دخل تھا۔ غزالہ واقعی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ اگر میں اس بنگلے میں رہتا تو اس کے حسن کو خراج عقیدت پیش کرنے سے دل کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری جانب میں اس کے ڈیڈی کا

بھی بے انتہا احسان مند تھا لہٰذا کسی قسم کی شرمندگی یا بدمزگی سے پیش تر ہی میں نے خاموشی سے وہ بنگلا چھوڑ دیا کسی کو بتائے بغیر......''

وکیل استغاثہ کی ملزم کو چور' لوفر' بدمعاش اور گھٹیا آدمی ثابت کرنے کی ہر سعی لاحاصل ثابت ہوئی تو وہ کھسیاہٹ میں غیر متعلقہ اور سرسری سے سوالات پوچھنے لگا۔ ملزم جہانگیر نہایت تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں سب سے زیادہ صبر و برداشت کا مظاہرہ ملزم ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہی سب سے بڑا وکٹم ہوتا ہے۔

وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو میں چند سوالات کے لیے اکیوزڈ باکس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا موکل کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میں نے پہلا سوال کیا۔

''جہانگیر! تمہارا قد کتنا ہو گا؟''

''چار فٹ اور ساڑھے گیارہ انچ''

''یعنی لگ بھگ پانچ فٹ؟''

''کہا جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''اور وزن کتنا ہے تمہارا؟''

''ستر کلوگرام۔'' اس نے جواب دیا۔

اس مقدمے میں یہ ایک حیرت انگیز طبعی تضاد دیکھنے میں آیا تھا۔ استغاثہ کا گواہ قیصر عباس غیر معمولی دراز قامت اور دبلا پتلا تھا جب کہ ملزم غیر معمولی پستہ قامت اور قدرے فربہ تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی ناممکن بات بھی نہیں تھی۔

''جہانگیر!'' میں نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''وقوعہ کے روز تم مقتول سے چھٹی لینے کے بعد فوراً گھر روانہ کیوں نہیں ہو گئے تھے۔ تم بیس پچیس منٹ تک فیکٹری میں رکنے کے بعد وہاں سے گئے تھے۔ اس وقت کا زیادہ تر حصہ تم نے فیکٹری کے چوکیدار کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے گزارا تھا؟''

''میرے فی الفور وہاں سے نہ نکلنے کی ایک خاص وجہ تھی۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ''فیکٹری سے گھر تک پہنچنے میں مجھے لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا ہے۔ اگر میں فوراً وہاں سے روانہ ہو جاتا تو جمعہ کی نماز کا وقت دوران سفر میں کٹ جاتا۔ میں جمعہ کی نماز کو کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے سوچا' نماز ادا کرنے کے بعد ہی بس میں بیٹھوں گا۔ نماز میں چوں کہ تھوڑا وقت باقی تھا اس لیے میں چوکیدار کے پاس رک گیا تھا۔''

میں نے پوچھا ''کیا تم چوکیدار گل زمان خان کے ساتھ ہی نماز پڑھنے گئے تھے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔ چوکیدار کے بیان سے بھی یہی بات ظاہر ہوئی تھی۔ میں نے مزید پوچھا۔

''جہانگیر! جب تم جمعے کی نماز کی خاطر لگ بھگ آدھا گھنٹا چوکیدار کے پاس ٹھہرے تھے تو

پھراس کے ساتھ ہی نماز ادا کرنے کیوں نہیں گئے تھے؟''

اس نے بتایا کہ وہ اس دن جمعے کی نماز پڑھنے اس مسجد کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں نماز جلد شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں جمعہ کی نماز قدرے جلدی ہو جاتی ہے جبکہ گل زمان خان کا ساتھ دینے کے لئے اسے مزید آدھا گھنٹہ رکنا پڑتا ورنہ عموماً وہ چوکیدار کے ساتھ ہی مسجد جایا کرتا تھا۔

''جہانگیر! تمہیں اپنی بریت کا کتنا یقین ہے؟''

''ایک سو ایک فیصد۔''

''اس یقین کی کوئی خاص وجہ؟''

''یہ یقین بے گناہی ہے۔''

میں نے سیلوفین بیگ میں محفوظ آلہ قتل ملزم کی نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا
''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں جناب۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''یہ وہی چھری ہے جس کی مدد سے میں حمیدی صاحب کی ڈاک کھولا کرتا تھا۔''

میں نے محسوس کیا، جج تھوڑے تھوڑے وقفے سے دیوار گیر کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں بس چند منٹ ہی باقی تھے۔ آج ہمارے کیس کی باری ذرا تاخیر سے آئی تھی۔ میں نے اپنی جرح کا سلسلہ ذرا تیز کر دیا۔

''جہانگیر! وقوعہ کے روز تم خلاف معمول وقت سے پہلے گھر کیوں جانا چاہتے تھے؟''

''مجھے اپنی بیوی کو ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے لے جانا تھا۔''

''تم نے جلدی چھٹی کرنے کی اجازت کس سے لی تھی؟''

''مقتول فرقان حمیدی سے۔''

''کیا تم چھٹی لینے کے لئے ان کے کمرے میں گئے تھے۔'' میں نے سوال کیا ''یا باہر ہی کہیں تمہارا ان سے سامنا ہوا تھا؟''

''میں باقاعدہ ان کے کمرے میں گیا تھا۔''

''یہ کتنے بجے کی بات ہے؟''

''میرا خیال ہے، ایک بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔''

''یہ محض تمہارا خیال ہے یا تمہیں پورا یقین ہے۔''

میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا ''کیا یہ وقت پونے ایک یا سوا ایک نہیں ہو سکتا؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''اتنا زیادہ فرق ممکن نہیں ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے پر وثوق لہجے میں اضافہ کیا ''اگر میں نے کہا ہے کہ ایک بجنے میں دو منٹ باقی تھے تو یہ وقت ایک منٹ یا تین منٹ کم ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہ کم۔''

''کیا مقتول نے تمہیں بہ خوشی چھٹی دے دی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''تم مقتول کے کمرے میں کتنی دیر رکے تھے؟''

''بہ مشکل ایک منٹ۔''

''کیا مقتول اس وقت کمرے میں اکیلا ہی تھا؟''

''جی نہیں، وہ اکیلا نہیں تھا۔''

''یعنی کوئی اور شخص بھی وہاں موجود تھا؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' جہانگیر نے بتایا۔

''کون تھا وہ؟''

''خاور محمود!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

دلائل کا آغاز وکیل استغاثہ کی جانب سے ہوا تھا۔

وکیل استغاثہ طول طویل امثال اور حوالہ جات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میرا موکل فرقان حمیدی کا قاتل ہے۔ پوسٹ مارٹم اور فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو بھی وہ زیر بحث لایا۔ خصوصاً ملزم کا مقتول سے قرض مانگنا اور مقتول کے انکار کے بعد ملزم کا جارحانہ اور معاندانہ رویہ اس کے لئے اہم موضوعات رہے۔ آدھے گھنٹے کی تقریر کے بعد اس نے عدالت سے اپیل کی کہ ملزم کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

وکیل استغاثہ کے دلائل کے بعد میری باری آئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ بااعتماد قدموں سے چلتے ہوئے مخصوص جگہ پر آ کر کھڑا ہوا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے دلائل دینا شروع کئے۔

''جناب عالی!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہا ''میرا موکل انتہائی معصوم، سادہ دل اور ایک بے گناہ انسان ہے۔ اسے قتل کے الزام میں ملوث کرنا سراسر زیادتی ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔''

میں سانس لینے کو رکا تو وکیل استغاثہ نے کہا ''پہلے آپ اپنے موکل کو بے گناہ ثابت تو کر لیں پھر اس کی بریت کے بارے میں سوچیں۔''

وکیل استغاثہ کی مداخلت مجھے ناگوار گزری۔ میں اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''یور آنر! میں اپنے موقف کی سچائی اور حقائق کی نقاب کشائی کے ضمن میں سب سے پہلے استغاثہ کے گواہوں پر ہونے والی جرح کا ذکر کروں گا۔ میں جن پوائنٹس کو زیر بحث

لانا چاہتا ہوں، وہ سب عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "جناب عالی! سب سے پہلے میں استغاثہ کے گواہ چوکیدار گل زمان خان کے بیان کا ذکر کروں گا۔ گواہ کے مطابق ملزم ایک صلح جو انسان ہے اگرچہ گواہ کا کہنا ہے کہ ملزم مقتول کو قرض نہ دینے پر برا بھلا سنا رہا تھا تاہم وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ملزم لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والا شخص ہے۔

"جناب عالی! گواہ کا کہنا ہے کہ جب ملزم اس کے پاس پہنچا تو وہ خاصے غصے میں تھا پھر گواہ نے بیان بدلا اور بتایا کہ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ ان دونوں کیفیات میں ہونے کے باوجود بھی ملزم لگ بھگ آدھے گھنٹے تک گواہ سے گفت وشنید میں مصروف رہا۔ ملزم کے مطابق وہ نماز کے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس تمام تفصیل سے میں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص قتل کرنے کے بعد جائے وقوعہ پر بہت اطمینان سے کم وبیش آدھا گھنٹا بات چیت کے ذریعے اپنا وقت گزارتا رہے؟ اگر میرے موکل نے قتل کیا تھا تو وہ فوراً جائے واردات سے غائب کیوں نہ ہوگیا؟ یہ بات بڑی مضحکہ خیز اور بعید از قیاس ہے کہ ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا پھر وہ بڑے سکون سے اکاؤنٹینٹ صاحب کے پاس پہنچا، اس سے دو چار منٹ گفتگو کے بعد وہ چوکیدار سے گپ شپ کرتا رہا پھر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ان واقعات سے تو لگتا ہے کہ میرا موکل دوسروں کو یہ دعوت دے رہا تھا کہ آؤ اور مجھے پکڑلو، میں نے ایک انسان کے خون میں ہاتھ رنگ لئے ہیں!"

میں نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دلائل کا سلسلہ جاری رکھا "جناب عالی! اس کے بعد میں استغاثہ کے گواہ کیشیئر کم اکاؤنٹینٹ قیصر عباس کے بیان کی طرف آتا ہوں۔ گواہ کے مطابق ملزم جب اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنی بیوی کی بیماری کے سبب خاصا پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ملزم مقتول کو برا بھلا کہہ رہا تھا تاہم وہ اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ اس سے پہلے ملزم نے کبھی مقتول کو گالی نہیں دی تھی بلکہ وہ مقتول کی تعریف وتوصیف ہی میں لگا رہتا تھا۔ گواہ اس بات سے بھی متفق ہے کہ ملزم کا کبھی بھی اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا بلکہ کسی بھی اسٹاف ممبر سے اس کا کوئی تنازع سامنے نہیں آیا۔ یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ملزم ایک امن پسند اور صلح جو انسان ہے۔ گواہ کے بیان کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو وہ ملزم کی مخالفت کے بجائے موافقت میں زیادہ نظر آتا ہے۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ گواہ نے پہلے بتایا کہ وہ فیکٹری کے منیجر کے ساتھ جب ملزم کو تلاش کرنے بیرونی گیٹ پر پہنچا تو اس وقت ایک بج کر دس منٹ ہوئے تھے لیکن بعدازاں اس نے وکیل استغاثہ کی شہ پر یہ وقت بدل کر ایک تیس کردیا جو کہ صحیح وقت ہے۔ اسی طرح استغاثہ کے دو گواہوں یعنی قیصر عباس اور جی ایم خاور محمود کے بیانوں میں ایک واضح تضاد موجود ہے۔ قیصر عباس کے مطابق انہوں نے چوکیدار کو فرقان حمیدی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جبکہ خاور محمود کا کہنا ہے کہ انہوں نے گل زمان سے مقتول کے قتل کا ذکر کیا تھا۔ دو گواہوں کے بیانات میں اتنا بڑا فرق استغاثہ کی

کمزوری، خامی اور بدنیتی کو ظاہر کرتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے پھر بولنا شروع کیا "جناب عالی! اس مقدمے کے انکوائری افسر سب انسپکٹر عابد حسین کا کہنا ہے کہ انہیں اس واقعے کی اطلاع فیکٹری کے جی ایم اور استغاثہ کے سب سے اہم گواہ خاور محمود نے دوپہر دو بج کر دو منٹ پر دی تھی۔ یہی وقت ان کے روزنامچے میں بھی درج ہے جبکہ گواہ خاور محمود معزز عدالت کے سامنے یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ اس نے پولیس کو مطلع کرنے کے لئے ایک پینتیس پر فون کیا تھا۔ یہاں ایک مرتبہ پھر تضاد سے سامنا ہو رہا ہے۔ انکوائری افسر کو جی ایم نے ہی بتایا تھا کہ ملزم نے فرقان حمیدی کو قتل کردیا ہے حالانکہ نہ تو اس نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود تھا۔ علاوہ ازیں جی ایم نے جس طرح کھلم کھلا پولیس کے خلاف لب کشائی کی ہے وہ معزز عدالت کے علم میں ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ استغاثہ کے اندر جان نہیں ہے اور وہ ناقص بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے۔

"جناب عالی! اب میں مقتول کی بیوہ اور استغاثہ کے گواہ ستارہ بیگم کے بیان کا ذکر کروں گا۔ ستارہ بیگم کے مطابق اسے اس واقعے سے مطلع کرنے کا فریضہ بھی جی ایم صاحب نے ہی ادا کیا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں بھی دو گواہوں کے بیانات میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ گواہ ستارہ بیگم کے بیان کے مطابق جب وہ آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے لگ بھگ دو بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تو اس کی موجودگی ہی میں جی ایم نے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ گواہ کا بیان آئی او کے موقف کی تصدیق کرتا ہے تو جی ایم کے دعوے کی نفی۔ ان تمام باتوں سے تو لگتا ہے کہ استغاثہ تضادات کے پلندے کے سوا کچھ نہیں ہے یا اسے میرے موکل کے خلاف ایک سوچی سمجھی اور منظم سازش بھی کہا جا سکتا ہے۔"

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا پھر دلائل کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "جناب عالی! استغاثہ کے سب سے اہم گواہ "حمیدی ٹیکسٹائل ملز" کے جنرل منیجر خاور محمود کے بیان میں موجود متعدد خامیاں میں معزز عدالت کے سامنے لا چکا ہوں۔ گواہ کا کہنا ہے کہ اس نے قیصر عباس کی موجودگی میں ایک بجکر پینتیس منٹ پر پولیس کو فون کیا تھا جبکہ ستارہ بیگم کے مطابق، اس کی موجودگی میں کم وبیش دو بجے پولیس کو مطلع کیا گیا۔ اس بات میں جان اس لئے بھی نظر آتی ہے کہ آئی او اور تھانے کا روزنامچہ بھی اس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ دیگر تضادات کے علاوہ خود جی ایم کے اپنے بیان میں بھی خاصے متنازعہ پہلو موجود ہیں۔ مثال کے طور پر گواہ خاور محمود جب مقتول کے بلاوے پر اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مقتول کا قتل ہوگیا تھا پھر خود ہی اس نے اپنا بیان بدل دیا اور بتایا کہ مقتول نے اسے پندرہ منٹ پہلے اپنے کمرے میں بلایا تھا لیکن کام میں مصروفیت کی وجہ سے جب وہ پندرہ منٹ بعد مقتول کے کمرے میں پہنچا تو اسے اس واقعے کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ مقتول کے کمرے سے نکل کر گواہ قیصر

عباس کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ جہانگیر نے فرقان حمیدی کو قتل کر دیا ہے پھر وہ دونوں چوکیدار
کے پاس پہنچے اور گواہ خاور کے مطابق اس نے چوکیدار کو بھی یہی بتایا کہ ملزم نے مقتول کو قتل کر دیا ہے
پھر انکوائری افسر کو بھی جی ایم کا اتنے وثوق سے متعدد افراد کو یہ بتانا کہ میرے موکل نے اپنے مالک کو
قتل کر دیا ہے، اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جیسے موصوف اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں جبکہ اپنے
بیان کے مطابق جب وہ مقتول کے کمرے میں پہنچا تو وہ قید حیات سے آزاد ہو چکا تھا۔''

اس طویل بیان کے بعد میں نے دو چار لمبے سانس لے کر سلسلہ تنفس کو ہموار کیا پھر
ڈرامائی لہجے میں جج کو مخاطب کیا۔

''جناب عالی! میرے موکل کی بے گناہی کا سب سے بڑا اور ناقابل تردید ثبوت
فنگر پرنٹس کی رپورٹ ہے۔''

''وہ کیسے بیگ صاحب؟'' جج نے چونک کر مجھے دیکھا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ تیز چیختی ہوئی آواز میں بلبلایا۔ ''یہ کیسے
ممکن ہے۔ آلہ قتل پر تو ملزم کی انگلیوں کے واضح نشانات پائے گئے ہیں پھر وہ بے گناہ کیسے ہو گیا
ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''یہ واضح نشانات'' ہی میرے موکل کی بے گناہی
ثابت کرتے ہیں۔''

''ناممکن!'' وکیل استغاثہ نفی میں سر جھٹکنے لگا۔

جج نے کہا ''بیگ صاحب! آپ اپنے موقف کی تشریح کریں۔''

میں نے کہا ''جناب عالی! میرے موقف کی تشریح کے لئے تین افراد کا بیک وقت
عدالت میں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ تینوں افراد زیر سماعت مقدمے ہی سے متعلق ہیں مگر اتفاق
سے اس وقت ان میں سے صرف ایک حاضر ہے۔''

جج نے پوچھا ''آپ کن تین افراد کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''انکوائری افسر'' میں نے افراد گنوانا شروع کئے ''فنگر پرنٹس ایکسپرٹ اور میڈیکولیگل
افسر۔''

اس وقت صرف انکوائری افسر وہاں موجود تھا جو الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
میری بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وکیل استغاثہ کے پیٹ میں سب سے زیادہ مروڑ اٹھ
رہے تھے۔ البتہ جج پر معنی انداز میں اس طرح گردن ہلا رہا تھا جیسے وہ میری بات کی تہ تک پہنچنے کے
قریب ہی ہو۔

پھر جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت کر دی کہ وہ آئندہ پیشی پر تینوں اہم افراد کی
عدالت میں حاضر ہونے کے انتظامات کریں۔

☆......☆......☆

عدالت کے کمرے میں اس روز معمول سے زیادہ رش تھا۔

میری فرمائش پر سب سے پہلے انکوائری افسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا۔ میں اس کے
پہنچا اور خاموش نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ عدالت کے کمرے میں ایک سنسنی خیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔
کے انداز میں گہری دلچسپی تھی جبکہ وکیل استغاثہ کی ایک ایک جنبش سے بے کلی ظاہر ہوتی تھی۔

''آئی او صاحب!'' میں نے تفتیشی افسر سب انسپکٹر عابد حسین کو مخاطب کیا۔ ''آپ نے
عرق ریزی سے مشیر نامہ تیار کیا ہے۔ ایک ایک تفصیل آپ کی پیشہ ورانہ مہارت اور ان تھک
کا منہ بولتا ثبوت ہے۔'' میں نے دانستہ حد سے زیادہ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''اگرچہ
کی پیش کردہ رپورٹ میں یہ امر بہ تفصیلات درج ہے لیکن میں پھر بھی معزز عدالت کے سامنے
کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ انکوائری افسر بے قراری سے بولا ''آپ کا اشارہ کس امر کی
ب ہے وکیل صاحب؟''

''کرسی۔'' میں نے محض ایک لفظ کی ادائیگی پر اکتفا کیا۔

''کیسی کرسی؟'' آئی او نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ کرسی جس پر مقتول کی لاش پائی گئی تھی؟''

''آپ اس کرسی کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مذکورہ کرسی کس قسم کی تھی؟''

''وہ ایک اونچی پشت والی جدید آرام دہ ریوالونگ چیئر تھی۔''

''تھینک یو مائی ڈیئر آئی او۔'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا پھر جج کی طرف مڑتے ہوئے
''جناب عالی! اب میں اس مقدمے کے میڈیکل لیگل افسر سے مختلف بات کرنا چاہوں گا۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وٹنس باکس میں انکوائری افسر کے بجائے میڈیکولیگل افسر دکھائی دے
تھا۔ میں نے چند الفاظ میں اس کے پیشہ ورانہ کام کی تعریف کی پھر مطلب کی بات کی طرف آتے
ئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے پیشے میں بے انتہا مہارت اور برسوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ کسی
زخم کو دیکھ کر آپ بتا سکتے ہیں کہ مضروب شخص پر وار کس انداز اور کس زاویے سے کیا گیا ہو گا؟''

''جی ہاں، تجربہ سب سے بڑا استاد ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں نے
سال ہا سال کے تجربے سے حاصل کیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ زیر سماعت مقدمے کے مقتول پر کس
ز سے وار کیا گیا تھا...... آلہ قتل مقتول کے جسم میں کس زاویے سے پیوست کیا گیا تھا؟''

''وہ ایک کھڑے ہاتھ کا وار تھا۔'' میڈیکولیگل افسر نے پر اعتماد لہجے میں بتایا ''یعنی
نائف کو اس زاویے سے مقتول کی پشت میں گھونپا گیا تھا جیسے ہاتھ بلند کر کے ہتھوڑے سے کسی

چیز پر ضرب لگائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی دوسرے زاویے سے پیپر نائف کو مقتول کے جسم میں اتارا جاتا تو زخم کی نوعیت قطعی مختلف ہوتی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ کے چہرے کے تاثرات "پنش منٹ آف کھیل" کے مرکزی کردار سے مشابہ تھے۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ میں نے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔

"جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اب فنگر پرنٹس ایکسپرٹ کو کٹہرے میں آنے کی زحمت دی جائے۔"

جج نے میری یہ فرمائش بھی پوری کردی۔

"سر!" میں نے وٹنس باکس میں کھڑے ایکسپرٹ کو احترام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ نے بڑی مفصل رپورٹ تیار کی ہے...... اور اسی رپورٹ نے میرے ذہن میں ایک سوال کو ابھارا تھا جو اس پورے مقدمے کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ وہ پوائنٹ اتنا اہم ہے کہ اسے شاید اس مقدمے سے وابستہ ہر شخص نظرانداز کرتا چلا آرہا ہے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ بعض اوقات انتہائی اہم چیزیں عام نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔" انگلیوں کے نشانات کے ماہر نے مدبرانہ انداز میں کہا "بہرحال آپ کس پوائنٹ کا تذکرہ کررہے ہیں وکیل صاحب؟"

میں نے کہا "پوائنٹ کا احوال ابھی میں بیان کرتا ہوں۔ پہلے ذرا آپ سے ایک تصدیق کرنا ہے۔" پھر میں نے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے کہا "سر، میں آپ کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق آلہ قتل پر ثبت ملزم کی انگلیوں کے نشانات کی ترتیب کو دہراتا ہوں۔ آپ تصدیق یا تردید کرتے جائیں۔"

"اوکے، آئی ایم ریڈی۔" ایکسپرٹ نے میرے ہاتھ سے رپورٹ کی ایک کاپی لیتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔

میں نے بولنا شروع کیا "آلہ قتل یعنی پیپر نائف کو دائیں ہاتھ سے استعمال کیا گیا ہے!"

"رائٹ یو آر۔"

میں نے کہا "ملزم کے انگوٹھے کا نشان چھری کے پھل کے ابتدائی حصے پر ثبت ہے یعنی جہاں دستہ ختم ہوتا ہے اور پھل شروع ہوتا ہے، وہ ابتدائی حصہ ہے؟"

"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" ایکسپرٹ نے تصدیق کی۔

"باقی چاروں انگلیوں کے نشانات چھری کے دستے پر پائے گئے ہیں۔" میں نے کہا "ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ دستے کے آغاز پر فرسٹ فنگر یعنی انگشت شہادت کا ادھورا پرنٹ۔ اس

کے بعد مڈل فنگر کا بھرپور نشان پھر رنگ فنگر کا بھرپور نشان اور سب سے آخر میں لٹل فنگر یعنی چھنگلی کا نشان پایا گیا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"ابسولیوٹلی رائٹ۔"

میں نے اپنے بیگ میں سے آلہ قتل سے ملتی جلتی ایک چھری نکالی اور پھر بھری عدالت کے سامنے میں نے اس چھری کی مدد سے ایک بند لفافہ کھولا اور چھری والا ہاتھ فنگر پرنٹس ایکسپرٹ کو دکھاتے ہوئے پوچھا "جناب! کیا میں نے اس چھری کو فنگر پرنٹس رپورٹ کے مطابق پکڑا ہوا ہے؟"

"ایگزیکٹلی۔"

"تھینک یو۔" میں نے ایکسپرٹ کا شکریہ ادا کیا پھر جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میڈیکولیگل افسر کو مخاطب کیا۔

"یہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب!" میں نے چھری کو لفافہ کھولنے والے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا "کیا میں چھری کو اس انداز اور زاویے سے حرکت دے کر کوئی ایسا وار کرسکتا ہوں جیسا وار مقتول فرقان حمیدی پر کیا گیا تھا؟"

"یہ ناممکن ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے چھری میڈیکولیگل افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ پلیز اس چھری سے اس "وار" کی ایکٹنگ کرکے دکھائیں جو مقتول حمیدی پر کیا گیا تھا۔"

مذکورہ افسر نے میرے ہاتھ سے چھری لے لی پھر اس کو ایک مخصوص انداز میں پکڑتے ہوئے ہاتھ کو بلند کرکے ایک فرضی وار کیا جیسے وہ اپنے سامنے کسی نادیدہ چیز کے بدن میں اس چھری کا پھل اتار رہا ہو۔

میں نے فنگر پرنٹ ایکسپرٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سر! پلیز آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں موجود چھری پر فنگر پرنٹس کی پوزیشن کیا ہوگی؟"

وہ بتانے لگا "انگوٹھے کا پرنٹ چھری کے دستے کی پشت پر۔ فرسٹ فنگر کا نشان دستے کے آغاز پر بھرپور۔ اس کے بعد مڈل فنگر کا نشان پھر رنگ، فنگر اور آخر میں چھنگلی کا نشان۔ اس سے آگے دستہ ختم ہوجائے گا اور چھری کا پھل شروع ہوگا۔"

"ہیراز دی پوائنٹ یور آنر۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ آلہ قتل پر پائے جانے والے میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ملزم جہانگیر بے گناہ ہے۔ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

جج یقیناً معاملے کی تہہ میں اتر چکا تھا۔ وہ اثباتی انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دے رہا تھا۔

میں نے اپنے دلائل کے سلسلے کو اختتامی موڑ دیتے ہوئے پرزور لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! آلہ قتل پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ

نشانات ڈاک کھولتے وقت پیپر نائف پر ثبت ہو گئے۔ بعدازاں کسی شخص نے...... یعنی قاتل نے بڑی احتیاط سے اس چھری کو واردات میں استعمال کر کے میرے موکل کے لئے پھانسی کا پھندا تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ قاتل نے یہ احتیاط تو برتی کہ اس کی انگلیوں کے نشانات آلۂ قتل کے دستے پر ثبت نہ ہونے پائیں اور ملزم کے نشانات بھی موجود رہیں مگر وہ ان نشانات کی ترتیب کو بھول گیا۔ جیسے ذہین سے ذہین تر مجرم سے بھی غلطی ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی قاتل غلطی کر گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس کی یہ کوتاہی ہی بالآخر مقدمے کا پانسا پلٹ دے گی۔''

جج کے چہرے پر خاصے حوصلہ افزا تاثرات نظر آ رہے تھے۔ میں نے مزید کہا ''جناب عالی! ان واقعات اور شواہد کی روشنی میں معزز عدالت سے میں پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملزم جہانگیر کی بریت کے احکامات صادر کرے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔''

جج نے ایک مرتبہ نگاہ اٹھا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور پوچھا ''وکیل صاحب! آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ کچھ نہیں کہنا چاہتے!'' جج نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ مریل سی آواز میں بولا ''میرا خیال ہے، اب کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا جناب عالی!''

جج اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا پھر وہ اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ جج کے جاتے ہی عدالت کے کمرے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہلکی کانا پھوسی سے شروع ہونے والی سرگوشیوں کا سلسلہ دیکھتے ہی دیکھتے اچھے خاصے شور میں بدل گیا۔

دس منٹ بعد جج اپنے چیمبر سے باہر نکلا تو پھر عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے کرسی انصاف پر جلوہ افروز ہونے کے بعد فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد کی تھی۔

☆......☆......☆

ہمارا کیس بہت واضح اور پوزیشن نہایت مضبوط ہو چکی تھی۔ خاص طور پر میڈیکولیگل افسر اور فنگر پرنٹس کے ایکسپرٹ کے تعاون نے ہر بات روز روشن کی طرح واضح کر دی تھی۔ انکوائری افسر سے پوچھا گیا کرسی کی بابت میرا سوال استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اگر کسی مرحلے پر ضروری ہو جاتا تو میں مذکورہ کرسی کی اونچی پشت گاہ اور اپنے موکل کی پستہ قامتی کا حوالہ ضرور دیتا کیونکہ ان دونوں چیزوں کے باعث بھی یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ وہ قتل میرے موکل نے نہیں کیا تھا۔

آئندہ پیشی پر جج نے میرے موکل جہانگیر کو باعزت بری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس

نے انکوائری افسر کو عرصہ سات یوم میں نیا چالان پیش کرنے کی بھی تاکید کر دی۔

بظاہر یہ کیس یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھاتے ہوئے اپنے موکل کو باعزت رہا کروالیا تھا لیکن چلتے چلتے ایک دلچسپ انکشاف ضرور کروں گا اس امید کے ساتھ کہ اپنے ذہین قارئین کے لئے یہ ہرگز انکشاف نہیں ہوگا۔

چند روز بعد میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی جانب جا رہا تھا تو میں نے ایک معروف وکیل کی معیت میں خاور محمود اور ستارہ بیگم کو اسی طرف آتے دیکھا۔ انکوائری افسر بھی ان کے ساتھ تھا۔ خاور اور ستارہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔

انکوائری افسر عابد حسین نے مجھے دیکھا تو سیدھا میرے پاس چلا آیا اور پھر پرجوش لہجے میں بولا ''بیگ صاحب! ہم نے اصل شکار کو پکڑ لیا ہے۔''

''شکار کو...... یا شکاروں کو؟'' میں نے خاور اور ستارہ کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ جو بھی کہہ لیں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر احسان مندانہ لہجے میں کہا ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں وکیل صاحب!''

''وہ کس سلسلے میں بھائی؟''

وہ بولا ''وہ اس سلسلے میں جناب کہ آپ نے نہ صرف اپنے موکل کو چھڑا لیا بلکہ ہمارے لئے بھی بہت سی کارآمد باتیں منظر عام پر لے آئے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''آپ نے اپنی جرح کے دوران میں اس کیس کے اتنے زیادہ پہلو اجاگر کر دیئے تھے کہ میرا دھیان کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔''

''پھر تم نے انہیں پکڑ لیا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''میں نے تو صرف خاور پر ہاتھ ڈالا تھا۔'' اس نے بتایا ''ایک رات کی 'مہمان نوازی' میں اس نے سب کچھ اگل دیا۔'' ''مثلاً کیا اگل دیا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

عابد حسین نے بتایا ''یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے تھے اور......''

''جیسے اس وقت ملے ہوئے ہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اب تو یہ جنت یا جہنم میں یونہی ایک ساتھ رہیں گے۔'' عابد حسین نے دبی دبی آواز میں کہا پھر بتایا ''ان کے درمیان کافی عرصے سے چکر چل رہا تھا جس سے مقتول واقف ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ مقتول کوئی عملی قدم اٹھاتا، ستارہ کے ایما پر خاور نے اس کا قصہ ہی پاک کر دیا۔ خاور نے اقبال جرم کر لیا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ ستارہ کو بھی لے ڈوبا ہے۔ وہ کیا شعر ہے ایسے مواقع کے لئے بیگ صاحب/ ہم تو ڈوبے ہیں صنم......؟''

''عابد حسین! اگر تم شعر و شاعری کے چکر میں پڑے رہے تو وہ دونوں پھر کوئی چکر نہ چلا بیٹھیں۔ تم تو بتا ہی رہے ہو کہ ان کے درمیان کافی عرصے سے کوئی چکر چل رہا ہے!''

انکوائری افسر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا ستارہ بیگم اور خاور محمود مجھے ایسی نگاہوں سے تک رہے تھے جیسے ان کی تباہی و بربادی کا ذمے دار صرف اور صرف میں ہی ہوں۔ میں ان کی حالت پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔

انسان بڑا خوش فہم ہے۔ وہ اپنی زندگی میں خوشیاں بھرنے کے لئے دوسروں کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور یہ بھول جاتا ہے کہ خون جلد یا بدیر ضرور رنگ لاتا ہے۔ دوسرے کی لاش پر تعمیر کیا جانے والا خوشیوں کا کانچ محل مظلوم کی آہ سے بھی زمین بوس ہو جاتا ہے۔

سچی خوشی دوسروں کی دل بستگی میں ہے، دل آزاری میں نہیں!

☆......☆......☆

مرگ مفید

کراچی میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور جب کبھی ہوتی ہے تو پھر رفتہ و آمدہ سارا حساب بے باق کر دیتی ہے۔ کبھی کبھار کی غیر متوقع بارش کی ہولناکی و تباہ کاری سے اہل شہر بخوبی واقف ہیں۔ نظام زندگی درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لگ بھگ پچاس فیصد گھروں کی اندرون خانہ زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ بعض کچی آبادیوں کے مکانوں میں تو گردن گردن پانی بھر جاتا ہے اور لاتعداد کوارٹر نما مکانوں اور جھگی نما کوارٹرز کی چھتیں تک دھواں دھار بارش کے قہرناک حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پیوند ارض ہو جاتی ہیں۔ ٹریفک کا نظام بالکل معطل ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ چھوٹی بڑی سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ اس روز صبح ہی سے وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری تھا پھر دوپہر کے بعد تو باقاعدہ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ سیدھا گھر چلا جاؤں پھر میں نے اپنے اس خیال کی تردید کی اور دفتر کا ایک سرسری چکر لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دفتر کا عملہ میرے غیر مطلع غیاب سے پریشان ہو۔ ارادہ میرا یہی تھا کہ کچھ وقت دفتر میں گزار کر موقع محل دیکھتے ہوئے اپنے سٹاف کی بھی چھٹی کر دوں اور خود بھی گھر کی راہ لوں گا مگر میرے تمام فیصلے اور ارادے دھرے رہ گئے۔ میں دفتر میں جا کر ایسا پھنسا کہ پھر شام سے پہلے اٹھنا ممکن نہ رہا۔

ہوا کچھ یوں کہ جیسے ہی میں دفتر پہنچا' بارش نے طوفانی شکل اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے' اس کی قیامت خیزی میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ دفتر سے نکلنا کارے دارد بن کر رہ گیا۔ شام کو بارش کا زور ٹوٹا تو ہم باہر نکلے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا شہر خوفناک سیل آب کی زد میں ہے۔ اس صورت حالات نے میری سیکرٹری فرزانہ کو پریشان کر دیا۔ وہ چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے تشویشناک لہجے میں بولی۔

''سر! یہاں تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا ہے۔ میں گھر کیسے پہنچوں گی؟''

اس کی تشویش بجا تھی۔ میں نے کہا ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس وقت کسی رکشہ یا ٹیکسی کا

ملنا تو ناممکنات میں سے ہے۔ ہاں' یہ ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں ڈراپ کرتے ہوئے نکل جاؤں۔''

فرزانہ کو میرے دفتر میں ملازمت کرتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے والی سیکرٹری چونکہ میرے گھر کے راستے ہی میں رہائش رکھتی تھی اس لئے میں روزانہ اسے اپنے ساتھ گاڑی میں لے جاتا تھا اور اس کے علاقے میں ڈراپ کرتے ہوئے آگے نکل جاتا تھا۔ فرزانہ کا گھر سوسائٹی آفس کے نزدیک تھا۔ وہ بس یا پھر رکشہ ٹیکسی وغیرہ میں دفتر آتی جاتی تھی۔ میری پیشکش پر وہ پہلے تو ہچکچائی مگر گھر پہنچنے کی دوسری صورت نہیں تھی اس لئے اس نے میری پیشکش کو قبول کر لیا۔ ہم دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

فرزانہ بہت مختلف قسم کی لڑکی تھی۔ خاموش طبع' سنجیدہ اور لیے دیئے جانے والی۔ وہ نہ صرف اپنے کام میں پرفیکٹ تھی بلکہ اس کی باوقار شخصیت دیکھنے والے پر ایک خاص قسم کا تاثر بھی چھوڑتی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس سے گفتگو کے دوران انسان کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک ذہین اور بردبار لڑکی تھی۔

میری گاڑی ایک دو ذیلی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایم' اے جناح روڈ المعروف بہ بندر روڈ پر آ گئی۔ اس وسیع وعریض اور شہر کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت کی حامل سڑک پر بھی گھٹنے گھٹنے پانی نظر آ رہا تھا۔ خصوصاً سڑک کی دونوں جانب تو باقاعدہ نالے بہہ رہے تھے البتہ بیچ کا حصہ قدرے کم متاثر تھا اور وہاں ڈرائیونگ ممکن تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کیلئے سازگار سڑک کے اسی حصے پر اپنی گاڑی کو ڈال دیا۔

فرزانہ عقبی نشست پر بیٹھی تھی اور میرے پہلو میں پسنجر سیٹ پر میرا بریف کیس دھرا تھا۔ ہمارے درمیان اکا دکا بات کے سوا کوئی باقاعدہ گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی سعید منزل سے تھوڑا پیچھے ہی تھی کہ فرزانہ نے مجھے مخاطب کیا۔

''سر! وہ دیکھیں۔''

میں نے عقب نما آئینے میں ایک اچٹتی سی نگاہ فرزانہ کے سراپا پر ڈالی اور پوچھا ''کہاں دیکھوں؟ کیا دیکھوں؟''

وہ بائیں جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی ''وہ ادھر سر! وہ بوڑھی عورت۔''

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں اس سمت دیکھا جس جانب فرزانہ نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرف سڑک کے کنارے ایک بوڑھی عورت بڑی کسمپرسی کی حالت میں کھڑی تھی۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کسی سواری کی تلاش ہے جس کا حصول اس وقت جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس افراتفری کے عالم میں کوئی بس والا اس بڑھیا کیلئے رکنے کو تیار نہیں تھا اور رکشہ ٹیکسی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عقبی نشست پر ابھرنے والی فرزانہ کی آواز میرے سماعت سے ٹکرائی ''سر! اگر ہم بڑی اماں کو لفٹ دے دیں تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ بے چاری بڑی مشکل میں دکھائی دیتی

ہے۔''

فرزانہ کی تجویز معقول اور پروزن تھی۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی اس بوڑھی عورت کے نزدیک لے جا کر روک دی۔ اگرچہ اس عمل کیلئے مجھے ٹریفک کے ایک دو اصول بھی توڑنا پڑے تھے جو کہ ہمارے یہاں کا معمول ہے لیکن میں نے اس ''روزمرہ'' کو انتہائی مجبوری کے عالم میں اختیار کیا تھا اور وہ بھی ایک نیک مقصد کی خاطر۔ اگرچہ قانون شکنی ہر حال میں قانون شکنی ہے مگر ہمارے ملک کے قانون خصوصاً ٹریفک کے قانون کا اپنا ایک مزاج بن گیا ہے۔ یہ بات میرے تجربے میں آئی کہ اگر آپ ٹریفک کے قوانین کی پوری طرح پاسداری کریں تو سب سے زیادہ حادثات کا شکار آپ ہی بنیں گے۔ یہ کوئی پرلطف چٹکلا نہیں' ہماری قوم کا اجتماعی المیہ ہے۔ اس پر مسکرانے کے بجائے سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے' چاہے ہم تسلیم کریں یا نہ کریں۔

میں نے بائیں جانب کا شیشہ گرا کر پہلو کے بل جھکتے ہوئے اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''اماں! کہاں جائیں گی؟''

''نمائش تک۔'' اس نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

اس دوران میں فرزانہ گاڑی کی عقبی نشست والا دروازہ کھول چکی تھی۔ میں نے اس عورت سے کہا ''اندر بیٹھ جائیں ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کو نمائش پر اتار دیں گے۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' وہ دعائیہ کلمات ادا کرتے ہوئے گاڑی کے اندر آ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی فرزانہ نے دروازہ بند کر دیا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بوڑھی عورت کا لباس قدرے بھیگا ہوا تھا۔ جب ہم دفتر سے نکلے تھے تو بارش پوری طرح تھم چکی تھی مگر چند لمحے پہلے نئے سرے سے بوندا باندی کا آغاز ہو گیا تھا۔

بوڑھی عورت نے اپنے کپڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا ''بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ جس کو دیکھو وہی بے ایمانی کی راہ اپنائے ہوئے ہے۔ پتا نہیں' لوگ آخرت کو کیوں بھلا بیٹھے ہیں جیسے کسی کو مرنا ہی نہ ہو۔''

''کیا ہوا اماں؟'' فرزانہ نے نرم لہجے میں پوچھا ''آپ کس پر خفا ہو رہی ہیں؟''

''ہونا کیا ہے بیٹی۔'' وہ عورت مخصوص انداز میں بولی ''ایک حرام زادہ پیسے کھائے بیٹھا ہے۔ چکر پر چکر' پھیرے پر پھیرے لگوا رہا ہے مگر رقم دینے کا نام نہیں لیتا۔ پتا نہیں' خدا کو کون سا منہ دکھائے گا۔ مردود کو شرم بھی نہیں آتی۔ اس برستی بارش میں اس کے وعدے کے مطابق آئی تھی مگر وہ گھر میں ہی نہیں ملا۔ اس کی پرکٹی بیوی نے آج بھی نہلا دیا۔ کوئی معمولی رقم ہو تو بندہ رو دھو کر خاموش ہو بیٹھے۔ اب ایک لاکھ روپے کو بھولنا آسان بات تو نہیں اور وہ بھی ہم جیسے غریبوں کیلئے۔''

ایک لاکھ روپے کے ذکر سے میں چونکا اور میں نے عقب نما آئینے میں بوڑھی عورت کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ لباس معمولی اور صحت اس سے بھی

زیادہ معمولی تھی۔ وہ اپنے بیان کے مطابق ایک غریب عورت ہی نظر آتی تھی چنانچہ اس کے حوالے سے ایک لاکھ روپے کا تذکرہ باعث حیرت تھا۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے فرزانہ نے بوڑھی عورت سے پوچھا ''کون مردود آپ کی رقم ہضم کیے بیٹھا ہے؟''

''بیٹی! جان کر کیا کرو گی۔'' وہ ایک سرد آہ خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کا نام حنیف ہے اور یہیں سعید منزل پر ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔''

''آپ نے اتنی بڑی رقم اسے کس سلسلے میں دی تھی؟''

''میں نے کہاں دی تھی۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔

''پھر کس نے دی تھی؟''

بڑھیا نے ہچکچاہٹ بھرے انداز میں جواب دیا ''یہ سب ناصر کی بے وقوفی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے تو لاکھ منع کیا تھا مگر اس نے میری ایک مان کر نہیں دی۔''

فرزانہ نے پوچھا ''یہ ناصر کون ہے؟''

''میرا اکلوتا بیٹا ہے۔''

''بیٹے کے ہوتے ہوئے آپ اس موسم کی سختی کو برداشت کر رہی ہیں۔'' فرزانہ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''رقم لینے کیلئے اسی کو حنیف کے پاس بھیج دیتیں۔''

عورت نے بتایا ''ناصر کو آج صبح ہی سے تیز بخار ہے۔ وہ تو مجھے بھی آنے سے روک رہا تھا لیکن میں نے سوچا' چور کو اس کے گھر تک پہنچا کر آنا چاہئے۔ حنیف نے آج کا پکا وعدہ کیا تھا اس لئے مرتی جیتی چلی آئی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ شیطان کی اولاد ہاتھ ہی نہیں آتا تو رقم کیسے دے گا۔ اب تو میں کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں۔''

بوڑھی عورت خیال انگیز انداز میں بات مکمل کر کے خاموش ہوگئی۔ ہم کیپری سینما کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ابھی تک میں نے ان دونوں کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تاہم ان کی باتیں بغور سن رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے فرزانہ نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''اب آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

فرزانہ کو میں نے ایک خاموش طبع لڑکی پایا تھا مگر اس وقت وہ خلاف معمول بات کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے فرزانہ کو اس قدر بولتے نہیں سنا تھا۔

بوڑھی عورت نے جواب دیا ''مجھے کئی لوگوں نے مشورہ دیا ہے اور میں خود بھی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس فراڈ شخص کے خلاف عدالت میں مقدمہ کروں۔ میرا مطلب ہے' حنیف کے خلاف۔'' تھوڑی دیر رک کر اس نے فرزانہ سے پوچھا ''بیٹی! تمہاری نگاہ میں کوئی اچھا وکیل ہو تو بتاؤ۔''

فرزانہ نے عقب نما آئینے میں مجھے دیکھا۔ مجھ سے اس کی نظر ملی تو میں نے محسوس کیا جیسے اس کی خواہش ہو اب مجھے بولنا چاہئے۔ اسی لمحے بوڑھی عورت تیز آواز میں بولی اور میں نے خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ بوڑھی عورت کہہ رہی تھی۔

''بس بیٹا...... بس...... یہیں روک دو۔ میں دوسری طرف جاؤں گی۔''

''دوسری طرف کہاں اماں؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

وہ جواباً بولی ''سڑک کی دوسری جانب بیٹی۔ میں ادھر لائنز ایریا میں رہتی ہوں۔''

میں نے اس دوران میں اپنی گاڑی سڑک کے کنارے روک دی تھی۔ اس جگہ بارش کا پانی قدرے کم تھا۔ فرزانہ عورت کیلئے گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی تو میں نے کہا۔

''خاتون! میں ایک اچھے وکیل سے واقف ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بے صبری سے بولی۔ ''ہاں ہاں۔ ضرور۔ آپ مجھے بتائیں۔''

میں نے اپنا تعارفی کارڈ کوٹ کی جیب سے نکال کر بوڑھی عورت کی طرف بڑھا دیا اور کہا ''آپ ان سے مل کر اپنا مسئلہ بتائیں۔ ممکن ہے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''بہت بہت شکریہ بیٹا۔'' وہ کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔ کارڈ کے مندرجات انگریزی میں تحریر تھے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا' وہ کچھ بھی پڑھ یا سمجھ نہیں پائی تھی۔ تاہم اس نے پرُوثوق لہجے میں کہا ''میں پہلی فرصت میں ان وکیل صاحب سے رابطہ کروں گی۔''

پھر وہ ہم دونوں کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی تو فرزانہ نے سوال کیا ''سر! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''کون سی بات؟'' میں نے نمائش کی چورنگی سے گاڑی کو شارع قائدین پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی ''سر! آپ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بوڑھی عورت کو دے دیا اور یہ نہیں بتایا کہ وہ اچھے وکیل آپ ہی ہیں۔''

''بس' کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''مجھے اچھا نہیں لگا اس نازک موقع پر اپنا تعارف کروانا۔ وہ سیدھی سادی عورت پتا نہیں کیا سمجھتی' آج کل ہمدردی جتانا اور دوسرے کی بھلائی سوچنا بہت پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔''

وہ تائیدی لہجے میں بولی۔ ''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کشمیر روڈ پر سے گاڑی کو دائیں جانب موڑتے ہوئے کہا ''تمہیں تھوڑے سے عرصے میں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں عموماً فوجداری کے مقدمات ٹیکل کرتا ہوں۔ دیوانی' سول اور چیریٹی کیسز سے میں حتی الامکان اجتناب ہی برتتا ہوں مگر پتا نہیں کیا بات ہے کہ اس بوڑھی عورت کو دیکھ کر' اس کی نہایت ہی مختصر بپتا سن کر اور اس کی سادگی کے پیش نظر میں اپنے اندر اس کا کیس لینے کی

خواہش ابھرتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔''

فرزانہ نے کہا ''مجھے خود یہی احساس ہوا ہے کہ یہ کوئی مظلوم عورت ہے۔''

''اگر اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں سوسائٹی آفس کا علاقہ آ گیا۔ میں نے فرزانہ کو اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کیا اور یوٹرن دے کر گاڑی کو واپسی کیلئے موڑ لیا۔

جب میں گھر پہنچا تو بارش ایک مرتبہ پھر دھواں دھار شکل اختیار کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرا دن روشن تھا۔

مطلع صاف اور سورج حسب معمول پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ گزشتہ روز کی بارش کے اثرات سڑکوں پر بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ تاہم فضا خاصی خوشگوار تھی اور اس خوشگواریت میں سب سے بڑا ہاتھ ان درختوں کا تھا جن کی شاخیں اور پتے اپنے حقیقی روپ و رنگ میں دکھائی دیتے تھے۔ طوفانی بارش کی تیز دھاروں نے درختوں پر جمی دھوئیں اور گرد و غبار کی دبیز تہوں کو اتار پھینکا تھا۔ بقول کسے...... کالک پوش درختوں کے تن مردہ میں جیسے نئی روح پھونک دی گئی تھی۔

میں اپنے چیمبر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میری سیکرٹری فرزانہ نے نصرت جہاں کی آمد کی اطلاع دی اور بتایا ''سر! وہ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''یہ نصرت جہاں کون ہیں بھئی؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

سیکرٹری نے جواب دیا: ''سر! نصرت جہاں انہی خاتون کا نام ہے جو کل ہمیں بندر روڈ پر ملی تھیں اور جنہیں ہم نے گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ نمائش تک۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی ''تو وہ یہاں پہنچ ہی گئیں۔''

''نہ صرف پہنچ گئیں بلکہ حیران بھی ہوئیں ہیں۔'' فرزانہ نے بتایا ''مجھے تو دیکھتے ہی پہچان گئیں اور پتا ہے' کیا کہا؟''

فرزانہ نے سوالیہ انداز میں جملہ ختم کیا تو میں نے پوچھا ''ہاں بتاؤ' کیا کہا تھا؟''

میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا تو وہ بولی ''سر! انہوں نے مجھ پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے وکیل صاحب وہی ہوں گے جنہوں نے کل مجھے اپنا تعارفی کارڈ دیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے' خاتون خاصا تجزیاتی ذہن رکھتی ہیں۔'' میں نے تبصرہ کیا پھر پوچھا ''کیا وہ اکیلی ہی آئی ہیں؟''

''ان کا بیٹا بھی ساتھ ہے۔'' فرزانہ نے بتایا۔

''یعنی ناصر!''

''جی سر۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''انہیں اندر بھیج دو۔''

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ماں بیٹا میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ناصر کی عمر کا اندازہ میں نے لگ بھگ تیس سال لگایا جو ازاں بعد درست ثابت ہوا۔ وہ اوسط قد و قامت کا مالک ایک عام سا شخص تھا۔ ناصر کی والدہ نصرت جہاں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ بہر حال میں اپنے اکلوتے بیٹے کو لے کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔''

میں نے براہ راست ناصر سے پوچھا ''آپ کا بخار کیسا ہے؟''

''اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ کی والدہ نے کل سرسری انداز میں بتایا تھا کہ حنیف نامی کسی شخص کو آپ نے ایک لاکھ روپے کی رقم دے رکھی ہے جس کی واپسی کیلئے وہ ٹال مٹول کر رہا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟ ذرا تفصیل سے بتائیں گے۔''

ناصر نے اجازت طلب نظر سے ماں کو دیکھا۔ نصرت جہاں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ''میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ رقم تم نے پھنسائی ہے۔ تم ہی وکیل صاحب کو سارا قصہ سناؤ۔''

''قصہ تو میں سناؤں گا ہی اماں۔'' ناصر نے دزدیدہ نظر سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن تم مجھے اکلوتا کیوں کہتی ہو؟''

''لو اور سنو۔'' نصرت جہاں ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ''اکلوتا نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ ناصرہ تو اب دوسرے جہاں کی باسی ہو گئی ہے۔ میری اولادوں میں تم دونوں ہی تو تھے۔ ایک کو خدا نے اپنے پاس بلا لیا' دوسرے کو میرے پاس چھوڑ دیا۔'' ایک لمحے کو وہ رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''میں یوں بھی تمہیں اکلوتا کہتی ہوں کہ اب تمہارے سوا اس دنیا میں میرا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ تمہارے ابا تو ناصرہ کے ساتھ ہی ہم سے بچھڑ گئے۔'' بات ختم کرتے کرتے وہ روہانسی ہو چکی تھی۔

میں نے نصرت جہاں کو جذباتی ریلے سے نکالنے کیلئے موضوع کو تبدیل کیا اور دونوں ماں بیٹے سے باری باری حنیف فراڈیا اور ایک لاکھ کی رقم کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگا۔ انہوں نے ایک گھنٹے کی گفتگو میں جو حالات و واقعات بتائے' میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ ان پر ٹوٹنے والی بپتا کے پس منظر سے واقف ہو سکیں۔

ناصر کا والد یعنی نصرت جہاں کا شوہر نصیر احمد کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ ان کی رہائش لائنز ایریا میں تھی۔ نصیر احمد کو ریٹائرمنٹ پر فنڈز وغیرہ کی مد میں کم و بیش اسی ہزار روپے ملے تھے۔ اسی عرصے میں خوش قسمتی سے اس کا ایک انعامی بانڈ بھی نکل آیا۔ انعام اگرچہ چھوٹا تھا تاہم وہ رقم فنڈز کی

رقم میں ملانے سے اس کے پاس ایک لاکھ روپے جمع ہو گئے۔

نصیر احمد پوری طرح بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکا تھا اور اس کی پوری خواہش تھی کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے وہ اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھ لے۔ ناصرہ اپنے بھائی ناصر سے تین سال چھوٹی تھی۔ اس کا ایک بہت اچھا رشتہ بھی آیا ہوا تھا لیکن نصیر احمد دونوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے بڑی شد و مد سے ناصر کیلئے لڑکی دیکھی جا رہی تھی۔ حالات سے پتا چلتا تھا کہ ان دونوں کی شادی میں لگ بھگ ایک سال تو لگ ہی جائے گا۔ چنانچہ نصیر احمد نے یہی مناسب سمجھا کہ اتنی بڑی رقم کو کسی محفوظ سکیم میں لگا دے۔ جی ہاں! اس زمانے میں نصیر احمد جیسی حیثیت کے شخص کیلئے ایک لاکھ روپے اچھی خاصی رقم تھی۔

نصیر احمد کے نزدیک سب سے محفوظ اور قابل بھروسا انوسٹمنٹ قومی بچت کی کسی سکیم میں ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے نیشنل سیونگ سکیم کے سرٹیفکیٹ خرید کر شش ماہی منافع کے تحت ایک لاکھ کی رقم قومی بچت کے مرکز میں جمع کروا دی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح ماہانہ منافع کا دستور نہیں تھا۔ نصیر احمد کو چھ ماہ کے بعد ایک لاکھ کی رقم پر کم و بیش پانچ ہزار روپے منافع ملنا تھا۔

اس انوسٹمنٹ کے ٹھیک ساڑھے پانچ ماہ بعد یعنی جب منافع کی رقم ملنے میں نصف ماہ باقی تھا' نصیر احمد کو ایک اندوہناک حادثہ پیش آ گیا۔ وہ اپنی بیٹی ناصرہ کے ساتھ ایک سڑک عبور کر رہا تھا کہ ایک تیز رفتار ٹریلر ان دونوں کو روندتے ہوئے گزر گیا۔ ناصرہ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ نصیر احمد کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکا اور رات کے آخری پہر وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

نصرت جہاں اور ناصر پر گویا ساتوں آسمان ایک ساتھ آن گرے تھے۔ ان کا چھوٹا سا کوارٹر ماتم کدہ بن گیا۔ ایک ساتھ دو جنازے اٹھے تو ماں بیٹے کے دل خون ہو گئے۔ ان کے زخموں کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جو کبھی ایسی دلخراش اور جگر پاش صورتحال سے گزرا ہو۔

وقت' بیک وقت بے رحم بھی ہے اور مسیحا بھی۔ یہ ایک طرف دل و دماغ پر چرکے لگاتا ہے تو دوسری جانب زخموں پر مرہم بھی رکھتا ہے۔ اس ستمگری اور رفو کاری کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بیٹے کے زخم بھرتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ وہ نارمل زندگی گزارنے لگے۔

ناصر آئی' آئی' چندریگر روڈ پر ایک ایسی کمپنی میں کام کرتا تھا جو ٹائپ رائٹرز اور اسی قسم کی دفتری استعمال کی چیزیں فروخت کرتے تھے۔ اس زمانے میں کمپیوٹر نے ہمارے ملک میں ابھی اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی اور ٹائپ رائٹر اپنے مقام و مرتبے کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ ناصر اس کمپنی میں سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

اچھے وقت کا انتظار ہر کوئی کرتا ہے مگر برا وقت بغیر اطلاع کے چلا آتا ہے۔ وہ شاہد حسین کی باتوں میں آ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ شاہد کی بات مان کر وہ کس ولدل میں دھنسنے جا رہا تھا۔ شاہد

حسین ایک کلرک ٹائپ شخص تھا جو ناصر کی کمپنی کے قریب ہی ایک شپنگ کمپنی میں کام کرتا تھا۔ "سی کنگ شپنگ کمپنی" ایک معروف اور با اعتماد ادارہ تھا۔

شاہد حسین اکثر و بیشتر ناصر سے ملنے اس کے دفتر آتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار ناصر بھی اس کے پاس چلا جاتا۔ دونوں میں اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ تھی جو رفتہ رفتہ دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔

شاہد انعامی بانڈز کی پرچیاں وغیرہ خریدا کرتا تھا۔ یہ جوئے کی ایک شکل ہی تھی۔ اگر آپ کا مطلوبہ نمبر لگ گیا تو کچھ رقم آپ کے ہاتھ آ گئی ورنہ لگائی گئی رقم ڈوب جاتی تھی۔ آج کل تو یہ کاروبار نہایت ہی "ترقی یافتہ" صورت میں جاری و ساری ہے اور اس میں اس قدر ورائٹی پیدا ہو چکی ہے کہ بعض سکیمز کو سمجھتے ہوئے دماغ کی چولیں ہل کر رہ جاتی ہیں۔

شاہد اپنی جیت کی کہانیاں اکثر ناصر کو سناتا اور اسے بھی رقم لگانے پر اکساتا رہتا۔ "یار سو بچاس ہی لگا کر دیکھو اگر نمبر نہیں بھی لگا تو کیا نقصان ہے۔ ویسے یہ تو ممکن نہیں کہ ایک بھی نمبر نہ لگے۔ میں نے آج تک اس میں گھاٹا نہیں کھایا۔ اگر دس میں سے ایک پرچی بھی لگ جائے تو رقم کور ہو جاتی ہے۔"

"کچھ بھی ہے مگر میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" ناصر ہمیشہ اسے یہی جواب دیتا۔ "یہ سب جوا ہے جو میرے نزدیک غلط کام ہے۔"

شاہد دلیل دیتا "تم غلط اور صحیح کے حساب میں پڑے رہو گے تو کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ مجھے دیکھو' میں نے ایک سال میں اچھا خاصا کما لیا ہے۔ اب تو میں سوچ رہا ہوں' اسے انوسٹ کر دوں۔"

ناصر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "تم نے ایک سال میں کتنا کما لیا ہے بھائی؟"

"لگ بھگ تیس ہزار۔"

"تمہاری قسم' جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" شاہد نے سنجیدگی سے کہا "اور یہ سب میں نے پرچیوں کے کھیل سے کمایا ہے۔"

"بھئی تمہیں تو جوا راس آ گیا ہے۔" ناصر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا "تیس ہزار بہرحال کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔"

شاہد نے کہا "تم کھیلو گے تو تمہیں بھی راس آ جائے گا۔ اس کھیل میں نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ناصر نے پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کہیں آنا جانا بھی نہیں پڑتا اور جیت کی رقم جیب میں آ جاتی ہے۔" شاہد نے وضاحتی انداز میں کہا۔

"وہ کس طرح بھئی؟" ناصر کی حیرت دوچند ہو گئی۔ "آخر پرچیاں وغیرہ خریدنے اور نمبر لگ جانے کی صورت میں انعام کی رقم حاصل کرنے کیلئے تمہیں بانڈ مارکیٹ میں تو جانا ہی پڑتا ہو گا

نا۔"

"بالکل نہیں پیارے۔" شاہد چہکا۔ "یہی تو خوبی ہے اس بزنس میں۔"

"پھر یہ سارے مراحل کس طرح طے ہوتے ہیں؟"

شاہد نے تفصیل میں جاتے ہوئے بتایا "ہمارے دفتر کا چپراسی حنیف بڑا چلتا پرزہ ہے۔ ایک طویل عرصے سے وہ اس دھندے میں ہے۔ ہمارے دفتر کے تو تقریباً سبھی افراد اس سے پرچیاں وغیرہ منگواتے ہیں۔ بعض لوگ انعامی بانڈز بھی منگواتے ہیں۔ بانڈ مارکیٹ میں حنیف کی اچھی خاصی جان پہچان ہے۔ لوگ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اب تو اس کام میں اسے بہت تجربہ ہو چکا ہے قرعہ اندازی میں آنے والے نمبروں کے بارے میں اس کا اندازہ نوے فیصد درست ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے' حنیف نے بہت اوپر تک تعلقات استوار کر لئے ہیں اور بڑے بڑے سٹوریوں سے اس کا رابطہ ہے۔ سٹا مار بانڈز کی قرعہ اندازی میں بڑی حد تک دخیل ہوتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ حنیف کو کہیں نہ کہیں سے سن گن ضرور ملتی ہے کیونکہ میں نے جب بھی اس کے مشورے کے مطابق آکڑے اور پرچیاں خریدیں' تقریباً اسی فیصد نمبروں پر مجھے انعام ملے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔"

"واقعی' یہ غیر معمولی بات ہے۔" ناصر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تم ایک مرتبہ اس میدان میں آ کر تو دیکھو۔" شاہد نے چارا پھینکنے والے انداز میں کہا۔ "قسمت کو آزمانے میں کیا حرج ہے۔"

ناصر سوچ میں پڑ گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ واقعی قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں۔ شاہد نے اسے متذبذب دیکھا تو دوستانہ لہجے میں بولا۔

"چلو پہلی مرتبہ میں اپنی جیب سے تمہارے لئے دس آکڑے لے لیتا ہوں یعنی پانچ پانچ روپے والے دس نمبر۔ اگر تمہارا کوئی ایک بھی نمبر لگ گیا تو سمجھو رقم وصول ہو گئی۔ پچاس روپے کوئی اتنی زیادہ رقم بھی نہیں ہے۔"

"نہیں یار۔" ناصر نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "مجھے نہ گھسیٹو اس کھیل میں۔"

شاہد نے ناراضی سے کہا "میں نے کہا ہے نا' یہ پچاس روپے میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔ اگر ڈوب گئے تو تم سے ایک پائی بھی نہیں لوں گا اور اگر تیر گئے تو اپنے پچاس روپے وصول کر کے باقی تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ بولو' منظور ہے؟"

ناصر تامل کرتے ہوئے بولا۔ "منظور ہے۔"

کہتے ہیں' برائی کو یا تو پہلے ہی قدم پر روکا جا سکتا ہے یا پھر کبھی نہیں روکا جا سکتا۔ ناصر۔ شاہد کے پھسلانے پر جس راہ پر قدم رکھا تھا وہ راستہ اس کیلئے خاصا دلدلی ثابت ہوا۔ اب وہ گردن تک اس دلدل میں دھنس چکا تھا۔

آپ اسے ناصر کی خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی' جوئے کا پہلا ہی داؤ اس کے حق میں مفید بت ہوا۔ شاہد نے اپنے پچاس روپے وصول کرنے کے بعد دو سو روپے ناصر کو بھی دیئے۔ پیسہ تے ہوئے کسی کو برا نہیں لگتا۔ چنانچہ ناصر بھی گاہے بہ گاہے' آکڑے اور پرچیاں خریدنے لگا۔ ہار بت کا تناسب یہ رہا کہ چھ ماہ میں اس نے گنوایا کم اور حاصل زیادہ کیا۔ اب وہ باقاعدہ دلچسپی سے ا کھیل میں حصہ لینے لگا تھا۔ تاہم اس نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ سو روپے سے آگے نہیں بڑھا۔

ایک روز شاہد نے اسے ایک نئی خبر سنائی۔

"یار ناصر! میں نے ساری رقم ایک کاروبار میں لگا دی ہے۔"

"کیسا کاروبار؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟" ناصر چونکتے ہوئے بولا "یہ کس قسم کا کاروبار ہے جس کے بارے میں ہیں کچھ علم نہیں؟"

شاہد نے کہا "یار' بات یہ ہے کہ میں نے تیس ہزار روپے سیٹھ ولی بھائی کو دے دیئے ۔ وہ ان سے کوئی کاروبار کرے گا۔ مجھے میری رقم پر ماہانہ منافع ملتا رہے گا۔"

ایک لمحے کو رک کر اس نے ڈرامائی انداز میں بتایا "منافع کی شرح کا سنو گے تو میرا منہ تے رہ جاؤ گے۔"

"منہ تو میں تمہارا اس وقت بھی دیکھ ہی رہا ہوں۔" ناصر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "خود بتا دو' منافع کی شرح کیا ہے؟"

شاہد نے جواباً بتایا "پورے پانچ فی صد ماہانہ۔"

"اوہ!" ناصر نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تو بہت زیادہ ہے بھئی۔"

"میں نے کہا تھا نا' منافع کی شرح کا سنو گے تو تمہاری آنکھیں پھٹ جائیں گی۔" شاہد زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے تیس ہزار روپے پر سیٹھ ولی بھائی مجھے ماہانہ پندرہ سو روپے گا اور اصل رقم ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ کیوں' ہے نا منافع بخش کاروبار جس میں میرے لئے کوئی درد ی نہیں ہے۔ ولی بھائی جانے اور اس کا دھندا جانے۔ مجھے تو بیٹھے بٹھائے ہر ماہ باقاعدگی سے فع کی رقم ملتی رہے گی۔"

"یہ تو واقعی حیرت انگیز ہے شاہد۔" ناصر نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ "پانچ فیصد ماہانہ منافع بارے میں' میں نے تو کہیں نہیں سنا۔ قومی بچت والے تو پانچ فیصد ششماہی منافع دیتے ہیں۔ یہ ل سے چھ گناہ ہوا۔"

"گورنمنٹ کے تمام بینک اور ادارے تو عوام کو لوٹنے کیلئے ہوتے ہیں پیارے۔" شاہد مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "کبھی زکوٰۃ کے نام پر اور کبھی کسی دوسرے حربے سے کٹوتی کرتے رہتے ۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اکاؤنٹ کھولو یا انوسٹمنٹ کرو' ہمیشہ پرائیویٹ بینکوں اور اداروں کو

ترجیح دینا چاہئے۔ اب بھی دیکھ لو اگر میں تیس ہزار روپے ولی بھائی کے بجائے کسی قومی بچت سکیم میں لگا دیتا تو مجھے پندرہ سو روپے چھ ماہ کے بعد منافع ملتا یعنی تقریباً اڑھائی سو روپے ماہانہ لیکن میں نے بے وقوفی نہیں کی اس لئے ماہانہ پندرہ سو روپے کماؤں گا۔''

''تم صحیح کہتے ہو۔'' ناصر نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''ہم سے واقعی بے وقوفی ہوئی تھی۔''

''کیسی بے وقوفی ناصر؟'' شاہد نے چونک کر اسے دیکھا۔

ناصر نے کہا ''یار' کچھ عرصہ پہلے ابا نے قومی بچت کی ایک سکیم میں کچھ رقم لگائی تھی جس کا منافع ہمیں چھ ماہ کے بعد ملتا ہے اور منافع کی شرح تمہاری بیان کردہ شرح سے چھ گنا کم ہے۔ ہے نا بیوقوفی کی بات۔''

''تم لوگوں نے کتنی رقم قومی بچت کی سکیم میں پھنسا رکھی ہے؟'' شاہد نے بے تابی سے پوچھا۔

''ایک لاکھ روپے!''

''ایک لاکھ روپے!'' شاہد نے حیرت بھرے انداز میں زیر لب دہرایا۔

ناصر نے کہا ''یار ابا کے ریٹائرمنٹ پر انہیں جو فنڈز وغیرہ ملے تھے ان میں کچھ اور رقم ملا کر پورے ایک لاکھ روپے انہوں نے شش ماہی منافع پر ایک سکیم میں لگا دیئے تھے جن پر ہمیں شش ماہی پانچ ہزار روپے ملتے ہیں۔ ابا تو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے خواب بھی چلے گئے تاہم ان کی انوسٹمنٹ کی ہوئی رقم پر ہم باقاعدہ منافع لے رہے ہیں۔''

''اور مسلسل اپنا نقصان کر رہے ہیں۔'' شاہد نے گرہ لگائی۔

ناصر کچھ نہیں بولا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

شاہد نے کہا ''ناصر اگر وہی ایک لاکھ روپے تم قومی بچت کی سکیم سے نکال کر سیٹھ ولی بھائی کے کاروبار میں لگا دو تو تمہیں ماہانہ پانچ ہزار روپے منافع ملے گا یعنی چھ ماہ میں پورے تیس ہزار روپے۔ اس وقت تو تم ماہانہ لگ بھگ آٹھ سو تینتیس روپے منافع لے رہے ہو یعنی بالفاظ دیگر چار ہزار ایک سو سڑسٹھ روپے ماہانہ نقصان۔ اور پچیس ہزار روپے شش ماہی نقصان۔ یہ تو واقعی پاگل پن اور بے وقوفی ہے۔ کہاں چھ ماہ میں پانچ ہزار روپے منافع اور کہاں پورے تیس ہزار روپے منافع۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم بھی اپنی رقم سیٹھ ولی بھائی کے حوالے کر دو۔ جو بے وقوفی ہو چکی اسے بھول جاؤ اور آئندہ عقلمندی کے فیصلے کرو۔''

شاہد کی بات ناصر کے دل پر اثر کر رہی تھی۔ اس نے متاثر کن لہجے میں استفسار کیا ''یار! یہ تمہارے ولی بھائی کہاں پائے جاتے ہیں؟ میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''بھائی' یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔'' شاہد نے جواب دیا۔

ناصر چونکتے ہوئے بولا ''کمال کرتے ہو تم بھی یار...... ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم نے سیٹھ

ولی بھائی کے کاروبار میں تیس ہزار روپے لگائے ہیں اور اب کہہ رہے ہو کہ تم نہیں جانتے ولی بھائی کہاں مل سکتا ہے یہ کیا معمہ ہے؟''

''یہ معمہ نہیں میرے دوست۔'' شاہد سنجیدگی سے بولا۔

''پھر کیا ہے بھائی؟''

''یار' بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنی رقم حنیف کے ذریعے سیٹھ ولی بھائی کے کاروبار میں لگائی ہے۔'' شاہد نے وضاحت کی ''سیٹھ ولی حنیف کے بھروسے کا آدمی ہے اور بانڈ مارکیٹ میں اس کا وسیع کاروبار ہے مگر میرا لین دین براہ راست اس سے نہیں ہوگا۔ حنیف مڈل مین کا رول ادا کر رہا ہے اور میں حنیف پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہوں۔ میں ہی کیا' دفتر کے سب لوگ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر سمجھدار اور چالاک افراد ہیں۔ اگر حنیف کوئی فراڈ شخص ہوتا تو وہ ہرگز اسے رقم نہ دیتے۔''

''تو اس کا مطلب ہے' تمہارے دفتر کے دوسرے لوگوں نے بھی حنیف کے توسط سے سیٹھ ولی بھائی کے کاروبار میں رقمیں لگا رکھی ہیں؟'' ناصر نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

شاہد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا ''اور نہیں تو کیا یار! بھئی' ہمارے دفتر کے اکاؤنٹینٹ تک نے خاصی بھاری رقم حنیف کے ذریعے سیٹھ ولی بھائی کو دے رکھی ہے اور ماہانہ منافع حاصل کر رہا ہے۔''

شاہد کی باتوں سے ناصر کا ذہن تبدیل ہو رہا تھا۔ اس کی پچاس فیصد سوچ اس بات کی حامی تھی کہ اسے پہلی فرصت میں ایک لاکھ روپے کی رقم قومی بچت کی سکیم سے نکال کر سیٹھ ولی بھائی کے کاروبار میں لگا دینا چاہئے۔

شاہد نے اسے خیالات میں غرق دیکھا تو پوچھا ''پھر کیا سوچا ہے تم نے؟''

''یار' تمہاری بات دل کو لگ تو رہی ہے مگر......''

''اگر مگر کیا ہے یار؟'' شاہد نے قطع کلامی کی۔

''یار! میں اس کام کیلئے راضی ہو بھی جاؤں تو ایک مسئلہ بہرحال ہے۔''

''اور وہ مسئلہ کیا ہے میرے دوست؟''

''اماں۔'' ناصر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''شاید وہ اس بات کیلئے تیار نہ ہوں۔''

''تم ان سے بات تو کر کے دیکھو۔'' شاہد نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''جب تم انہیں پرکشش منافع کے بارے میں بتاؤ گے تو یقیناً وہ بھی متاثر ہوں گی۔''

''کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔'' ناصر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھے زیادہ امید نہیں ہے۔''

شاہد نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ''میں نے تو ایک دوست ہونے کے ناتے تمہاری بھلائی اور فائدے کے لئے مشورہ دیا تھا۔ ماننا نہ ماننا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔''

"میں نے کہا نا' اماں سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔" ناصر نے شاہد کا موڈ آف ہوتے دیکھا تو جلدی سے کہا۔ "میں انہیں قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آگے جو خدا کو منظور۔"

شاہد نے اٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے یار! اگر تمہارا پروگرام بن جائے تو مجھے بتا دینا میں ویسے حنیف سے بات کر کے رکھوں گا۔"

"تم ابھی حنیف سے بات نہ کرو۔" ناصر نے جلدی سے کہا۔ "پہلے مجھے اپنا کام کر لینے دو۔"

"ٹھیک ہے' جیسے تمہاری مرضی۔" شاہد نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

ناصر نے اسی روز رات کو نصرت جہاں کے کان میں اس منافع بخش انوسٹمنٹ کی بات ڈال دی بلکہ بڑھ چڑھ کر ایسی دلیلیں دیں کہ اس کی ماں یہ منصوبہ سنتے ہی راضی ہو جائے لیکن نصرت جہاں پوری بات سننے کے بعد فکر مند نظر آنے لگی۔ وہ خاموشی سے یک ٹک بیٹے کو تکے جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں' تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟" ناصر نے پوچھا۔

"بیٹا!" نصرت جہاں نے گمبھیر آواز میں بیٹے کو مخاطب کیا۔ "مجھے تو یہ معاملہ خاصا گڑ بڑ لگ رہا ہے۔ میں اپنے بچپن سے سنتی آئی ہوں...... لالچ بری بلا ہے۔ کہیں ہم زیادہ منافع کے لالچ میں کوئی زک نہ اٹھا لیں۔"

"تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"تم خواہ مخواہ کہو یا میری احتیاط پسندی۔" نصرت جہاں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "بہرحال مجھے کال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

ناصر نے جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں کہا "اماں! تم رقم نہ دینا چاہو تو دوسری بات ہے ورنہ مجھے تو کوئی گڑبڑ یا تشویش کی کوئی بات نظر نہیں آ رہی۔"

ماں کافی دیر تک بیٹے کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی اور بیٹا اپنے موقف پر ڈٹا رہا جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو انہوں نے بحث ختم کر دی۔

ایک ماہ بعد شاہد کو منافع کے پندرہ سو روپے ملے تو سب سے پہلے اس نے ناصر کو آگاہ کیا اور ایک مرتبہ پھر اسے رقم لگانے کا مشورہ دیا۔ ناصر نے گھر آ کر نئے سرے سے ماں کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر بات بن کر نہیں دی۔

اس روز کے بعد سے ناصر چپ چپ رہنے لگا۔ نصرت جہاں اس کی اداسی کا سبب جانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا نادان بیٹا ایک گھاٹے کے سودے کی ضد کر رہا ہے۔ نصرت جہاں کا ناصر کے سوا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتی تھی مگر بیٹے کو ملول اور افسردہ دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ جب ناصر کی خاموشی اور چڑچڑا پن حد سے تجاوز کر گیا تو ایک روز نصرت جہاں نے اس سے کہا۔

"بیٹا! میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہی ہے۔

جب تمہارے ابا اور چھوٹی بہن اس دنیا میں باقی نہیں رہے تو میں اور کتنا عرصہ جی لوں گی۔ میں نے یہ ایک لاکھ روپے اپنے ساتھ قبر میں تو لے کر جانا نہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو کہ میں وہ رقم قومی بچت کی سکیم سے نکال کر تمہارے حوالے کر دوں تو میں کل ہی مرکز قومی بچت جا کر مجاز افسر سے بات کرتی ہوں۔ کہو اب تو تم مطمئن ہو؟"

ناصر نے دوسرے روز ہی شاہد کو بتایا کہ اگلے ماہ وہ بھی ایک لاکھ روپے سیٹھ ولی بھائی کے کاروبار میں لگانا چاہتا ہے۔ "یار شاہد' تم میری طرف سے اپنے دفتر کے آدمی سے بات کر لینا۔"

"میں کیا بات کروں گا یار۔" شاہد نے کہا "میں تمہیں براہ راست حنیف سے ملوا دیتا ہوں تم روبرو بات کر لینا۔ ویسے میں پہلے سے تمہارا تعارف تو کروا ہی چکا ہوں۔"

ناصر نے پوچھا "حنیف تمہارے دفتر میں کرتا کیا ہے؟"

"یار' وہ ہمارے دفتر کا چپڑاسی ہے۔" شاہد نے جواب دیا "مگر کم بخت نے مقدر ایسا پایا ہے کہ ہر وقت ہزاروں میں کھیلتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو ہمارے دفتر کے اکاؤنٹینٹ اور دیگر باحیثیت افراد بھی اس سے قرض لیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی قسمت پر رشک آتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بھائی! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک انسان خود کوشش نہ کرے یہ قسمت بھی ساتھ نہیں دیتی۔ حنیف جب تک اپنی تنخواہ پر گزارہ کر رہا تھا اس کی حالت ایک دم پھٹیچر تھی لیکن جب سے اس نے کوشش کر کے اپنی قسمت کو آزمانا شروع کیا ہے' اس کی اچھی خاصی ٹور بن گئی ہے۔ اب تو اس نے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی سے دوسری شادی بھی کر لی ہے۔"

ناصر کیلئے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ وہ تہ دل سے ایک لاکھ روپے کی رقم حنیف کے توسط سے ولی بھائی کے کاروبار میں لگانے کا خواہاں تھا جس پر اسے ماہانہ پانچ ہزار روپے منافع ملتا۔ منافع کی رقم اتنی پرکشش اور آسانی سے حاصل ہونے والی تھی کہ ناصر کو اس کی چکا چوند میں وہ جال دکھائی نہ دیا جو ازاں بعد اسے اپنی گرفت میں جکڑنے والا تھا۔

آئندہ ماہ ناصر نے ایک لاکھ روپے حنیف کے حوالے کر دیئے۔ اس کے ایک ماہ بعد حنیف نے مقررہ تاریخ پر منافع کی رقم پانچ ہزار روپے ناصر کے دفتر میں حاضر ہو کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ سلسلہ آئندہ دو ماہ تک بہ احسن طریق جاری و ساری رہا مگر چوتھے ماہ ناصر کو منافع کی رقم نہیں ملی۔ حنیف نے تین ماہ تک پانچ ہزار روپے کے حساب سے اسے صرف پندرہ ہزار روپے ادا کیے تھے۔

ناصر نے سب سے پہلے شاہد سے رابطہ کیا۔ شاہد کی زبانی اسے یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ شاہد سمیت اس کے دفتر کے تمام افراد کو اس ماہ منافع نہیں ملا تھا۔

"حنیف اس بارے میں کیا کہتا ہے؟" ناصر نے شاہد سے پوچھا۔

شاہد نے بتایا "ہم نے اس سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ سیٹھ ولی بھائی اچانک

غائب ہو گیا ہے۔ وہ جیسے ہی ہاتھ آئے گا' سب کو منافع کی رقم دے دی جائے گی۔''

''یہ کیا بات ہوئی یار؟'' ناصر نے برہمی سے کہا۔''سیٹھ ولی بھائی اچانک کہاں غائب ہو سکتا ہے۔ حنیف کو چاہئے' اس کے گھر جا کر معلوم کرے۔''

''یہی تو مصیبت ہے یار۔'' شاہد پریشان لہجے میں بولا۔''حنیف اس کے گھر سے واقف نہیں ہے۔ سیٹھ سے اس کا رابطہ بس مارکیٹ تک ہی محدود تھا۔ وہ ولی بھائی کے گھر کبھی نہیں گیا۔''

ناصر یہ سنتے ہی پریشان ہو گیا۔ وہ تشویشناک لہجے میں بولا''اب کیا ہو گا یار' کیا ہماری رقم ڈوب جائے گی؟''

''رقم تو ہم ڈوبنے نہیں دیں گے۔'' شاہد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ڈوبنے نہیں دیں گے تو پھر کیسے بچائیں گے؟''

''تم فکر نہ کرو' ہم سب غور وفکر کر رہے ہیں۔'' شاہد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ ہمارے اکاؤنٹینٹ صاحب بہت ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔ وہ اس مسئلے کو حل کر لیں گے۔ بس ہم کو اس نازک موقع پر صبر وتحمل سے کام لینا ہو گا۔''

ناصر نے کہا''میرا خیال تم سے قدرے مختلف ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو ناصر؟''

ناصر نے کہا''میرے خیال میں صبر وتحمل کے بجائے ہمیں حنیف پر دباؤ ڈالنا چاہئے۔ ہم نے تو اسی کو رقم دی تھی۔ سیٹھ ولی بھائی سے ہمارا کیا واسطہ۔ ہم تو اپنی رقم حنیف ہی سے لیں گے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔'' شاہد نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔''ولی بھائی اگر ہمارے ہاتھ آ بھی جائے تو ہم اس سے رقم کا مطالبہ کس طرح کر سکتے ہیں مگر یہ بھی تو دیکھو کہ حنیف پر ہم کیا دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ وہ بے چارہ خود بہت پریشان ہے۔''

''ہمیں اس کی پریشانی سے کیا مطلب!'' ناصر نے کہا''ہمیں ہماری رقم چاہئے چاہے اس کی وصولیابی کیلئے ہمیں حنیف کو پولیس کے حوالے ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

شاہد نے متحمل لہجے میں کہا''تم خطرناک انداز میں سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں۔ پولیس تو اس معاملے کو اور ہی بگاڑ دے گی۔ ابھی تو حنیف ہم سے تعاون کر رہا ہے۔ وہ پوری شدومد سے سیٹھ ولی بھائی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمیں اس نے یہ تسلی بھی دی ہے کہ اگر ولی بھائی ہاتھ نہ بھی آیا تو وہ خود اپنی جیب سے ہماری رقم واپس کرے گا۔ پولیس میں جانے کی صورت میں وہ برہم ہو کر سرے سے کسی رقم کے لینے سے ہی انکار کر دے گا پھر ہم کیا کریں گے۔ پولیس اور عدالت ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے اور تم جانتے ہو کہ ہم سب نے حنیف کو جو رقم دی ہے وہ کسی لکھت پڑھت کے بغیر دی ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت یا دستاویز نہیں ہے جس سے ہم اپنی بات کو ثابت کر سکیں۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نکلنے کے امکانات ہیں تو ہمیں فی الحال انگلی کو ٹیڑھا کرنے سے اجتناب برتنا چاہئے۔''

یہ نکتہ ناصر کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سب ایک ہی کشتی پر سوار تھے۔ ان کا ڈوبنا تیرنا ایک دوسرے کے ساتھ ہی تھا۔ اس لئے بھی ناصر اختلاف کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اب ان کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شاہد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اکاؤنٹینٹ جلد ہی رقم کی وصولی کے لئے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر لیں گے۔

ایک ماہ گزر گیا۔ حنیف کو سیٹھ ولی بھائی نہ مل سکا اور حنیف اپنے تمام کلائنٹس کو مختلف حیلوں بہانوں سے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ جب اس کی تسلیاں بے اثر ہونے لگیں تو''سی کنگ شپنگ کمپنی'' کے اکاؤنٹینٹ حاجی آفتاب جیلانی نے اپنے باس عبدالکریم شاہ سے اس سلسلے میں بات کی۔ آفتاب جیلانی کے علاوہ کلرک شاہد حسین' چوکیدار انور خان نے بھی حنیف کو اپنے پاس بلایا مگر وہ اپنی معذوری ظاہر کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ سیٹھ ولی بھائی اسے جل دے گیا تھا تاہم اس نے عبدالکریم شاہ سے وعدہ کیا کہ وہ باری باری سب کی رقم ادا کر دے گا چاہے اس کیلئے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔

عبدالکریم شاہ تنازع جھگڑے سے بچنے والا ایک امن پسند کاروباری آدمی تھا۔ اپنی سمجھ بوجھ سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ حنیف سے کچھ بھی نکلوانا ممکن نہیں چنانچہ اس نے اپنی کمپنی کو میدان جنگ بن جانے سے پہلے ہی واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ چونکہ انہوں نے یہ لین دین اس کے علم میں لائے بغیر کیا تھا اس لئے اپنے سود وزیاں کے وہ خود ذمے دار ہیں۔ ازیں علاوہ انہیں تنبیہ بھی کی کہ اس سلسلے میں کسی بھی موقع پر''سی کنگ'' کا نام نہیں آنا چاہئے۔

عبدالکریم کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد باقی افراد نے تو پتا نہیں کیا لائحہ عمل بنایا ہو گا البتہ شاہد کی فراہم کردہ اطلاعات کے بعد ناصر نے اپنی ماں سے واضح الفاظ میں سب کچھ کہہ دیا۔

نصرت جہاں نے پوری کتھا سننے کے بعد بس ایک ہی جملہ کہا''بیٹا' گئی رقم!''

''رقم نہیں نہیں جاتی اماں۔'' ناصر نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

''اب باقی کیا بچا ہے؟''

''میں نے آج ہی حنیف سے ملاقات کی ہے۔'' ناصر نے بتایا''وہ نوکری سے نکالے جانے پر بہت پریشان ہے لیکن پھر بھی اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سب سے پہلے میری رقم ہی واپس کرے گا۔ اس نے مجھے پندرہ دن بعد اپنے گھر بلایا ہے۔ وہ سعید منزل کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔''

نصرت جہاں نے کہا''بیٹا تم بہت سادہ بلکہ بے وقوف ہو۔ وہ تمہیں ٹالنے کیلئے ایسے وعدے کرتا رہے گا۔''

''میرا خیال ہے' ایسا نہیں ہو گا۔'' ناصر نے اپنے لہجے میں مضبوطی بھرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا''میں حنیف سے ایک ایک پیسہ وصول کر کے رہوں گا۔''

نصرت جہاں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ایک سرد آہ بھری اور جائے نماز بچھا کر

اپنے خدا کے حضور سر بہ سجود ہوگئی۔

یہ تھے وہ تمام حالات جن کی بدولت وہ ماں بیٹا اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ حنیف انہیں اور دیگر افراد کو بھی صبح وشام ٹہلا رہا تھا مگر کسی کو ابھی تک ایک پائی بھی ادا نہیں کی تھی۔ ساری تفصیل سننے کے بعد میں نے نصرت جہاں سے پوچھا۔

''کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ آپ نے حنیف کو ایک لاکھ روپے کی رقم ادا کی تھی؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''وکیل بیٹا' یہی تو ناصر سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر یہ اس سلسلے میں کوئی تحریر حاصل کر لیتا تو آج کام آتی۔''

میں نے کہا ''دیکھیں خاتون! میں دوٹوک اور واضح بات کرنے کا عادی ہوں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''آپ نے جو حالات بیان کیے ہیں وہ امید افزا نہیں۔ میں یہ کہنے میں باک محسوس نہیں کرتا کہ حنیف پر آپ کی گرفت نہ ہونے کے برابر ہے۔ عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور اس کیلئے مضبوط دلائل اور ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے اگر آپ لوگ بھرپور تعاون کا مظاہرہ کریں تو کچھ بات بن سکتی ہے۔''

''ہم ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار ہیں۔'' نصرت جہاں جلدی سے بولی ''آپ کی جو بھی فیس ہوگی' ہم دینے کو تیار ہیں۔''

''فیس تو آپ دیں گے ہی مگر میں چاہتا ہوں سارا بوجھ آپ پر نہ پڑے۔'' میں نے کہا ''اگر آپ نے میری ہدایت پر عمل کیا تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''آپ حکم کریں وکیل صاحب!'' اس مرتبہ ناصر نے کہا۔

میں نے اس سے پوچھا ''تم تو بتا ہی چکے ہو' تمہارے پاس حنیف کو رقم دینے کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے۔ کیا تمہاری طرح شاہد وغیرہ بھی ایسا کوئی ثبوت نہیں رکھتے؟''

''میرا خیال ہے' ان کے پاس بھی کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ ''ویسے میں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں۔''

میں نے کہا ''اب تم نہ صرف شاہد سے پوچھو گے بلکہ ''سی کنگ شپنگ کمپنی'' کے جتنے بھی افراد نے حنیف کو رقم دی تھی ان سے مل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرو گے۔''

''یہ میں کر لوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا پھر پوچھا ''آپ کی فیس کتنی ہے وکیل صاحب؟''

میں نے اپنی فیس بتانے کے بعد کہا ''عدالتی اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' نصرت جہاں تشویش آمیز لہجے میں بولی ''ہمارے پاس اتنی رقم......''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے نصرت جہاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''میں

نے عرض کیا ہے نا کہ میں اپنی فیس کا تمام بوجھ آپ پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر آپ کا بیٹا میری ہدایت کے مطابق بھاگ دوڑ کرے تو میں اپنی فیس کو تقسیم کر لوں گا۔''

''میں سمجھی نہیں وکیل صاحب......'' نصرت جہاں الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''دیکھیں' سیدھی سی بات ہے۔ ناصر کے علاوہ' میری حالیہ معلومات کے مطابق شاہد' انور اور حاجی آفتاب جیلانی نے بھی حنیف کو رقم دے رکھی ہے۔ اگر وہ تینوں بھی آپ کے ساتھ مل جائیں تو میری فیس خودبخود چار حصوں پر تقسیم ہو جائے گی۔ میں آپ کیلئے بس اتنی ہی رعایت کر سکتا ہوں۔ ایک چوتھائی فیس کی رقم تو میرے خیال میں آپ کیلئے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''شکریہ بیٹا۔'' نصرت جہاں نے تشکرانہ آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے مزید کہا ''اس طرح نہ صرف میرے موکلین پر بوجھ کم ہو جائے گا بلکہ کیس میں بھی جان آ جائے گی۔ اگر تم......'' میں نے ناصر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''باقی تین افراد کو اس بات کیلئے راضی کر کے میرے پاس لے آؤ تو ممکن ہے' ان سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو حنیف کے خلاف استعمال ہو سکتی ہو۔''

''میں کل ہی ان تینوں سے ملاقات کروں گا۔'' وہ تیقن سے بولا۔

میں نے پوچھا ''حنیف کو نوکری سے کب نکالا گیا تھا؟''

''تقریباً پانچ ماہ پہلے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے' تم لوگوں کو حنیف نے آخری منافع لگ بھگ چھ ماہ پہلے دیا تھا؟''

''جی ہاں' کم وبیش اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا ''اس دوران میں آپ میں سے کسی نے سیٹھ ولی بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''شاہد کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے' آفتاب جیلانی نے ولی بھائی کا کھوج لگانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔'' ناصر نے بتایا ''مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔''

''تم نے بتایا ہے کہ ولی بھائی بانڈ مارکیٹ کا معروف کاروباری تھا۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کے بارے میں مارکیٹ سے معلوم کیا جا سکتا تھا۔''

ناصر نے کہا ''وہیں سے تو معلوم کیا تھا۔ حنیف کا بیان سراسر غلط نکلا۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک اٹھا۔

وہ بولا ''بانڈ مارکیٹ والے کسی سیٹھ ولی بھائی کو نہیں جانتے۔''

نصرت جہاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ''مجھے تو لگتا ہے' ولی بھائی کوئی فرضی کردار ہے جسے حنیف نے بڑی عیاری سے استعمال کیا ہے۔ اصل مجرم حنیف ہی ہے جو ولی بھائی کا جھانسہ دے کر ان احمقوں سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھتا رہا ہے۔''

''میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں خاتون۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''حنیف کوئی نہایت ہی شاطر بندہ معلوم ہوتا ہے۔''

نصرت نے کوسنے والے انداز میں کہا ''غضب خدا کا ان ہی کی رقم سے چند ماہ منافع دیتا رہا اور یہ خوش فہم سمجھتے رہے کہ بڑا منافع بخش کاروبار کر رہے ہیں۔ جب حنیف نے یہ دیکھا کہ شکار پوری طرح جال میں آ چکے ہیں تو اس نے رسی کھینچ دی۔''

ناصر نے کہا ''مگر حنیف صورت سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

''کوئی بھی فراڈ شخص اگر شکل سے فراڈ دکھائی دے گا تو پھر وہ دھوکا دہی میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا برخوردار۔'' میں نے ناصر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مکار و عیار لوگ اپنی وضع قطع اور سٹائل کی مار مارتے ہیں۔''

''اب ہمارے لئے کیا حکم ہے وکیل صاحب؟'' نصرت جہاں نے پوچھا۔

میں نے کہا ''فی الحال آپ چلے جائیں۔ میں نے ناصر کے ذمے جو کام لگایا ہے وہ ہو جائے تو آئندہ کے بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے......اور ہاں' اب آپ کو بار بار میرے دفتر میں چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناصر خود ہی مجھ سے رابطہ رکھے گا۔''

''اور آپ کی فیس......؟''

نصرت جہاں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا ''ذرا صورت حال واضح ہو جائے پھر میں آپ سے فیس وصول کرلوں گا۔''

وہ دونوں شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اسی مزاج کا ایک کیس پہلے بھی میرے پاس آیا تھا۔ قارئین کو یاد ہو گا' چند سال قبل میں نے افضل شاہ نامی ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔ وہ مختلف لوگوں کو بیرون ملک بھیجنے کا جھانسہ دے کر بھاری رقمیں بٹورتا رہتا تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں بھی افضل شاہ کے تین چار ''متاثرین'' نے مل کر میری فیس ادا کی تھی کیونکہ وہ مصیبت زدہ پہلے ہی بہت پریشان تھے۔ اس طرح کیس میں جان بھی پڑ گئی تھی تاہم وہ کیس حالات و واقعات اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بالکل مختلف کیس تھا۔

ناصر اتنے جوش سے اٹھ کر گیا تھا جیسے وہ چند لمحے بعد کامیاب و کامران واپس لوٹ آئے گا اور سینہ تان کر فخریہ انداز میں کہے گا۔ ''لیں وکیل صاحب! میں آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ان تینوں کو یہاں لے آیا ہوں۔ اب گیند آپ کی کورٹ میں ہے۔''

☆......☆......☆

گیند واقعی میری کورٹ میں آ گئی تھی۔

وہ چاروں اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند لمحات میں تو نہیں البتہ چند روز بعد ناصر باقی تین افراد کو بھی قائل و آمادہ کر کے میرے دفتر لے آیا تھا اور وہ سب اس بات پر متفق ہو

گئے تھے کہ مل کر حنیف پر مقدمہ کریں گے۔

''سی کنگ'' شپنگ کمپنی کے اکاؤنٹینٹ حاجی آفتاب جیلانی کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ وہ ایک باریش اور صحت مند شخص تھا۔ اس کی رہائش ناظم آباد میں تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسی سے سوال کیا۔

''حاجی صاحب! آپ نے کتنی رقم حنیف کے پاس پھنسائی ہوئی ہے؟''

''حنیف نہیں سیٹھ ولی بھائی کہیے وکیل صاحب۔'' آفتاب جیلانی نے کہا۔

میں نے کہا ''آپ حنیف کہیں یا ولی بھائی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں بخوبی جان چکا ہوں کہ ولی بھائی اس کھیل میں ایک افسانوی کردار ہے۔ آپ بھی بہت جلد اس فرضی کردار کی حقیقت جان جائیں گے۔ بہرحال' آپ میرے سوال کا جواب دیں۔''

آفتاب جیلانی نے بتایا ''میں نے حنیف کو اسی ہزار روپے دیئے تھے۔''

''اور آپ کو منافع کس حساب سے ملتا تھا؟''

''پانچ فیصد کے حساب سے۔''

''یعنی چار ہزار روپے ماہانہ؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''مگر گزشتہ کئی ماہ سے منافع نہیں ملا۔''

''اور آئندہ بھی کئی ماہ تک ملنے کی امید نہیں ہے۔'' میں نے خیال آرائی کی۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا ''لگتا تو یہی ہے جناب۔''

میں نے کہا ''حاجی صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے' آپ سود کے کاروبار میں ملوث ہو گئے تھے اور خدا کے نزدیک اس لعنت کی کس قدر مذمت کی گئی ہے۔ سود لینا اور دینا دونوں صورتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں؟''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا ''واقعی میں غلطی پر تھا۔ بس کیا بتاؤں وکیل صاحب! لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی مگر میری آنکھیں اب پوری طرح کھل چکی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ میں ایسی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

''جب ٹھوکر لگنے پر آنکھیں کھل جائیں تو یہ انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ''ورنہ بعض افراد تو بار بار کی ٹھوکر کے بعد بھی نہیں سنبھلتے اور اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں جہاں قدم قدم پر گھاٹا اٹھا چکے ہوتے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''آپ چاروں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور آپ کا باہمی اتفاق ہی آپ کو کامیابی دلا سکتا ہے۔''

''میں اسی لیے آپ کے پاس چلا آیا ہوں وکیل صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ہمیں ہماری ڈوبی ہوئی رقم دلوا دیں تو ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

''اس میں احسان کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''میرے پیشے کا تقاضا ہے

کہ میں اپنے موکل کو انصاف دلاؤں لیکن یہ اسی صورت ممکن ہوتا ہے جب موکل بھی میرے ساتھ بھرپور تعاون کرے۔ میں اپنی انہی خدمات کی فیس بھی لیتا ہوں۔''

''آپ مجھے ہمہ وقت آمادہ تعاون پائیں گے۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا ''حاجی صاحب! آپ نے اسی ہزار روپے کی رقم حنیف بہ الفاظ دیگر سیٹھ ولی بھائی کے حوالے کر دی۔ کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی تحریری دستاویز تیار کی تھی؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''نہیں جناب!''

''کیا حنیف نے آپ کو کوئی رسید وغیرہ دی تھی؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔ میں نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

''حاجی آفتاب جیلانی صاحب! آپ تو اکاؤنٹس کے آدمی ہیں۔ دن رات رجسٹر' فائل اور واؤچر سے آپ کا واسطہ پڑتا ہے پھر آپ جیسے زیرک آدمی سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی؟''

وہ شرمندگی سے بولا ''اب کیا بتاؤں جناب! بس یوں سمجھیں' میری تو مت ہی ماری گئی تھی۔ گراں قدر منافع کی شرح نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بے گانہ کر دیا تھا۔ شاید اسی کو لالچ یا طمع کہتے ہیں۔ پھر جب منافع باقاعدگی سے ملنے لگا تو میں اور بھی بے فکر ہو گیا۔''

''گویا آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں جسے عدالت میں اپنے موقف کے حق میں پیش کیا جا سکے؟'' میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس نے معذوری آمیز انداز میں گردن جھٹک دی۔

میں ''سی کنگ'' کے چوکیدار انور خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انور خان کی عمر چالیس کے ارب قریب تھی۔ اس کی رہائش ''بی آئی ڈی سی'' کے نزدیک سلطان آباد میں تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس نے حنیف کو بیس ہزار روپے دیئے تھے جن پر وہ ماہانہ ایک ہزار روپے منافع باقاعدگی سے دیتا تھا پھر ایک روز دوسروں کی طرح اس کا منافع بھی بند ہو گیا اور پتا چلا کہ سیٹھ ولی بھائی منظر سے غائب ہو گیا ہے۔ یہ وہی کہانی تھی جو باقی تمام افراد کے ساتھ پیش آئی تھی تاہم انور خان نے ایک نئی اور قدرے مختلف بات بتائی۔

''خو وکیل صیب!'' وہ اپنے مخصوص پٹھانی لب و لہجے میں بولا ''ام دوسروں کے مافق بالکل ہی خالی ہاتھ نہیں اے۔ امارے پاس رقم کا ایک ثبوت انشاءاللہ موجود ہے۔''

میں نے چونک کر پوچھا ''کیسا ثبوت خان صاحب؟''

''امارے پاس بیس ہزار کا رسید ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا ''سیٹھ ولی نے بہ قلم خود اس پر دستخط مست خط بھی کیا ہوا ہے۔''

''یہ تو آپ نے بڑی اہم بات بتائی ہے۔'' میں نے کہا ''کیا وہ رسید اس وقت آپ کے پاس ہے؟''

''ام رسید کو اپنے ساتھ لایا ہے۔'' وہ جوشیلے انداز میں بولا پھر اپنے شلوکے کی جیبیں

ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مڑا تڑا کاغذ برآمد کرتے ہوئے بولا ''یہ رسید حنیف نے ام کو بنوا کر دیا تھا' امارا فرمائش پر۔ ام نے اس کو بولا تھا' اپنا سیٹھ ولی بھائی سے رقم کا وصولی کا رسید بنوا کر دو۔ اس نے امارا بات ایک دم مان لیا۔''

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انور خان نے وہ تہ شدہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ وہ ایک کچی رسید تھی جس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ کاغذ کی تحریر کچھ اس نوعیت کی تھی۔

''میں نے انور خان سے بیس ہزار روپے وصول پائے...... ولی بھائی۔''

نیچے نہ کوئی رسیدی ٹکٹ چسپاں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا نشان جسے دستخط کہا جا سکتا۔ گواہوں کا اندراج بھی نہیں تھا۔ ''ولی بھائی!'' کے الفاظ کو انور خان نے اس کے دستخط سمجھ لیا تھا۔ اس کچی رسید سے کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی عدالتی اعتبار سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا ''خان صاحب! یہ تو محض کاغذ کا ایک غیر اہم ٹکڑا ہے۔ آپ خواہ مخواہ اسے سنبھالے پھر رہے ہیں۔''

''آپ کیا فرمانا چاہتا ہے وکیل صیب!''

میں نے بہ مشکل تمام انور خان کو اپنا مطمع نظر سمجھایا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ میری وضاحت کو ہضم نہیں کر پایا تھا اور ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا جیسے اس کے پاس کوئی نہایت ہی اہم دستاویز ہو۔

میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر کہا ''خان صاحب! یہ رسید میں اپنے پاس رکھ رہا ہوں ممکن ہے' کسی موقع پر کارآمد ثابت ہو جائے۔''

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

میں نے شاہد حسین کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''شاہد صاحب! ناصر کو آپ نے حنیف سے متعارف کروایا تھا۔ آپ نے خود بھی تیس ہزار روپے اس فرضی کاروبار میں لگائے ہوئے تھے جن پر ماہانہ منافع آپ کو ڈیڑھ ہزار روپے ملتا تھا۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے جس سے واضح ہو سکے کہ آپ نے حنیف کو تیس ہزار روپے دیئے تھے؟''

اس نے حسب توقع جواب دیا ''مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے' آپ نے آنکھیں بند کر کے رقم حنیف کے حوالے کر دی تھی؟''

''بس جی' پڑوس اور شرافت کا معاملہ تھا۔''

''پڑوس اور شرافت سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا ''کیا حنیف تمہارا پڑوسی ہے؟''

وہ ایک ٹھنڈی آہ خارج کرتے ہوئے گویا ہوا ''حنیف نہیں بلکہ اس کے سسرال والے

میرے پڑوسی ہیں۔ میں کورنگی ساڑھے تین میں رہتا ہوں اور ساجدہ کا میکا بھی وہیں ہے۔ ساجدہ اور اس کے گھر والے اس قدر شریف لوگ ہیں کہ میں ان کی شرافت کی وجہ سے حنیف پر اعتبار کر بیٹھا پھر بھیڑ چال بھی ایک چیز ہوتی ہے جناب!" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہاں دفتر میں آفتاب جیلانی جیسے زمانہ شناس نے حنیف کو رقم دے رکھی تھی۔ میں نے سوچا' حنیف قابل بھروسہ ہے جبھی تو آفتاب صاحب بھی مطمئن ہیں پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے حنیف نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ آکڑوں اور پرچیوں کے حوالے سے اس نے ہمیشہ میری مدد کی تھی۔"

میں نے دل میں کہا" آفتاب جیلانی جیسے لوگوں کی مثال سیانے کوے کی سی ہوتی ہے جو ہمیشہ گوبر پر بیٹھتا ہے البتہ حنیف کا مدد کرنا بھی اس کی ایک چال تھی۔ وہ چھوٹے موٹے فائدے پہنچا کر لوگوں کا اعتماد حاصل کرتا رہا پھر ایک ہی مرتبہ ساری کسر نکال لی۔" میں نے یہ ساری باتیں شاہد سے نہیں کہیں بلکہ ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

"شاہد حسین! ابھی آپ نے کسی ساجدہ نامی عورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں گے؟"

وہ بولا "ساجدہ' حنیف کی بیوی کا نام ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے' حنیف نے دوسری شادی کر لی ہے۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "اور وہ اپنی کم عمر بیوی کے ساتھ سعید منزل کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے وکیل صاحب!" وہ تائیدی لہجے میں بولا "حنیف کی حسین وجمیل کم عمر بیوی کا نام چاندنی ہے جبکہ ساجدہ اس کی پہلی بیوی ہے جو میکے ہی میں رہتی ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا حنیف اور ساجدہ کے درمیان علیحدگی چل رہی ہے؟"

"میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا" وہ عام سے لہجے میں بولا "میں نے سنا ہے' تقریباً دو سال سے ان کے بیچ ناراضی چل رہی ہے۔ علیحدگی یا طلاق کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "جو معلومات نہیں ہیں' وہ اب تمہیں حاصل کرنا ہیں۔ حنیف کے حالات و معاملات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان کاری آپ لوگوں کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"

"جی' میں آپ کی ہدایت کے مطابق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا" شاہد نے نہایت فرماں برداری سے کہا۔

میں نے کہا "تم نے ساجدہ کے دو بچوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نام اور عمریں کیا ہوں گی؟"

"بڑی بچی انیلہ آٹھ سال کی ہے" شاہد نے بتایا "اور چھوٹے بیٹے فواد کی عمر پانچ سال ہو گی۔"

میں نے تمام ضروری باتیں پیڈ پر نوٹ کر لیں اور ان چاروں کے ذمے مختلف کام لگا کر اہم ہدایات کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا۔ جانے سے پہلے وہ میری فیس ادا کرنا نہیں بھولے تھے۔

اس رات میں نے حنیف کے بارے میں ہر پہلو سے غور کیا۔ اس سے متعلق حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب تھی۔ اس کی پوری زندگی مختلف دفاتر میں چپڑاسی کی نوکری کرتے ہوئے گزری تھی تاہم "سی کنگ" میں وہ ایک طویل عرصے سے ٹکا ہوا تھا اور خیر اب تو وہاں سے بھی نکالا جا چکا تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ آج کل وہ گھر پر بہت کم پایا جاتا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا اور کہاں غائب رہتا تھا' اس بارے میں کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے اس کے سعید منزل والے فلیٹ کا پتا اپنے پاس نوٹ کر لیا تھا۔

ایک بات تو طے تھی کہ حنیف نے بڑا منظم فراڈ کیا تھا۔ اس نے اس کارروائی کیلئے انسانی نفسیات سے کام لیا تھا اور "لالچ" کا کارڈ استعمال کر کے کامیاب رہا تھا' اس مہارت کے ساتھ کہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت بھی نہیں چھوڑا تھا۔

پہلی نظر میں تو مجھے اس کیس میں کوئی جان دکھائی نہ دی۔ موجودہ حالات و واقعات کے پیش نظر اگر حنیف پر مقدمہ دائر کر دیا جاتا تو اس کے جرم کو عدالت میں ثابت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ وہ جج کے سامنے میرے موکلین سے کسی بھی قسم کی رقم کی وصول یابی سے صاف انکار کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں عدالت دعوے کے حق میں مجھ سے ثبوت مانگتی اور اگر میں ٹھوس ثبوت فراہم کرنے میں ناکامیاب رہتا تو عدالت وہ مقدمہ خارج کر دیتی۔ گویا حنیف باعزت بری ہو جاتا۔

صورتحال خاصی پیچیدہ اور حوصلہ شکن تھی۔ میں اس کام کا بیڑا اٹھا چکا تھا تو اب مجھے کوئی نہ کوئی حل بھی تلاش کرنا تھا۔ طویل سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حنیف کو عدالت میں طلب کرنے سے پہلے اس پر کچھ "کام" کیا جائے۔ ممکن ہے' اس طرح ہمارے ہاتھ میں اس کی کوئی کمزوری آ جائے جو ازاں بعد کورٹ میں مفید ثابت ہو سکتی ہو اور اس بات کے بھی امکانات موجود تھے کہ وہ میرے حربوں سے ہراساں ہو جائے اور کورٹ میں جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو سب کیلئے بہتر ہوتا۔

آئندہ روز میں نے حنیف کے نام ایک نوٹس تیار کروایا اور بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک اس کے گھر کے پتے پر روانہ کر دیا۔ اس طویل نوٹس کا مضمون انگریزی میں کچھ اس طرح تھا۔

"میرے موکلین ناصر ولد نصیر احمد' حاجی آفتاب جیلانی ولد مقبول جیلانی' شاہد حسین ولد تصدق حسین اور انور خان ولد دلدار خان نے مجھے بتایا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تم نے زیادہ منافع کا لالچ دے کر ان سے علی الترتیب ایک لاکھ' اسی ہزار' تیس ہزار اور بیس ہزار روپے ہتھیا لئے تھے۔ اس سلسلے میں تم نے ایک فرضی شخص سیٹھ ولی بھائی کی آڑ استعمال کی جس کا وجود تا حال دریافت نہیں ہو سکا اور پوری بانڈ مارکیٹ ایسے کسی شخص کی واقفیت سے انکاری ہے۔ دراصل تم نے ولی بھائی کا نام سادہ لوح افراد کو جھانسا دینے کیلئے استعمال کیا تھا۔ میرے موکلین کے مطابق تم چند ماہ تک نہایت باقاعدگی سے

انہیں ان کا طے شدہ منافع دیتے رہے مگر اب کچھ عرصے سے تم نے ولی بھائی کے غیاب کا ڈرامہ رچا کر انہیں تباہی کے غار میں دھکیل دیا ہے۔ تم آئے روز ان سے رقم دینے کا وعدہ کرتے ہو اور وہ بے چارے تمہارے گھر کے چکر لگا لگا کر ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں۔ تمہاری یہ حرکت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے سراسر غلط ہے اور اس کیلئے تم پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ چار سو بیس کا اطلاق ہوتا ہے۔ تمہارا جرم قابل دخل اندازی پولیس ہے اور تمہیں بلا وارنٹ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ عدالت تمہیں اس دغا پر کم از کم سات سال کیلئے جیل بھجوا سکتی ہے اور جرمانہ اس کے علاوہ ہوگا۔ میرے معزز موکلین نے مجھے کچھ ایسے ثبوت اور شواہد فراہم کئے ہیں کہ تمہیں عدالت میں بہ آسانی مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے لہٰذا اس ابتدائی نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ عرصہ پندرہ یوم کے اندر اندر میرے موکلین کی رقم واپس لوٹا دو۔ بصورت دیگر پہلی فرصت میں تمہارے خلاف سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔“

درج بالا نوٹس میں اس کے علاوہ چند ٹیکنیکل اور خالصتاً قانونی نوعیت کی باتیں بھی موجود تھیں جن کا ذکر قارئین کو بور کرے گا اس لئے میں نے دانستہ انہیں حذف کر دیا ہے۔

میں نے حنیف پر دباؤ ڈالنے کیلئے سچ میں جھوٹ کی آمیزش بھی کی تھی حالانکہ میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا جس سے حنیف کا مجرم ہونا ثابت کیا جا سکتا تاہم یہ میری ایک چال تھی۔ چالبازوں سے نمٹنے کیلئے ایسی چالیں چلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ آپ اسے پارٹ آف دی گیم بھی کہہ سکتے ہیں۔

مجھے امید تھی کہ یہ نوٹس پڑھتے ہی حنیف کو پتنگے لگ جائیں گے۔ وہ اب تک یہی سمجھ بیٹھا ہوگا کہ بس رقم ہضم کر لی‘ کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ویسے بھی اس نے یہی مشہور کر رکھا تھا کہ فراڈ ولی بھائی نے کیا ہے۔ وہ بے چارہ تو اس کے باوجود بھی چٹی بھرنے کو تیار ہے۔ وہ خود کو مظلوم اور مجبور ظاہر کر کے اصل مظلوموں اور مجبوروں کی ہمدردیاں سمیٹنا چاہتا تھا اور اپنے اس مقصد میں وہ اب تک کامیاب بھی رہا تھا مگر اب بازی پلٹ چکی تھی یا پلٹنے ہی والی تھی۔

میں نوٹس بھیجنے کے بعد نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔

☆......☆......☆

نوٹس کی ترسیل کے بعد ایک ہفتے بعد نتیجہ برآمد ہوا۔

میں اپنے دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میری سیکرٹری فرزانہ نے انٹرکام پر اطلاع دی ”کوئی حنیف صاحب آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔“

میں اپنے چیمبر میں آنے سے قبل انتظار گاہ پر ایک سرسری نظر ڈالتا آیا تھا‘ وہاں صرف ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا چونکہ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اس لئے اسے حنیف کی حیثیت سے پہچان نہ سکا۔ میں نے اپنی تصدیق کی خاطر فرزانہ سے پوچھا۔

”کیا حنیف صاحب وہی ذات شریف ہیں جو ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے؟“

سیکرٹری نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے‘ اسے میرے پاس بھیج دو۔“

چند لمحے بعد میرے چیمبر کا دروازہ کھلا اور حنیف بہ نفس نفیس اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے خاصا صحت مند تھا۔ اس نے اخروٹی رنگ کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ وہی حنیف ہے جس نے ولی بھائی کی آڑ میں معصوم اور سادہ دل لالچی لوگوں کی رقمیں ہڑپ کی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک لفافہ بھی تھا۔

اس نے آنے کے ساتھ ہی ایک دھواں دھار سوال جڑ دیا گویا رسمی علیک سلیک کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ یا تو غیر مہذب اور بد اخلاق تھا یا پھر اس وقت انتہائی طیش کے عالم میں تھا۔ وہ جب بولا تو میرے آخر الذکر خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہ اس وقت انتہائی غصے میں تھا۔

”مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ‘ آپ ہی ہیں؟“ اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

میں نے اس کے لہجے کی ترشی کا زیر لب مسکراہٹ سے جواب دیا اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا ”جی ہاں‘ میں ہی مرزا امجد بیگ ہوں۔ تشریف رکھیں۔“

اس نے جارحانہ انداز میں ایک کرسی کھینچ کر تشریف رکھ دی۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ”جی فرمایئے؟“

”میں یہاں فرمانے نہیں آیا“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”پھر کیا کرنے آئے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ بولا ”آپ کو کھری کھری سنانے آیا ہوں۔“

”تو سنایئے کھری کھری“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفید لفافہ میرے سامنے میز پر پٹختے ہوئے پوچھا ”یہ نوٹس آپ نے بھیجا ہے؟“

میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا ”ہاں‘ لفافہ تو میرے دفتر ہی کا ہے۔“ پھر میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا ”آپ اتنے برہم کیوں ہیں حنیف صاحب؟“

”میری برہمی کی وجہ آپ کا بھیجا ہوا یہ بے ہودہ اور بوگس نوٹس ہے“ وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے کہا ”اگر یہ نوٹس آپ کے خیال میں بوگس ہے تو پھر آپ اتنے چراغ پا کیوں ہیں؟“

”میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اس قسم کی دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں“ وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے ازراہ تعفن پوچھا ”پھر آپ کس قسم کی دھمکیوں سے ڈرتے ہیں؟“

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور تنبیہی لہجے میں بولا ”آپ ان جھوٹوں کی پیروی کر کے اچھا نہیں کر رہے مسٹر امجد بیگ‘ اس‘ چنڈال چوکڑی کو مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ انہوں نے آپ کو غلط

انفارمیشن دی ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کا ایک پیسا بھی نہیں دینا اور وہ اس لئے نہیں دینا ہے کہ میں نے کبھی ان سے ایک پائی نہیں لی۔ ان کا دعویٰ جھوٹا اور مبنی بر سازش ہے۔''

''اگر آپ سچے اور کھرے ہیں تو پھر آپ کو فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا ''آپ کے انداز اور تیور دیکھ کر تو لگتا ہے کہ اس معاملے میں آپ کے ہاتھ صاف نہیں ہیں۔''

''انشاء اللہ میرے ہاتھ صاف اور نیت پاک ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا ''میں تو یہاں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ ان چار بدمعاشوں نے آپ کو ایسے کون سے ثبوت مہیا کئے ہیں جن کی بنا پر آپ مجھے عدالت میں کسی سنگین جرم میں ملوث ثابت کرسکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''جب آپ قصوروار نہیں ہیں، آپ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا تو پھر آپ اس سلسلے میں تشویش میں کیوں مبتلا ہیں۔ خاموش ہو کر گھر بیٹھیں۔ سورج طلوع ہوگا تو دنیا دیکھے گی۔''

''میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھ سکتا جناب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''آپ کے اس نوٹس کا جواب تو میں آپ کو وکیل کے ذریعے ہی دوں گا۔ میں نے عثمانی صاحب سے بات کرلی ہے۔ فی الحال تو آپ یہ بتائیں کہ آپ نے مجھے دفعہ چارسوبیس میں ملوث کرنے کی دھمکی کیوں دی ہے؟ میں نے ایسی کیا دغا کی ہے؟''

میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ''آپ نے میرے مبینہ موکلین کے ساتھ جو ''حرکت'' فرمائی ہے وہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ چارسوبیس کے ذیل میں آتی ہے۔ اس دفعہ کے تحت...... جو کوئی شخص کسی شخص کو دھوکا دے کر بہ ایں طور دھوکا کھانے والے شخص کو فریب یا بددیانتی سے ترغیب دے کہ وہ کوئی مال کسی دوسرے شخص کے حوالے کرے یا اس پر رضامندی ظاہر کرے کہ کوئی شخص کوئی مال قبضے میں رکھے یا بہ ایں طور کسی قیمتی کفالت یا کسی شے کے جو دستخط شدہ یا مہر شدہ ہو اور جو قیمتی کفالت میں تبدیل کئے جانے کے قابل ہو، کل کو یا کسی جزو کو بنائے یا تبدیل کرے یا تلف کرے تو کہا جائے گا کہ اس نے دغا کی۔ ایسے دغاباز شخص کو کسی ایک قسم کی سزائے قید (قید محض یا قید بامشقت) دی جائے گی۔ جس کی میعاد سات سال تک ہوسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔ کچھ آیا سمجھ شریف میں؟''

وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا ''آپ قانون کی ان پیچیدہ اور ہیرپھیر والی باتوں سے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا ''یہ کام آپ کے لئے مخصوص ہے۔''

وہ میرے طنز کو سمجھ نہیں سکا اور بولا ''میں نے فرید عثمانی صاحب کو ساری صورت حال دی ہے۔ وہ آپ کے اس نوٹس کا جواب دے دیں گے۔ اگر آپ نے سمجھ داری سے کام لیا تو ٹھیک ہے، ورنہ......''

اس نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس موقع پر میں اگر بات کو بڑھانا چاہتا تو یہ بہت ہی سہل کام تھا مگر میں نے صبر وضبط کا مظاہرہ کیا اور درگزر سے کام لیتے ہوئے اس کے منہ لگنا مناسب نہ جانا۔ وہ نوٹس والے لفافے کے ساتھ میرے چیمبر سے نکل گیا۔

حنیف نے جس وکیل کا نام لیا تھا اس کی شہرت ایک خاص حوالے سے تھی۔ فرید عثمانی عموماً وکیل صفائی کے طور پر مقدمات کی پیروی کرتا تھا اور اس نے کئی قاتلوں کو بے گناہ ثابت کردکھایا تھا۔ اگرچہ اس کا یہ عمل کسی بھی طور سراہے جانے کے قابل نہیں تھا بلکہ شدید مذمت کا متقاضی تھا لیکن ہمارے یہاں الٹا دستور ہے۔ ہم بہ ظاہر کامیاب نظر آنے والوں کو سرآنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنے اور جاننے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ کامیاب شخص کتنے انسانوں کے سرکچل کر بلند مقام پر پہنچا ہے اور اس کی بلند قامتی میں کتنے بے گناہوں کا لہو شامل ہے۔ بہرحال فرید عثمانی کے ''کارناموں'' نے اسے پیشہ ور مجرموں میں بہت زیادہ مقبول کردیا تھا۔ وہ ان کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا...... اور حنیف فراڈیے نے اب اسی فرید عثمانی کی خدمات حاصل کی تھیں۔

حنیف کی ذات نے مجھے شش وپنج میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کی ساری عمر چپڑاسی گیری میں گزری تھی مگر وہ اپنی بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے چپڑاسی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ''سی کنگ'' شپنگ کمپنی والے اسے سات سو روپے ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ سعید منزل والا فلیٹ کرائے کا تھا جس کا کرایہ دو سو روپے تھا۔ فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد پانچ سو روپے میں جیسا گزارہ ہونا چاہئے، حنیف کا حلیہ اور حالت اس سے لگا نہیں کھاتے تھے پھر اس کی گفتگو میں جو اعتماد اور جارحیت تھی وہ بھی چپڑاسی برادری میں عام طور پر نظر نہیں آتی۔ ویسے میں نے اس مختصری ملاقات میں اتنا اندازہ تو لگالیا تھا کہ وہ بہت کائیاں اور شاطر شخص تھا۔ ایسے افراد بحرالکاہل کے مانند ہوتے ہیں۔ چاہے وہ معاشرے میں کسی بھی مقام پر فائز ہوں، ان کی تہ تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں نے اسی لمحے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ میں اس دغاباز کا قد بھی ناپوں گا اور اس کی تہ پیائی بھی کروں گا۔

☆......☆......☆

دو روز بعد شاہد حسین میرے دفتر میں آیا۔ وہ خاصا پرجوش دکھائی دیتا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا ''بیگ صاحب! آپ کے لئے ایک اہم خبر لایا ہوں۔ ممکن ہے، ہمارے لئے مفید ثابت ہو۔''

''بھئی، وہ اہم خبر کیا ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

شاہد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ساجدہ، آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''کون ساجدہ؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"حنیف کی پہلی بیوی۔"

"اوہ!" مجھے فوراً یاد آ گیا۔ شاہد نے حنیف کی سسرال کے بارے میں مجھے پہلے بھی بتایا تھا۔ ساجدہ شاہد کے پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ گزشتہ دو سال سے اپنے والدین کے پاس رہ رہی تھی۔ حنیف سے اس کی ناراضگی چل رہی تھی۔ میں نے ان حالات کو ذہن میں تازہ کرنے کے بعد سوال کیا "ساجدہ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہے؟"

"جناب! آپ کی ہدایت پر میں نے معلومات حاصل کی تھیں" شاہد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا "ان میاں بیوی میں طلاق نہیں ہوئی، بس ایک طویل ناراضگی کے تحت وہ دونوں الگ رہ رہے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ساجدہ کو حنیف کی دوسری شادی کا علم نہیں تھا۔ جب میں نے اسے بتایا تو وہ بہت پریشان ہوئی پھر جب اسے ہمارے ساتھ ہونے والے فراڈ کی خبر ہوئی تو اس نے آپ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ساجدہ کے بھائی کا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں فوراً کسی ماہر وکیل سے رجوع کرنا چاہئے۔ میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتا دیا۔ اب ساجدہ اور اس کا بھائی فرقان پہلی فرصت میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

پھر شاہد نے فرقان کے بارے میں بتایا کہ وہ کورنگی انڈسٹریل ایریا کی کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ وہ حنیف کو نفرت کی حد تک ناپسند کرتا تھا۔ بہن کی وجہ سے وہ اب تک خاموش تھا۔ انہیں بھی امید تھی کہ ایک دن میاں بیوی کے اختلافات ختم ہو جائیں گے مگر تازہ ترین صورت حال نے ان کی یہ امید یکسر ختم کر دی تھی۔

شاہد واقعی ایک خاص خبر لایا تھا۔ میں نے اس سے دوبارہ پوچھا "ساجدہ اور اس کا بھائی فرقان مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"وہ حنیف پر مقدمہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"کس قسم کا مقدمہ؟"

وہ بولا "میں نے فرقان کو بتایا ہے کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنا قانوناً جرم ہے۔ حنیف نے اگر ایسا کیا ہے تو اسے اس جرم کا خمیازہ بھگتنا چاہئے۔ فرقان تو پہلے ہی حنیف کی طرف سے بہت تپا ہوا تھا چنانچہ میری بات نے اس کے دل پر اثر کیا۔ اس نے بہن سے بات کی اور اسے مقدمے کے لئے آمادہ کر لیا ہے۔"

"تو یہ راہ انہیں تم نے سجھائی ہے؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے بیگ صاحب!" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "اس طرح ہم حنیف پر پریشر بڑھا سکتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا "میں نے تو ساجدہ کو ایک اور مشورہ بھی دیا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نان و نفقہ کا مطالبہ" اس نے بتایا۔

"تم تو بہت تیز جا رہے ہو شاہد حسین!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"سر!" وہ سنجیدہ لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کیا ان مقدمات سے حنیف بوکھلا نہیں جائے گا؟"

"یقیناً بوکھلا جائے گا" میں نے تائید کی۔

"اور اس سے ہمارا کام آسان ہو جائے گا" وہ جلدی سے بولا "حنیف پر جب چاروں طرف سے یلغار ہو گی تو وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا یعنی وہ ہماری رقم ہمیں واپس دینے پر تیار ہو جائے گا۔ وہ بیک وقت اتنے مقدمات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر شاہد نے پوچھا "بیگ صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

میں نے کہا "تمہارے آئیڈیا میں دم ہے، اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے مگر اس میں ایک پیچ ہے۔"

"کیا پیچ؟" شاہد نے پوچھا۔

میں نے بتایا "ان دونوں مقدمات کی نوعیت میں بہت فرق ہے، میرا مطلب ہے اگر ہم مقدمات کریں تو، فی الحال تو ہم عدالت سے بہت دور ہیں۔ خیر......"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاہد نے جلدی سے کہا "تو میں کل ساجدہ اور فرقان کو آپ کے پاس لے آؤں؟"

"لے آؤ" میں نے سرسری لہجے میں کہا "ان سے ملاقات کے بعد شاید صورت حال زیادہ واضح ہو جائے۔"

"شکریہ بیگ صاحب!" شاہد نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ایک بات اور" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ساجدہ سے کہنا، اپنا نکاح نامہ بھی ساتھ لائے۔ نکاح نامہ کے مندرجات کو دیکھ کر ہی کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں گا۔"

"او کے سر!" یہ کہہ کر شاہد میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

آئندہ روز وہ حسب وعدہ ساجدہ اور فرقان کو میرے پاس لے کر آ گیا۔ فرقان ساجدہ کا بڑا بھائی تھا۔ اس کی عمر کا تخمینہ میں نے چھیالیس سال لگایا۔ وہ عام سی شکل و صورت کا مالک ایک معقول شخص تھا۔ ساجدہ کی عمر سینتیس اور اڑتیس سال کے درمیان تھی۔ اسے قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ دونوں بچوں کو وہ گھر یعنی میکے چھوڑ کر آئی تھی۔

میں نے پہلے باری باری ساجدہ اور فرقان سے تصدیق چاہی کہ وہ واقعی حنیف کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ میرے نزدیک خاص طور پر ساجدہ کی رضامندی ضروری تھی۔ وہ چہرے سے خاصی ملول اور افسردہ دکھائی دیتی تھی۔ میرے استفسار پر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "وکیل صاحب! میں اب تک

صرف اس لئے صبر کئے بیٹھی تھی کہ مجھے امید تھی، ایک نہ ایک دن وہ میری طرف لوٹ آئے گا۔ میں نے آج تک اس سے خرچے کا مطالبہ بھی نہیں کیا مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اس نامراد نے دوسری شادی رچا کر میری آس امید کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اب میں بھی چپ نہیں بیٹھوں گی۔ اس بدبخت کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملنا چاہئے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''وہ اگر اب مجھ سے مصالحت کرنا بھی چاہے گا تو مجھے منظور نہیں ہوگا۔ میں اسے کسی بھی طور پر برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔''

وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے اس ردعمل کے پیچھے یقیناً فرقان کا بھی ہاتھ تھا جو اپنے بہنوئی سے شدید نفرت کرتا تھا ورنہ ساجدہ دو سال سے تو خاموش بیٹھی تھی۔ خاص طور پر حنیف کی دوسری شادی نے اسے بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا۔

میں نے پوچھا ''آپ نکاح نامہ ساتھ لے کر آئی ہیں؟''

ساجدہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور فرقان نے ایک تہ شدہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ وہ ساجدہ اور حنیف کے نکاح نامے کا ایک پرت تھا۔ میں اپنے مطلب کے مندرجات پر غور کرنے لگا۔

بہ صورت ناچاقی نکاح نامے کی رو سے حنیف تین سو روپے ماہوار بطور نان ونفقہ ساجدہ کو دینے کا پابند تھا۔ ازیں علاوہ حق مہر کے خانے میں بیس ہزار روپے عندالطلب درج تھا۔

میں نے ساجدہ سے سوال کیا ''کیا آپ نے حنیف سے اپنا مہر وصول کر لیا ہے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا، میں نے پوچھا ''کیوں؟''

وہ بولی ''میں جب تک اس کے ساتھ رہی، کئی مرتبہ میں نے اس سے مہر کا مطالبہ کیا مگر ہر مرتبہ اس نے کوئی معذوری ظاہر کر کے ٹال دیا اور مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔''

''حالانکہ نکاح نامے کے مطابق آپ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ آپ جب بھی چاہیں، اپنے شوہر سے مہر کا مطالبہ کر سکتی ہیں اور وہ آپ کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہے۔''

وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔

فرقان نے پوچھا ''وکیل صاحب! یہ موجل اور غیر موجل مہر کا کیا چکر ہوتا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔'' میں نے کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بتایا ''نکاح نامے کے کالم نمبر تیرہ میں مہر کی رقم کا اندراج کیا جاتا ہے جبکہ کالم نمبر چودہ میں مہر کی نوعیت کی وضاحت کی جاتی ہے۔ یعنی کالم نمبر چودہ میں درج ہے...... مہر کی کتنی رقم معجّل اور کتنی موجل'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''مہر معجّل کے معنی ہیں فوری طور پر ادا کیا جانے والا مہر اور مہر موجل کے معنی ہیں ایسا مہر جس کی ادائیگی کے لئے کچھ مہلت حاصل کر لی جائے یعنی بعد میں ادا کیا جانے والا مہر۔ مہر غیر موجل، مہر موجل کی ضد ہے یعنی مہر معجّل اور مہر غیر موجل

ایک ہی نوعیت کے مہر ہیں۔ اس کالم کی بھرائی کے وقت فریقین کی رضامندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے عموماً لفظ ''عندالطلب'' درج کر لیا جاتا ہے جس کے واضح معنی یہ ہوتے ہیں کہ بیوی جب بھی چاہے، اپنے خاوند سے اپنا یہ حق مانگ سکتی ہے اور از روئے قانون شوہر اپنی بیوی کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہوتا ہے تاہم باہمی افہام وتفہیم سے مدت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ویسے عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اس سلسلے میں بیویاں مار کھا جاتی ہیں۔ اسی فیصد شوہر اپنی لچھے دار باتوں اور بہانے بازیوں سے بیویوں کے مطالبے کو ٹالتے رہتے ہیں۔ بعض تو چالاکی و مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہر معاف بھی کروا لیتے ہیں جو کہ قابل مذمت ہے۔ مہر عورت کا حق ہے اور یہ حق اسے ہر حال میں ملنا چاہئے۔''

ساجدہ اور فرقان مزید آدھا گھنٹا میرے دفتر میں موجود رہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں ان کی ہر ممکن قانونی مدد کروں گا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

رات کو گھر آ کر میں اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ ساجدہ والا معاملہ اگرچہ حنیف کے فراڈ والے معاملے سے قطعی الگ تھا مگر شاہد حسین کی اس بات میں مجھے وزن محسوس ہوا کہ اس حوالے سے حنیف پر دباؤ بڑھایا جا سکتا تھا۔ جب بیک وقت اسے کئی ایک محاذوں پر لڑنا پڑتا تو وہ اپنی چوکڑی بھول کر تیر کی طرح سیدھا ہو جاتا۔

سونے سے پہلے میں مطالعے کا عادی ہوں۔ اس رات بھی میں ایک ضخیم قانونی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تیسری بیل پر میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب آفتاب جیلانی تھا۔ اس کی آواز میں خاصی گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا ہو گیا آفتاب صاحب؟''

''میں اس معاملے سے الگ ہونا چاہتا ہوں'' وہ بے طرح بولا۔

میں نے کہا ''آخر بات کیا ہے؟ آپ کس معاملے سے الگ ہونا چاہتے ہیں اور آپ یہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟''

''میں حنیف والے معاملے کی بات کر رہا ہوں بیگ صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا ''آپ میرا نام اپنے موکلین کی فہرست سے نکال دیں۔ میں اپنی فیس کی رقم بھی آپ سے واپس نہیں لوں گا اور نہ ہی مجھے میرے ڈوبے ہوئے اسی ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ عزت اور جان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''آفتاب صاحب! آپ کی بے ربط باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو آپ بیٹھے بٹھائے اس معاملے سے دستبردار ہونے کا اعلان کر رہے ہیں؟''

''بیٹھے بٹھائے نہیں بیگ صاحب!'' وہ روہانسی آواز میں بولا ''میں بہت مجبوری کے عالم

میں یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔"

"کیسی مجبوری؟" میں نے کہا "ذرا وضاحت کریں؟"

وہ بولا "اگر زندگی اور عزت محفوظ رہی تو انشاء اللہ کئی اسی ہزار کما لوں گا مگر میں ایٹم بم کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

"ایٹم بم!" میں چونک اٹھا "بھئی، یہ ایٹم بم بیچ میں کہاں سے آگیا؟"

"یہ ایک بدمعاش کا نام ہے" آفتاب جیلانی نے بتایا "کئی قتل، ڈکیتیاں اور مجرمانہ وارداتیں اس کے کریڈٹ پر ہیں۔ اس کا اصل نام اصغر ہے لیکن وہ ایٹم بم کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ عرصہ قبل شہر کے ایک ممتاز صحافی کا قتل ہوگیا تھا۔ قاتلوں میں ایٹم بم کا نام بھی لیا جارہا تھا، شاید آپ کو یاد ہو!"

مجھے فوراً یاد آگیا۔ واقعی، چند ماہ پہلے شہر کے ایک ممتاز اور معزز صحافی کو بڑی بے دردی سے فائرنگ کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس صحافی کے مبینہ قاتلوں میں تین افراد شامل تھے۔ پولیس نے سرتوڑ کوشش کرکے سلیم الدین عرف سلو اور رجب علی عرف راجا کو گرفتار کرلیا تھا تاہم ان کا تیسرا ساتھی اصغر عرف ایٹم بم تاحال مفرور تھا۔

میں نے فون پر آفتاب جیلانی سے پوچھا "ایٹم بم سے آپ کا کیا تعلق؟"

"میرا کوئی تعلق نہیں، وہ حنیف کا تعلق دار ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اٹھا۔

"مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ اگر میں حنیف کے خلاف قانونی چارہ جوئی سے دست کش نہ ہوا تو میری نوجوان بیٹی کو کالج آتے جاتے کسی بھی وقت اغوا کرلیا جائے گا۔ نہ صرف اغوا کرلیا جائے گا بلکہ اس کی ناموس کو تار تار کرکے شہر کے کسی بھی چوراہے پر بکھیر دیا جائے گا۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے" میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔

آفتاب جیلانی نے کہا "بیگ صاحب! اسی ہزار روپے پر میں نے مٹی ڈال دی ہے۔ مجھے اپنی چہیتی بیٹی تہمینہ کی جان اور عزت زیادہ عزیز ہے۔ آپ ابھی اور اسی وقت سے مجھے اس معاملے سے بالکل الگ سمجھیں۔"

میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا "کیا ایٹم بم نے براہ راست آپ سے رابطہ کیا تھا اور رابطے کا ذریعہ کیا تھا؟"

"مجھے یہ دھمکی فون پر دی گئی ہے" آفتاب جیلانی نے بتایا "بات کرنے والا خود کو ایٹم بم کہہ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا، وہ ایٹم بم ہی تھا یا کوئی اور۔"

وہ خاصا نروس محسوس ہوتا تھا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ جوان بیٹی کے باپ کو اسی طرح ہراساں ہونا چاہئے تھا تاہم میں نے اس کی تسلی کے لئے کہا۔

"آفتاب صاحب! اصغر عرف ایٹم بم ایک مفرور مجرم ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں

سرگرداں ہے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے چوہے کی طرح کسی محفوظ بل میں چھپا بیٹھا ہے۔ آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔ وہ آپ کا بال بھی بانکا نہیں کرسکتا۔"

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا "ایسے مجرموں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ سامنے آئے بغیر اپنے آدمیوں سے بھی کام نکال لیتے ہیں۔ میں ان خطرناک لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "آپ کو اس سلسلے میں فوراً پولیس سٹیشن میں رپورٹ درج کروانا چاہئے۔ یہ تخویف مجرمانہ کا معاملہ ہے۔ تعزیرات پاکستان کی دفعہ پانچ سو چھ کے تحت اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ہلاک کرنے کی یا ضرر شدید پہنچانے کی یا مکان و جائیداد کو نذر آتش کرنے کی یا کسی ایسے جرم کے ارتکاب کی (جس کی سزا موت ہو یا اتنی مدت کے لئے قید کی سزا وہ جو سات سال تک ہوسکتی ہو) یا کسی عورت کی نسبت بے عصمتی کا اتہام لگانے کی دھمکی دے تو اول الذکر شخص تخویف مجرمانہ کے جرم کا مرتکب ہوگا۔ قانون نے اس جرم کے لئے کڑی سزا مقرر کی ہے۔"

میری وضاحت ختم ہوئی تو آفتاب جیلانی نے کہا "بیگ صاحب! میں ان قانونی معاملات کو سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میرے لئے تہمینہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں۔ میں تھانے جاکر ایٹم بم جیسے جلاد سے براہ راست دشمنی مول نہیں لے سکتا۔"

"آپ بہت زیادہ پریشان ہوگئے ہیں" میں نے کہا "حالانکہ آپ کو اس ٹیلی فونک دھمکی کے بارے میں رپورٹ ضرور لکھوانا چاہئے۔"

وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا "بیگ صاحب! آپ ہماری پولیس اور تھانوں کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ میری مدد تو کیا کریں گے، مجھے یقین ہے، وہ فوراً اپنی پیدا کے لئے سرگرم ہوجائیں گے اور عین ممکن ہے، مجھے ہی کسی چکر میں پھنسا دیں۔"

میں نے کہا "آپ کے علاقے کے تھانے کا انچارج میرا جاننے والا ہے۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا "ایٹم بم نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ اگر میں نے اس سلسلے میں پولیس کو ملوث کیا تو پھر وہ تہمینہ کے ساتھ کسی رورعایت سے کام نہیں لیں گے" ایک لمحے کے توقف سے وہ رو دینے والے انداز میں بولا "بیگ صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ اب میں آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ خدا حافظ!"

اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔ میں نے بھی مایوسی کے انداز میں ریسیور کریڈل کردیا۔

یہ مدعی غائب اور وکیل حاضر والی صورت حال تھی جس پر سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

☆......☆......☆

مقدمہ عدالت میں پہنچنے سے پہلے ہی حنیف سے سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس کی

چوٹ کا جواب دینا ضروری تھا۔ تازہ ترین معلومات کے مطابق اس کا تعلق ایک خطرناک گروہ سے نکل آیا تھا۔ اصغر عرف ایٹم بم پولیس کے لئے موسٹ وانٹیڈ تھا اور اس نے خود یا اپنے کسی آدمی کے ذریعے آفتاب جیلانی کو خوف ناک ''نتائج'' کی دھمکی دی تھی۔ اس سے ایک بات تو ظاہر ہوگئی تھی کہ حنیف بالواسطہ یا بلاواسطہ ایٹم بم سے متعلق تھا۔

حنیف کی پراسرار خاموشی بھی مجھے تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ وہ میرے دفتر سے جاتے ہوئے فرید عثمانی کے ذریعے نوٹس کا جواب دینے کا اعلان کر گیا تھا تاہم ابھی تک مجھے اس طرف سے ''جوابی مراسلہ'' موصول نہیں ہوا تھا۔ آفتاب جیلانی نے ایٹم بم کی دھمکی کے باعث کیس سے ہاتھ کھینچ لیا تھا گویا میرے موکلین میں ایک کی کمی واقع ہو چکی تھی اور اس کمی کو ساجدہ نے پورا کر دیا تھا۔ ساجدہ والے معاملے میں اچھی خاصی جان تھی۔ اگرچہ اس مسئلے کا اول الذکر مسئلے سے کوئی رابطہ نہیں تھا تاہم حنیف کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے یہ کارڈ خاصا مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

دوسری صبح عدالت جانے سے پہلے میں اپنے دفتر پہنچا۔ اس دن عدالت میں میرا صرف ایک ہی کیس تھا جس کی ساعت کے بارے میں، میں نے معلوم کر لیا تھا کہ کتنے بجے شروع ہوگی۔ میرے پاس دو گھنٹے کا وقت تھا اس لئے میں نے اپنی پوری توجہ ساجدہ اور حنیف پر مبذول کرتے ہوئے ساجدہ کی حمایت میں حنیف کے خلاف ایک خاصا طویل نوٹس تیار کروایا اور پہلی فرصت میں وہ نوٹس حنیف کے گھر کے ایڈریس پر پوسٹ کر دیا۔

مذکورہ نوٹس یوں تو خاصا لمبا چوڑا تھا مگر آپ کی دلچسپی اور معلومات کی باتیں کچھ اس طرح درج تھیں۔ عدالتی دستاویزات انگریزی زبان میں تیار کی جاتی ہیں تاہم میں مندرجات کی تفصیل خلاصتاً ترجمہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

''میری موکلہ ساجدہ نے جو کہ تمہاری منکوحہ ہے، مجھے بتایا ہے کہ عرصہ دو سال سے وہ اپنے میکے میں رہ رہی ہے۔ تم نہ تو اسے اپنے ساتھ لے کر جاتے ہو اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھتے ہو۔ تمہاری رنجش اور ناراضگی کا سبب بھی منظر عام پر نہیں آیا۔ ساجدہ جو کہ تمہاری قانونی اور شرعی بیوی ہے، تم اس کی طرف سے اپنے فرائض سے غفلت برتنے کے مرتکب ہو رہے ہو۔ نہ صرف ساجدہ بلکہ تمہارے بچے بھی تمہاری شفقت اور محبت سے محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تم اس قدر سنگ دل اور بے رحم ہو کہ آج تک دو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی تم نے پلٹ کر ان کی خبر نہیں لی کہ وہ کس حال میں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا خدانخواستہ......''

''تم نہ صرف اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے کوتاہی برتنے کے قصوروار ہو بلکہ تم نے نکاح کی روح کو بھی دھچکا پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ساجدہ اور تمہارے نکاح کے وقت نکاح نامے کے کالم نمبر بیس میں کچھ اہم باتیں درج کی گئی تھیں یعنی ...... خدانخواستہ بہ صورت ناچاقی مبلغ تین صد روپے (-/300) ماہوار برائے نان ونفقہ ادا کرنا طے پایا ہے۔

نکاح نامے پر دستخط کر کے تم نے اس معاہدے کی پابندی کا اقرار کیا تھا مگر مصدقہ

اطلاعات و معلومات کے مطابق تم میاں بیوی کے درمیان عرصہ دو سال سے ناچاقی کی صورت حال قائم ہے لیکن معاہدے کی رو سے تم نے ابھی تک ایک پیسا بھی ساجدہ کو نہیں دیا۔ گویا تین صد روپے ماہوار کے حساب سے گزشتہ دو سال میں سات ہزار دو سو روپے تم پر واجب الادا ہیں۔ یہ تو ساجدہ کا قانونی حق ہے۔ ازیں علاوہ تمہارے دونوں بچے بھی تمہاری ذمے داری ہیں۔ تم ان کی کفالت کے لئے قانوناً و شرعاً پابند ہو۔ ان کے اخراجات کے ذیل میں گزشتہ دو سال کا موٹا موٹا حساب بھی لگایا جائے تو تمہاری طرف سات ہزار آٹھ سو روپے نکل آتے ہیں۔ اس طرح کل رقم ملا کر مبلغ پندرہ ہزار روپے بن جاتی ہے جو ہر حال میں تمہیں ادا کرنا ہے۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تم نے چاندنی نامی ایک لڑکی سے شادی بھی رچالی ہے۔ جس کے ساتھ آج کل تم سعید منزل والے فلیٹ میں رہ رہے ہو۔ یہ شادی کر کے تم نے مسلم عائلی قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ عیسوی کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔ ازروئے متذکرہ بالا قوانین...... کوئی بھی شخص پہلی بیوی کی موجودگی میں اس کی مصدقہ قانونی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ جو اس فعل کا مرتکب ہوگا اسے بہ مطابق قانون سزا دی جائے گی۔

''ساجدہ کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کے بارہا مطالبات کے باوجود بھی تم نے ابھی تک اس کے مہر کی رقم مبلغ بیس ہزار روپے ادا نہیں کی۔ تمہارا یہ جرم بھی ناقابل معافی ہے۔ اگر ان بیس ہزار کو اول الذکر پندرہ ہزار میں جوڑ لیا جائے تو تمہاری جانب واجب الادا رقم کا تخمینہ پینتیس ہزار روپے بن جاتا ہے۔

''اس وقت تم ایک ایسی کشتی میں سوار ہو جس کے پیندے میں بیسیوں سوراخ موجود ہیں لہٰذا اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ عرصہ پندرہ یوم کے اندر اندر درج بالا رقم ادا کر دو ورنہ میری موکلہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جائے گی...... اور تمہیں اتنا تو معلوم ہوگا ہی کہ جب عدالت کے دروازے پر دستک دی جاتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔''

حنیف کے سکون کو تہ و بالا کرنے کے لئے یہ نوٹس اکسیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ نوٹس وصول کرتے ہی وہ سیدھا فرید عثمانی کے پاس جائے گا اور کسی اوپائے کی درخواست کرے گا۔ پہلے چار مشترکہ موکلین کے حوالے سے میں اسے مجموعی طور پر دو لاکھ تیس ہزار روپے کی ادائیگی کا نوٹس روانہ کر چکا تھا۔ اب ساجدہ والے پینتیس ہزار روپے ملا کر کل رقم دو لاکھ پینسٹھ ہزار روپے ہوگئی تھی تاہم وہ اول الذکر رقم کی حیثیت سے انکاری تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آخر الذکر رقم کے نوٹس پر وہ کیا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔

دو روز بعد ''سی کنگ شپنگ کمپنی'' کا چوکیدار انور خان گھبرایا ہوا میرے دفتر میں داخل ہوا اور چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

''وکیل صیب! غضب ہو گیا ہے۔''

"کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے خان صاحب؟" میں نے معتدل لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ نے بالکل صحیح فرمایا وکیل صیب!" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "ام پر جو بھی ٹوٹا وہ قیامت کے مافق ہی تو تھا۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے وکیل صیب!" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا "کل رات کو ام ڈیوٹی سے فارغ ہوکر اپنے گھر جارہا تھا۔ امارا گھر ادھر سلطان آباد میں ہے۔ گھر کیا ہے، بس ایک جھگی مافق کوارٹر ہے۔ ام پیدل ہی گھر جاتا ہے۔ تو ام بتا رہا تھا کل رات جب ام پولو گراؤنڈ کے نزدیک پہنچا تو کچھ غنڈا لوگوں نے ام کو گھیر لیا۔"

ایک لمحے کو وہ سانس ہموار کرنے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ تین غنڈا لوگ بہت خطرناک صورت والا تھا۔ وہ ام کو پکڑ کر پولو گراؤنڈ کے ایک تاریک کونے میں لے گیا۔ وہ جدھر چھوٹا سا پانی کا تالاب بنا ہوا ہے جس پر لکڑی کا پل بھی ہے۔ وہاں پہنچتے ہی وہ ام کو مارنے لگا پھر مارتا ہی چلا گیا۔ ام مار کھاتا رہا اور پوچھتا رہا۔ او خانہ خراب کا بچہ، تم ام کو کیوں مارتا؟ وہ مارتے مارتے بولا، ضرور بتائے گا لیکن پہلے مارے گا۔ وہ عجیب خنزیر کا بچہ تھا۔ ام نے سنا اور دیکھا، جو بھی کسی کو مارتا وہ پہلے بتاتا کہ کیوں مارتا مگر وہ تینوں عجیب کھوپڑی کا مالک تھا۔ بولا، پہلے مارتا، بعد میں بتاتا۔

خیر، جب وہ ہمیں مارنے کا کوٹا پورا کر چکا تو ام سے بولا، ہاں، پوچھو، اب کیا پوچھتا۔ ام نے پوچھا، او خدائی خوار، بتاؤ ام کو کیوں مارتا؟ وہ بولا، ایک بات بتاؤ خان صیب! ام نے کہا، پوچھو کیا بات پوچھتا۔ اس نے پوچھا، تمہارے خیال میں بیس ہزار زیادہ قیمتی ہیں یا جان؟ ام نے الو کے مافق آنکھیں گھمایا اور جواب دیا۔ جان سے قیمتی کوئی چیز نہیں لیکن تم ام سے یہ سوال کیوں پوچھتا؟ اس نے امارے سوال کا جواب نہیں دیا اور ام کو ڈرانے والے انداز میں کہا، اگر تمہارا نظر میں جان زیادہ قیمتی تو پھر اپنے بیس ہزار کو بھول جاؤ ورنہ آج تو ام نے تمہارا تھوڑا مرمت شرمت کیا ہے۔ کل کو تمہارا نرخرا بھی کاٹ سکتا ہے۔ ام نے پوچھا، تم ایسا کیوں کرے گا؟ وہ بولا، اس لئے کرے گا کہ تم ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے ہمیں ایک جھانپڑ رسید فرمایا اور غصے سے بولا، بے وقوفوں کی طرح ہمیں کیوں دیکھتا۔ تم نے حنیف کو جو بیس ہزار روپے دیا تھا، اس کو فراموش کردو اور وکیل کے دفتر کے چکر لگانا بھی بند کردو ورنہ کسی گٹر میں سے تمہارا گردن کٹا لاش برآمد ہوگا۔"

طولانی بیان ختم کرنے کے بعد وہ دیدے گھماتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا "وکیل صیب! اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"آپ کیا مطلب سمجھے ہیں؟" میں نے اکتاہٹ آمیز انداز میں پوچھا۔

"ام تو یہی سمجھا ہے کہ حنیف نے ام پر حملہ کروایا ہے۔"

"ہوں!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے پوچھا "اس کے علاوہ ان غنڈوں نے آپ کو کوئی دھمکی وغیرہ بھی دی تھی؟"

"جان کا دھمکی دیا وکیل صیب۔" وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "ام نے آپ کو سارا تفصیل ابھی ابھی بتایا ہے۔"

میں نے پوچھا "ان غنڈوں نے اپنے بارے میں بھی کچھ بتایا تھا؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے وضاحت کی "میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کون لوگ تھے، کہاں سے آئے تھے اور انہیں کس نے بھیجا تھا؟"

وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا "امارا خیال ہے، وہ حنیف کا بھیجا ہوا بدمعاش لوگ تھا؟"

"حنیف کے علاوہ بھی انہوں نے کسی کا نام لیا؟"

"نہیں وکیل صیب۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ آفتاب جیلانی کو ایٹم بم کے حوالے سے ڈرایا دھمکایا گیا تھا لیکن انور خان کی پٹائی کرنے والوں نے ایٹم بم کا حوالہ استعمال نہیں کیا تھا مگر دونوں "کارروائیوں" کا مقصد ایک ہی تھا یعنی انہوں نے حنیف کے پاس جو رقم پھنسائی تھی وہ اس سے دستبردار ہو جائیں اور کسی بھی قسم کی مقدمے بازی کا خیال دل سے نکال دیں۔ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس تھا مگر مجھے یقین تھا آفتاب جیلانی کی طرح انور خان بھی پولیس سٹیشن کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تاہم میں نے اس سے یہ سوال کرنا ضروری سمجھا۔

"خان صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا "آپ کو اس افسوسناک واقعے کی رپورٹ ضرور درج کروانا چاہئے۔"

"رپورٹ...... کہاں؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ظاہر ہے، تھانے میں۔" میں نے کہا۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "وکیل صیب! خدا کا خوف کریں۔ امارا چھوٹا بچہ ہے۔ یہ غنڈا لوگ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ امارا پولیس مولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پولیس تو خود ان خدائی خواروں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اگر ام نے تھانے میں ان کے خلاف رپورٹ درج کروایا تو وہ امارا جینا حرام کردے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا "ایک بات بتاؤں وکیل صیب!"

"ہاں ہاں، بتائیں۔" میں اس کے پراسرار انداز کو دیکھ کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔

وہ بولا "ام اپنا کیس واپس لینا چاہتا ہے۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا تاہم میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور کہا "یہ تو سراسر بزدلی ہے خان صاحب!"

انور خان نے کہا "بزدلی اور بہادری کا مسئلہ نہیں ہے وکیل صیب۔ بس ام اپنے بیوی

بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔ ادھر اورنگی میں امارے ایک رشتے دار کو بھی چند غنڈوں نے اسی قسم کا دھمکی دیا تھا۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ امارے رشتے دار نے بہادری کا مظاہرہ کیا اور غنڈوں کی بات ماننے کے بجائے اس نے مقابلے کی ٹھانی۔ بدلے میں اس کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا گیا۔ اسے زندہ چھوڑ دیا تاکہ وہ بیوی بچوں کو یاد کر کے ساری عمر روتا رہے۔" اس نے ایک جھرجھری لی اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "وکیل صیب! ام اپنے بیس ہزار پر بیس ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ام کو ایک پیسا نہیں چاہئے۔ ام اپنے بیوی بچوں کے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے، آپ اس کیس سے ہاتھ کھینچ رہے ہیں؟"

"ام ہاتھ، پاؤں بلکہ پورا وجود کھینچتا ہے وکیل صیب!" وہ جذباتی لہجے میں بولا "ام کو معاف فرما دیں جناب۔ ام بزدل نہیں، مجبور ہے۔ آج کے بعد ام آپ کو اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر خاموشی کے ساتھ میرے دفتر سے باہر نکل گیا۔ میں موجودہ صورت حال پر سردست افسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہماری پولیس کا جو تصور لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے وہ قابل شرم ہے۔ پولیس تو عوام کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے مگر آج کل عوام پولیس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کی مدد کرنے کے بجائے الٹا انہیں ہراساں کرے گی۔ یہ انتہائی افسوسناک اور باعث ندامت بات ہے۔ صاحب اختیار اور صاحب اقتدار ہستیوں کو اس جانب ضرور توجہ دینا چاہئے۔

موجودہ صورتحال یہ تھی کہ حنیف کے خلاف مقدمہ ابھی عدالت میں دائر نہیں ہوا تھا اور میرے موکلین میں سے دو افراد اس معاملے سے دستبردار ہو گئے تھے۔ باقی دو یعنی ناصر اور شاہد حسین کافی دنوں سے میرے رابطے میں نہیں تھے۔ میں ان کی طرف سے فکرمند تھا۔ ممکن ہے، انہیں بھی اسی قسم کی دھمکیاں دی گئی ہوں اور انہوں نے مجھے بتائے بغیر ہی اس کیس سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا تھا تو یہ اور زیادہ تشویش ناک صورت تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ روز فون پر شاہد حسین سے بات کروں گا۔ میرے پاس ساجدہ کا فون نمبر لکھا ہوا ہے اور شاہد، ساجدہ کا پڑوسی تھا مگر شاہد کو فون کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دوسری روز وہ دونوں میرے دفتر میں موجود تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان دونوں کو باری باری دیکھا اور کہا "دو پنچھی تو اڑ گئے۔ اب تم دو باقی بچے ہو۔"

ان دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ناصر نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟"

میں نے اس سوال کے جواب میں انہیں مختصراً آفتاب جیلانی اور انور خان کو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ پوری بات سننے کے بعد شاہد حسین نے کہا۔

"بیگ صاحب! ہمیں بھی اسی قسم کی دھمکی دی گئی ہے تاہم ہم ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ میں ایسی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

ناصر نے کہا "وکیل صاحب! میں ایسے علاقے میں رہتا ہوں جہاں ایٹم بم گھسنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ وہاں بہت سے میرے ایسے ہمدرد موجود ہیں جو ایٹم بم کا فیوز نکالنے کا گر جانتے ہیں۔"

"تم دونوں کے حوصلے قابل قدر ہیں۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

شاہد حسین نے کہا "یہ بات ایٹم بم اور اس کے حمایتیوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اسی لئے ہمیں محض خالی خولی دھمکی دی گئی ہے ورنہ آفتاب جیلانی اور انور خان کی طرح ہمارے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا تھا۔"

"بہرحال آپ ہماری طرف سے مطمئن رہیں۔" ناصر نے تسلی آمیز انداز میں کہا "ہم آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں گے۔ قانونی مار مارنا آپ کا کام ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہد نے پوچھا "بیگ صاحب! آفتاب جیلانی اور انور کے الگ ہو جانے سے ہمارا کیس کمزور تو نہیں ہو جائے گا؟"

"کچھ فرق تو پڑے گا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "اور ایسی صورت میں جبکہ پہلے ہی ہمارے پاس حنیف کو رقم دینے کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔"

ناصر نے تشویش ناک لہجے میں کہا "پھر کیا ہوگا؟"

"جو بھی ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔" میں نے کہا "حنیف کی طرف گمبھیر سناٹا طاری ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے وکیل کے توسط سے میرے نوٹس کا جواب بھی نہیں دیا۔ لگتا ہے کہ اب ہمیں اپنی کارروائی تیز کر دینا چاہئے۔"

شاہد نے پوچھا "بیگ صاحب! ساجدہ والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"میں نے ساجدہ والے معاملے کے سلسلے میں حنیف کو ایک سخت قسم کا نوٹس روانہ کر دیا ہے۔ اس کے جواب کا انتظار ہے۔"

"اس کیس میں تو اچھی خاصی جان ہے نا؟" شاہد نے استفسار کیا۔

"ہاں، وہ خاصا توانا اور جاندار کیس ہے۔" میں نے کہا "حنیف کے لئے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔"

ناصر نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا "وہ مردود کسی بھی حوالے سے قابو میں آئے، مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"آپ لوگ اطمینان رکھیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اب وہ بچ کر کہیں نہیں جاتا۔ میں نے اس کے گرد جال پھیلا دیا ہے۔"

شاہد حسین نے پوچھا "بیگ صاحب! آپ نوٹس کے جواب کا انتظار کب تک کریں گے؟"

"کون سے نوٹس کے جواب کا؟" میں نے کہا "ساجدہ والے یا آپ لوگوں کے معاملے والے نوٹس کا؟"

"دونوں کا بتادیں۔"

میں نے بتایا "حالات و واقعات سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ رقم فراڈ سے متعلق نوٹس کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے ورنہ اب تک اس کے وکیل کی جانب سے کوئی نہ کوئی جواب موصول ہو چکا ہوتا۔ حنیف اس سلسلے میں ایٹم بم کا استعمال کر رہا ہے البتہ میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ساجدہ کے حوالے سے نوٹس اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد کردے گا۔ میرا خیال ہے کہ آٹھ دس روز میں اس کا مثبت یا منفی ردعمل سامنے آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ناصر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "پھر ہم دس روز بعد آپ کے پاس آئیں گے۔ اس دوران میں ہمیں اگر کچھ کرنا ہو تو بتادیں۔"

ان کے کرنے کا کوئی خاص کام تو نہیں تھا پھر بھی میں نے چند مفید ہدایات دے کر انہیں رخصت کردیا۔

وقت جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، حالات ایک نئی کروٹ لے رہے تھے۔ آفتاب جیلانی اور انور خان کی علیحدگی نے اگرچہ رقم فراڈ والے معاملے کو تھوڑا کمزور کردیا تھا تاہم مجھے امید تھی کہ ایٹم بم کبھی کھل کر سامنے نہیں آئے گا۔ وہ ایک موسٹ سینئر اور ممتاز صحافی کے قتل میں ملوث تھا۔ اس کے دو ساتھی سلو اور راجا قانون کی گرفت میں تھے۔ ایسی صورت حال میں ایٹم بم زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے تو یہ شک بھی تھا کہ حنیف نے میرے موکلین کو خوفزدہ کرنے کے لئے ایٹم بم کا کارڈ کھیلا تھا۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ حنیف نے عام قسم کے غنڈوں کو کچھ رقم دے کر یہ کارروائی کروائی ہو اور ایٹم بم کا نام محض اس لئے استعمال کیا ہو کہ اس کی دہشت سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ پچھلے کئی ماہ سے ایٹم بم کی بربریت اخبارات کی "زینت" بنی ہوئی تھی اور اس کے نام کا خاصا شہرہ ہو رہا تھا۔

ہمارے معاشرے میں جرائم پیشہ افراد کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس "کارخیر" میں عوام اور پولیس دونوں کا ہاتھ ہے۔ کوئی غنڈا، بدمعاش اور سماج دشمن شخص عوام کے ساتھ چاہے کتنی بھی زیادتی کر جائے، ہم میں سے اسی فیصد افراد کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ اس برے آدمی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے بلکہ اس کے ظلم و زیادتی کو اپنی لاچاری و بے بسی سمجھ کر برداشت کرتے رہتے ہیں۔ باقی بیس فیصد افراد میں سے اگر کوئی شکایت لے کر پولیس کے پاس جاتا ہے تو عموماً الٹا خود ہی پھنس جاتا ہے۔ پولیس کے اس غیر سنجیدہ اور غیر ذمے دارانہ رویے سے یہ تاثر عوام میں پختہ ہوتا جارہا ہے کہ ہماری پولیس مجرموں کی پشت پناہی کرتی ہے حالانکہ یہ تاثر یا خیالات کسی بھی طور پر صحت مند کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔

ہمارا معاشرہ بحیثیت مجموعی بڑی تیزی سے تباہی کی جانب گامزن ہے۔ اس بربادی سے بچنے کے لئے ہمیں خود ہی ہاتھ پاؤں مارنا ہوں گے کیونکہ ...... خدا نے کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی...... وغیرہ وغیرہ!

☆......☆......☆

چاندنی کی عمر پچیس سال سے متجاوز نہیں تھی اور وہ اسم بامسمیٰ کی ایک یادگار مثال تھی۔

وہ کچھ دیر تک اضطراری انداز میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی رہی پھر قدرے پریشان لہجے میں بولی "مرزا امجد بیگ آپ ہی ہیں نا؟"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا "آپ کس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئی ہیں؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "آپ مجھے پہچانے نہیں؟"

میں نے دانستہ جھوٹ بولا "بالکل نہیں، شاید ہم آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔"

حالانکہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ حنیف کی دوسری بیوی چاندنی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں، میں نے اپنے دفتر کا مخصوص لفافہ دیکھ لیا تھا۔ یہ وہی لفافہ تھا جس کے اندر میں نے حنیف کو ساجدہ سے متعلق نوٹس بھیجا تھا پھر میں چاندنی کی خوبصورتی کے قصے بھی سن چکا تھا۔ چاندنی اور ساجدہ میں بہ تفریق حسن و جمال وہی تفاوت تھا جو زمین اور آسمان کے درمیان حائل ہے۔

وہ قدرے جھینپے ہوئے لہجے میں بولی "آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہم آج پہلی بار مل رہے ہیں مگر میرا خیال تھا، چاندنی کے حوالے سے آپ فوراً سمجھ جائیں گے۔ خیر۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بتایا "میں حنیف کی بیوی چاندنی ہوں۔ ہم سعید منزل پر ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔"

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اچھا اچھا، تو آپ وہ چاندنی ہیں۔ کہیے، کیسے آنا ہوا؟"

"مجھے آپ سے ایک مشورہ چاہیے۔ قانونی مشورہ!"

"میں قانونی مشوروں کے لئے ہی یہاں بیٹھا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

وہ متامل انداز میں بولی "ویسے اصولی طور پر تو مجھے کسی دوسرے قانونی مشیر کے پاس جانا چاہیے تھا مگر معلوم نہیں، کیا بات ہے۔ میں غیر ارادی طور پر آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ مجھے لاشعوری طور پر امید ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کریں گے۔"

مخالف کیمپ کا سب سے زیادہ اہم فرد خود چل کر میرے پاس آیا تھا، میں بھلا عدم تعاون جیسی بداخلاقی کا مظاہرہ کیسے کرسکتا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ خوش دلی سے کہا۔

"آپ مجھ سے کس سلسلے میں تعاون چاہتی ہیں؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ میرے سامنے میز پر رکھ دیا اور بولی "یہ نوٹس آپ کی

طرف سے حنیف کو بھیجا گیا ہے۔ میری پریشانی کا سبب یہی نوٹس ہے۔''

''معاف کیجئے گا۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا ''اس نوٹس کا مواد تو حنیف کا سکون برباد کرسکتا تھا مگر پریشان آپ ہورہی ہیں؟''

وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ بھی سخت پریشان ہے بلکہ اس کی پریشانی ہی نے مجھے اس راز تک پہنچایا ہے جو اس نوٹس میں بیان کیا گیا ہے۔''

پھر تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بتایا کہ حنیف پچھلے ایک ماہ سے خاصا پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے شوہر کی پریشانی کی وجہ جاننا چاہی مگر وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتا رہا۔ اس صورت حال نے چاندنی کے اندر تجسس کے جذبے کو ابھارا اور وہ اس کے کاغذات کھکھوڑنے لگی۔ اسی کوشش میں وہ نوٹس اس کے ہاتھ لگ گیا۔ نوٹس کے مندرجات پڑھنے کے بعد اس کے ہوش اڑ گئے اور آج وہ حنیف کے علم میں لائے بغیر سیدھی میرے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات سے اتنی پراگندہ خیال دکھائی دے رہی تھی کہ مجھے مجبوراً اس سے سوال کرنا پڑا۔

''اس نوٹس میں درج حقائق سے آپ کی پریشانی کا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق!'' وہ گھائل نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی پھر سوال کیا ''وکیل صاحب! ایک بات سچ سچ بتائیں۔''

چاندنی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ میں عام طور پر مخالف پارٹی کے افراد سے زیادہ فری نہیں ہوتا اور خاص طور پر ان کے کیس پر تو بالکل ڈسکس نہیں کرتا مگر چاندنی کی حالت بتارہی تھی کہ وہ میرے لئے کسی بھی طور پر ضرر رساں ثابت نہیں ہوسکتی تھی بلکہ اگر میں نے اسے ڈھنگ سے کریدنے کی کوشش کی تو وہ میرے لئے مفید مہرا ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے اس کے ہراساں چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''دیکھیں خاتون! میں عام طور پر مخالف پارٹی کے کسی فرد سے کسی بھی طرح کا معاملہ نہیں کرتا مگر آپ کی صورت دیکھ کر مجھے محسوس ہورہا ہے کہ آپ ایک معقول اور سلجھی ہوئی عورت ہیں اور آپ کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کسی بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہیں اس لئے میں کسی فیس کے بغیر آپ کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ پوچھیں، آپ کون سی بات پوچھنا چاہتی ہیں؟''

میں نے دانستہ ہمدردانہ اور تعاون آمیز رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس طرح میں اس کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرسکتا تھا۔

پہلے تو اس نے میرے اس عمل پر تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا پھر گمبھیر لہجے میں بولی ''کیا یہ سچ ہے کہ حنیف کی کوئی پہلی بیوی بھی ہے؟''

چاندنی کے اس سوال نے مجھے معاملے کی تہہ میں پہنچا دیا۔ یقیناً حنیف نے چاندنی سے شادی رچاتے وقت ساجدہ کا ذکر گول کردیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس اہم بات کا علم ہوتے ہی

مجھے دلی مسرت کا احساس ہوا۔

میں نے چاندنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''خاتون! جس طرح آپ کا نام چاندنی اور میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے، جس طرح آج مہینے کی دس تاریخ اور ہفتے کا تیسرا دن یعنی منگل وار ہے، جس طرح سورج مشرق سے طلوع ہوکر مغرب میں غروب ہوتا ہے اور جس طرح ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں بالکل اسی طرح یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ حنیف کی پہلی بیوی کا نام ساجدہ ہے جس سے حنیف کے دو بچے انیلا اور فواد ہیں۔ حنیف کی پہلی بیوی ساجدہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں گزشتہ دو سال سے رہ رہی ہے۔ اس حقیقت کو جھٹلانا بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے آپ دعویٰ کریں کہ آج عیدالفطر ہے۔''

اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ وہ اس وقت زبان سے خاموش تھی مگر یک ٹک متوحش نظر سے مجھے تکے چلی جارہی تھی۔

میں نے ملائمت سے کہا ''آپ کے انداز وتاثرات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حنیف نے آپ کو اپنی پہلی شادی سے ابھی تک بےخبر رکھا ہوا ہے؟''

''آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے، حنیف نے آپ کے ساتھ بھی فراڈ کیا ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چونکی ''کیا مطلب!'' پھر اس نے جلدی سے پوچھا ''کیا حنیف نے کسی اور کے ساتھ بھی فراڈ کیا ہے؟''

''اس کے متاثرین میں سینکڑوں نہیں تو درجنوں افراد ضرور شامل ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''چار کو تو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کیونکہ میں ان کا وکیل بھی ہوں۔ حنیف نے سبز باغ دکھا کر ان چار افراد سے مجموعی طور پر دو لاکھ تیس ہزار روپے ہتھیا لیے ہیں اور انہیں کسی بدمعاش کے ذریعے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا ہے۔ وہ بے چارے بہت خوفزدہ ہیں۔ میں نے ساجدہ والے نوٹس سے پہلے ایک اور نوٹس ان چار افراد سے متعلق بھی حنیف کو بھیجا تھا جس کا تاحال جواب نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے، وہ نوٹس آپ کی نظر سے نہیں گزرا!''

''میں ایسے کسی نوٹس کے وجود سے واقف نہیں ہوں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے بولی ''ساجدہ سے متعلق یہ نوٹس تو بس اتفاق ہی سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔''

''میں آپ کی پریشانی کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں دنیا جہان کی ہمدردی سموتے ہوئے کہا ''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ایک فراڈ...... سراسر فراڈ شخص کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھی ہوئی ہیں۔''

''مجھے پچھلے کچھ عرصے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہورہا ہے۔'' وہ پرخیال لہجے میں بولی ''مگر ساجدہ والا معاملہ تو میری برداشت سے باہر ہے۔ کوئی بھی عورت...... میرا مطلب ہے، کوئی بھی

بیوی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ اتنا بڑا فراڈ کرے۔ یہ غلط بیانی تو ناقابل معافی ہے۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔" میں نے اس کے خیال کی تائید کی پھر مشفقانہ انداز میں پوچھا "آپ کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے، حنیف نے آپ سے شادی کے وقت یہی بتایا ہوگا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے؟"

"جی ہاں، مجھے اس نے یہی بتایا تھا۔"

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا "نکاح نامے میں کیا درج ہے؟"

"نکاح نامہ!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی "میں نے تو آج تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔"

"کیا مطلب!" اب میرے چونکنے کی باری تھی "کیا آپ نے شادی کے وقت نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے تھے؟"

وہ بیزاری سے بولی "کیے تھے۔"

"اس کے مندرجات پر بھی غور کیا تھا؟"

"مجھے اس وقت اتنا ہوش نہیں تھا۔"

"ہوش نہیں تھا، کیا مطلب!"

"آپ اس سے کوئی ایسا ویسا مطلب نہ سمجھیں۔" وہ جلدی سے بولی "میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بس میں نے دستخط کر دیئے، نکاح نامے کے مندرجات کا جائزہ نہ لے سکی تھی۔"

اس کا انداز خاصا الجھا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ کوئی خاص بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو تاہم میں نے اس وقت اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی سوال سے بھڑک جائے یا بدک جائے کیونکہ چاندنی کی صورت میں قدرت نے ایک ایسا مہرا میرے ہاتھ میں دے دیا تھا جو حنیف کے بڑے بڑے مہروں کا قلع قمع کر سکتا تھا۔

میں نے معلومات افزا لہجے میں کہا "خاتون! نکاح نامے کے ایک کالم میں یہ درج کرنا ہوتا ہے کہ آیا دلہا پہلی شادی کر رہا ہے یا اس سے پہلے بھی وہ کوئی شادی کر چکا ہے۔ اس سے مراد یہ جاننا ہوتی ہے کہ آیا دلہا کنوارا ہے، رنڈوا ہے یا شادی شدہ ہے۔ اگر دلہا پہلی مرتبہ شادی کرنے جا رہا ہو تو اس کالم میں "عقد اول" کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔"

"میں ان باتوں سے واقف نہیں ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"حالانکہ آپ کو ان باتوں سے باخبر ہونا چاہئے۔" میں نے پرزور لہجے میں کہا "لگتا ہے، آپ نے شادی کے بعد آج تک نکاح نامے کو کبھی پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا "آپ کی معلومات کے لئے عرض کر دوں کہ نکاح نامہ چار پرت پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ایک جیسی چار کاپیاں۔ ایک کاپی نکاح رجسٹریشن کے

سرکاری دفتر میں جمع ہو جاتی ہے، ایک کاپی نکاح رجسٹرار جو کہ عموماً نکاح خواں ہی ہوتا ہے اس کے ریکارڈ میں چلی جاتی ہے۔ باقی دو کاپیوں میں سے ایک دولہا اور دوسری دلہن کے لئے ہوتی ہے۔ آپ بہ حیثیت دلہن نکاح نامے کی ایک کاپی کا حق رکھتی ہیں۔ حیرت ہے، حنیف نے آپ کو وہ کاپی کیوں نہیں دی۔"

وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا "ویسے تو یہ نکاح خواں کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ دولہا اور دلہن کو فرداً فرداً ان کی کاپیاں بہم پہنچائے لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ شوہر دونوں کاپیاں وصول کر کے لے آتا ہے اور گھر آ کر ایک بیوی کے حوالے کر دیتا ہے۔ کیا حنیف نے ایسا نہیں کیا تھا؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا پھر بولی "میں آج ہی جا کر اس سے پوچھتی ہوں۔"

"آپ ضرور پوچھیں۔" میں نے کہا "لیکن میں اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی بنا پر ایک پیش گوئی کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ حنیف آپ کو نکاح نامے کی کاپی کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گا ورنہ اسے بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ ایک محاذ تو کورنگی میں کھلا ہوا ہے، دوسرا سعید منزل پر کھل جائے گا۔"

"پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

وہ اس وقت کسی بڑی مصیبت میں گھری نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "یہ بہت ہی اہم سوال ہے کہ آپ کو اس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے کیونکہ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولی "کیونکہ...... کیا؟"

میں نے کہا "کیونکہ یہ کہ اگر ساجدہ کی طرف سے مقدمہ عدالت میں جاتا ہے تو وہ اس پوزیشن میں ہے کہ باآسانی مقدمہ جیت جائے۔ اس صورت میں آپ کی پوزیشن خاصی نازک ہو جائے گی۔"

"کیوں، مجھے کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے پرتشویش انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا "آپ نے شاید اس نوٹس کے مندرجات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے میری بات کی تائید کی "میں دوسری شادی یعنی پہلی بیوی کا پڑھ کر ہی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ دیگر باتوں پر میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا "دیکھیں چاندنی صاحبہ! ہماری عدالتوں میں رائج عائلی قوانین کے تحت کوئی بھی شخص اپنی پہلی بیوی کی مصدقہ قانونی اجازت کے بغیر دوسری شادی کا اختیار نہیں رکھتا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا دوسرا نکاح از روئے مسلم عائلی قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ عیسوی باطل قرار پائے گا یعنی اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی بالفاظ دیگر قانونی طور پر آپ کو حنیف کی منکوحہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ازیں علاوہ اگر حنیف نے آپ سے شادی کے وقت نکاح

نامہ میں ''عقد اول'' لکھوایا ہے تو یہ صورت حال آپ کے لئے مزید سنگین ہو جائے گی۔ ساجدہ کو یہ قانونی حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ آپ کو ایک لمحے میں چلتا کر دے۔ ایسی صورت میں حنیف بھی سزا کا مستوجب ہوگا۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی ''ایسی صورت حال میں، میں کہاں جاؤں؟''

ظاہر ہے، آپ کو اپنے والدین کے پاس جانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یہی تو مصیبت ہے۔'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی حیرت انگیز انکشاف کرنے والی ہے۔ میں نے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری فرزانہ کو ہدایت کی کہ وہ میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دے، چاہے کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو۔

پھر میں چاندنی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میں نے اپنائیت سے پوچھا ''آپ کون سی مصیبت کا ذکر کر رہی ہیں؟''

میرے ہمدردانہ لہجے، مشفقانہ رویے اور دوستانہ انداز نے اسے حوصلہ دیا اور وہ دل کا بوجھ اور ذہن کا غبار میرے سامنے اتار پھینکنے کے لئے تیار ہوگئی۔ اس نے گلوگیر آواز میں مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

چاندنی ایک ایسا چاند تھی جو بدقسمتی سے آسمان کے بجائے زمین پر نکل آیا تھا۔ عسرت زدہ اور غربت کی ماری زندگی نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ اس پر کڑوی، کسیلی اور کنکریلی باتیں ہر لمحہ نیش زنی کرتی رہتی تھیں۔ باپ کی وفات کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ چاندنی کا سوتیلا باپ ایک عیاش طبع شخص تھا۔ شراب، جوا اور دیگر افعال بد اس کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے۔ چاندنی نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس پر پڑنے والی پہلی میلی نگاہ اس کے سوتیلے باپ ہی کی تھی۔ وہ سوتیلے باپ کی ہوس زدہ نظر سے خود کو بچاتی رہی۔ جب سوتیلا باپ اپنے مذموم عزائم میں کسی بھی طور کامیابی حاصل نہ کر سکا تو اس نے پچاس ہزار روپے کے عوض چاندنی کو حنیف کے ہاتھ میں دے دیا۔ بظاہر دنیا والوں کے سامنے حنیف اور چاندنی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے مگر درپردہ یہ ایک ڈیل تھی، چاندنی کے سوتیلے باپ اور حنیف کے درمیان۔ پچاس ہزار روپے کی ڈیل۔

اس موقع پر چاندنی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کچھ عرصہ قبل اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا جو اکثر و بیشتر اسے سوتیلے باپ سے بچاتی رہتی تھی۔ چاندنی نے اس شادی پر یوں بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کہ اس کی دانست میں یہی اس کے لئے راہ نجات تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ ایک کھائی میں گرنے جا رہی تھی اور اس یہ صورت حال تھی کہ اس کی واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور شوہر کے گھر میں اس کا قیام انتہائی ناپائیدار ہو گیا تھا۔

''میں تو ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں پہنچ گئی ہوں۔'' چاندنی نے اپنی داستان پرالم کے اختتام پر کہا۔

میں نے کہا ''آپ ہمت سے کام لیں۔ اگر اس طرح آپ نے حوصلہ ہار دیا تو پھر واقعی آپ کو مصیبت میں گرفتار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

''کیا کروں میں، آپ ہی بتائیں؟'' اس کے سوال میں یاسیت اور مجبوری کا سمندر موجزن تھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''سب سے پہلے تو آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ مجھے اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی ہیں۔''

''میں زبان ہی سے یقین دلا سکتی ہوں۔''

''بس میرے لئے یہی کافی ہے۔'' میں نے کہا ''زبان کی بات سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے اگر زبان دینے والا زبان کا دھنی ہو تو؟''

''آپ مجھے زبان کی دھنی ہی پائیں گے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ''بس ٹھیک ہے۔ پہلے سب سے آپ کو یہ کرنا ہے کہ کسی بھی طور حنیف کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ آپ مجھ سے ملی تھیں یا آپ کا مجھ سے کوئی رابطہ ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے کہا ''دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ نوٹس والا لفافہ جا کر وہیں رکھ دیں جہاں سے آپ نے اٹھایا تھا۔ حنیف کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کو اس نوٹس کی حقیقت اور اہمیت کا علم ہو چکا ہے۔''

وہ فرماں برداری سے بولی ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گی۔''

میں نے کہا ''اور جب تک میں خود نہ بلاؤں، آپ میرے دفتر میں یا عدالت میں مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ انتہائی ضروری گفتگو صرف ٹیلی فون پر ہوگی۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ''ٹیلی فون کی سہولت آپ کے پاس ہے نا؟''

''جی ہاں، ہمارے گھر میں فون موجود ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے مزید کہا ''اس کے علاوہ آپ انتہائی معقولیت کے ساتھ حنیف سے نکاح نامہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کریں گی۔''

''مجھے اس میں کیا دیکھنا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا ''عقد اول یا عقد ثانی وغیرہ کا اندراج۔''

''ٹھیک ہے، یہ میں کر لوں گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی پھر پوچھا ''بالفرض محال، اگر حنیف نے مجھے نکاح نامہ نہ دیا تو پھر کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''میں یہ معلومات نکاح خواں سے براہ راست بھی حاصل کر سکتا ہوں اور اس سے نکاح کی کاپی کے لئے بھی کہہ سکتا ہوں۔ سرکاری رجسٹریشن کے دفتر سے بھی کاپی نکلوائی جا سکتی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ ویسے

آپ مجھے نکاح کی تاریخ اور متعلقہ علاقے کا نام لکھوادیں۔"

چاندنی نے یہ دونوں چیزیں مجھے نوٹ کروادیں پھر سوال کیا "بیگ صاحب! اس ساری تگ ودو میں میرا بھلا کس طرح ہوگا؟"

اس نے ذہانت آمیز سوال کیا تھا۔ میں نے کہا "میں اپنی سی کوشش کروں گا کہ آپ کا آشیانہ آندھیوں کی زد سے محفوظ رہے اور آپ کو دربدر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں اور اس سارے عمل کے لئے مجھے بہت ہی پیچیدہ راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو فی الحال نہ تو آپ کی سمجھ میں آئے گا اور نہ ہی میں آپ کو بتانا مناسب سمجھتا ہوں۔" ایک لمحے کے وقفے کے بعد میں نے کہا "جس طرح میں نے آپ کی زبانی یقین دہانی پر اندھا اعتبار کرتے ہوئے آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے بالکل اسی طرح آپ بھی میری زبان پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھیں۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد دفتر سے رخصت ہوگئی۔

☆......☆......☆

میں نے اپنے طور پر یہ پلان بنایا تھا کہ اس تمام کیس کے اندر سب کے مفاد کا تحفظ کروں گا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ میں اپنی پارٹی اور مخالف پارٹی کے ایک فرد کی خیر خواہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہرحال میری خواہش تھی کہ آفتاب جیلانی، انور خان، شاہد حسین اور ناصر کو اس کی رقم مل جائے۔ ساجدہ کو شوہر اور اس کے بچوں کو باپ مل جائے۔ ازیں علاوہ چاندنی بھی بے یار ومددگار نہ رہے۔ بادی النظر میں یہ ناممکن نظر آتا تھا تاہم میں ایسا ہی چاہتا تھا۔ میری نگاہ میں قصور وار صرف ایک شخص تھا اور وہ تھا حنیف...... اس کو قرار واقعی سزا ملنا چاہئے تھی۔

میں نے چاندنی کے فون کا انتظار نہیں بلکہ اپنے ذرائع استعمال کر کے میں نے معلوم کرلیا کہ حنیف نے چاندنی سے شادی کے وقت نکاح نامے میں "عقد اول" کے الفاظ درج کروائے تھے۔ اس حرکت سے وہ پوری طرح قانونی گرفت میں آسکتا تھا۔

میں نے اسی روز ناصر اور شاہد حسین کو فون کر کے خوش خبری سنا دی کہ بہت جلد ان کی ڈوبی ہوئی رقم سطح فراڈ پر نمودار ہو کر ان کے قدموں میں پہنچنے والی ہے۔ انہیں میری بات کا فوری طور پر یقین نہیں آیا تھا تاہم ان کی خوشی عین فطری تھی۔

چاندنی سے میں ایک نہایت ہی اہم بات پوچھنا بھول گیا تھا۔ اس طرف میرا دھیان بہت بعد میں گیا تھا۔ میں نے اسی روز دن میں کسی وقت چاندنی سے فون پر بات کرنے کے بارے میں سوچا کیونکہ دن کے وقت حنیف گھر میں نہیں ہوتا تھا چنانچہ چاندنی فری ہو کر بات کر سکتی تھی۔

عدالت سے فارغ ہونے کے بعد میں دفتر پہنچا اور سیکرٹری سے چاندنی کا نمبر ملانے کے لئے کہنے ہی والا تھا کہ چاندنی کا فون آ گیا۔

میں نے "ہیلو" کہہ کر ریسیور کان سے لگالیا۔

"بیگ صاحب! میں چاندنی بول رہی ہوں۔ آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"جی، میں پہچان گیا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا پھر پوچھا "اینی پراگریس؟"

چاندنی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ نہ صرف انگریزی پڑھ لیتی تھی بلکہ ہلکے پھلکے جملے بول اور سمجھ بھی لیتی تھی۔

میرے سوال کے جواب میں چاندنی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بتایا "پراگریس تو ابھی کوئی نہیں ہے مگر ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

اس نے بتایا "حنیف گزشتہ رات گھر نہیں آیا۔"

"اوہ!" میں نے گہری سانس خارج کی "کیوں، کیا کل رات یا دن میں کسی وقت کوئی خاص واقعہ پیش آ گیا تھا؟"

وہ بولی "میں گاہے بہ گاہے اس سے نکاح نامے کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ وہ حسب معمول ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن گزشتہ شام کو ہمارے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوگیا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اسے کھری کھری سنا دیں۔ وہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ تم مجھے اور پریشان نہ کرو، ہمارے درمیان خاصی دیر تک بحث وتکرار ہوتی رہی پھر ناراضگی سے گھر سے نکل گیا۔ وہ عام طور پر رات دس بجے تک گھر آ جاتا ہے مگر گزشتہ رات وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ میں نے پوری رات اور آج کا آدھا دن سخت پریشانی میں بسر کیا ہے اور اب آپ کو فون کر رہی ہوں۔ آپ بتائیں، میں کیا کروں؟"

"آپ صرف یہ کریں کہ پریشانی کو خود سے دور بھگا دیں۔" میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا "حنیف خود گیا ہے تو خود ہی واپس بھی آ جائے گا۔ اس کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور رہی بات نکاح نامے والی۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کیا "تو وہ میں نے سب معلومات کروالی ہیں۔ نکاح نامے میں حنیف نے "عقد اول" ہی لکھوایا ہے۔"

"یعنی جھوٹ درجہ اول!" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"بالکل درست۔" میں نے تائید کی۔

اس نے پوچھا "اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "اچھا ہوا، آپ نے فون کرلیا ورنہ میں آپ سے رابطہ کرنے والا تھا۔"

"کیوں، کوئی خاص بات!" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں نے کہا "دراصل اس روز میں ایک نہایت ہی اہم بات پوچھنا بھول گیا تھا اس لئے آپ کو تھوڑی زحمت دینا چاہتا تھا۔"

"غیروں کی طرح باتیں نہ کریں بیگ صاحب۔" وہ اپنائیت سے بولی "میں اب پوری طرح آپ پر انحصار کر رہی ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس عمل کو آپ کی عقل مندی پر محمول کروں گا۔"

وہ بولی ”آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے!“

میں نے پوچھا ”سی کنگ شپنگ کمپنی والوں نے کچھ عرصہ قبل حنیف کو نوکری سے نکال دیا تھا۔ اب آپ لوگوں کا گزارہ کس طرح ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے، اگر انسان فاقے بھی کر رہا ہو پھر بھی فلیٹ کا کرایہ، بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بل تو ادا کرنا ہی پڑتے ہیں۔ کیا حنیف کا کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی بھی ہے؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی ”اس نے کبھی براہ راست تو مجھے کچھ نہیں بتایا مگر جب وہ اپنے دوستوں سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہوتا ہے تو اس یک طرفہ گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق آپ یوں سمجھ لیں کہ حنیف ایک منی بس کا مالک ہے۔ یہ منی بس نارتھ کراچی کے روٹ پر چلتی ہے۔“

”ویری انٹرسٹنگ!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اس کے علاوہ ...... چاندنی بتا رہی تھی“ اس کے علاوہ مجھے یہ سن گن بھی ملی ہے کہ وہ ایک پرائیویٹ سکول بھی چلا رہا ہے۔ بظاہر اس سکول کی رجسٹریشن کسی اور شخص کے نام ہے لیکن درپردہ حنیف ہی اس سکول کا مالک و مختار ہے۔“

”واہ بھئی واہ!“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ”حنیف کی تو پانچوں گھی میں ہیں۔ دنیا کے کسی بھی چپڑاسی نے شاید ہی اتنی ترقی کی ہو!“

”بے ایمانی اور فراڈ سے سب کچھ ممکن ہے۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا ”اس پرائیویٹ سکول کا نام کیا ہے اور وہ کس علاقے میں واقع ہے؟“

”علاقہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ وہ معذور لہجے میں بولی ”تاہم سکول کا نام غالباً ویل فاؤنڈیشن سیکنڈری سکول ہے۔“

”اور بینک بیلنس کے بارے میں آپ کی معلومات کیا ہیں؟“ میں نے مفید ترین کرید جاری رکھی۔

وہ بولی ”اس کا بینک اکاؤنٹ تو ہے مگر اس میں رقم کتنی ہے، یہ میں نہیں جانتی۔“

”آپ نے جتنی حساس معلومات مجھے فراہم کی ہیں اس کے لئے میں آپ کا ازحد شکر گزار ہوں۔“ میں نے ممنون لہجے میں کہا۔

جواب میں اس نے ہر اچھے انسان کی طرح کہا ”یہ تو میرا فرض تھا۔“

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے سلسلہ ٹیلی فونک گفتگو منقطع کر دیا۔

اگلے دو گھنٹے میں ذہنی طور پر بہت مصروف رہا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایک سرگرم متفحص بن گیا تھا۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی یعنی ”بی۔ ایس۔ ای“ کے کنٹرولر آف ایگزامینیشن کا سیکرٹری میرے بہت اچھے تعلق داروں میں تھا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نے متعلقہ شعبے سے معلوم کر کے مجھے بتا دیا کہ ویل فاؤنڈیشن سیکنڈری سکول

کہاں پر واقع تھا اور اس کا رجسٹریشن لیٹر کس شخصیت کے نام ایشو ہوا تھا۔ اسی طرح میں نے ٹرانسپورٹرز یونین کے چیئرمین سے رابطہ کر کے بھی اس بات کی تصدیق کر لی کہ حنیف کی منی بس کون سی تھی اور اس کا روٹ کیا تھا۔ مزید تحقیق کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس بلڈنگ میں ویل فاؤنڈیشن سکول چل رہا تھا وہ بھی حنیف کی ملکیت تھی۔ وہ ایک سو بیس گز پر تعمیر شدہ ایک دومنزلہ عمارت تھی جس کی اس زمانے میں کم از کم قیمت بھی اڑھائی لاکھ تو ہو گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ چاندنی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک جملہ ادھورا بول دیا تھا۔ درحقیقت حنیف کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اللہ اللہ، کیا شان چپڑاسی گانہ پائی تھی اس ”خوش بخت“ نامراد نے!

حنیف کے اثاثوں کے بارے میں جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب ہمارے پہلے کیس کے تن مردہ میں بھی ٹھیک ٹھاک جان آ گئی تھی۔ عدالت حنیف سے یہ سوال کر سکتی تھی کہ اگر اس نے کوئی فراڈ یا دھوکا دہی کا کام نہیں کیا تو پھر اس نے زندگی بھر چپڑاسی کی نوکری کرتے ہوئے یہ مال و جائیداد کس طرح بنا لیا تھا؟

اور اس پیچیدہ سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے دفتر سے اٹھنے سے پہلے فیصلہ کر لیا کہ کل کا دن میں حنیف کے خلاف دستاویزی ثبوت حاصل کرنے میں صرف کروں گا اور اس سے اگلے روز عدالت میں اس کے خلاف باقاعدہ دو مقدمات دائر کر دیئے جائیں گے۔ ایک ساجدہ کی طرف سے اور دوسرا چار متاثرین کی طرف سے۔ میں نے اسی روز شاہد حسین کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ آئندہ روز آفتاب جیلانی اور انور خان کو میرے پاس لے آئے۔ میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

آنے والا دن نہایت ہی اہم تھا۔

☆......☆......☆

اس دن کی اہمیت دن شروع ہونے سے قبل ہی اپنی شکل میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر چکی تھی۔ وہ شام بڑی ہی تہلکہ خیز اور انکشاف انگیز تھی۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر اپنی گاڑی میں گھر جا رہا تھا کہ ایک سگنل پر مجھے رکنا پڑا۔ اسی وقت ایک اخبار فروش بچہ میری گاڑی کے قریب آیا اور شام کا ایک اخبار میری نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

”خطرناک اشتہاری مجرم اور ...... مرڈر کیس کا موسٹ وانٹیڈ اصغر عرف ایٹم بم پولیس مقابلے میں ہلاک!“

اسی وقت سگنل کھل گیا۔ میں نے بچے کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ کر ایک چھوٹا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے پہلی کوشش میں گاڑی کورش سے نکالا اور ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس سنسنی خیز خبر کی تفصیلات پڑھنے لگا۔

خبر کے مطابق، آج دوپہر کے بعد پولیس نے سہراب گوٹھ کے نزدیک واقع ایک عمارت

کے فلیٹ پر دھاوا بولا تھا۔ پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ ایٹم بم اپنے چند بہی خواہوں کے ساتھ اس فلیٹ میں موجود ہے۔ پولیس کی آمد پر ایٹم بم اور اس کے ساتھیوں نے راہ فرار اختیار کی۔ پولیس نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی جواب میں پولیس کو بھی فائرنگ کرنا پڑی جس کے نتیجے میں ایٹم بم اور اس کا ایک ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ دو ساتھیوں نے شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ دیا۔ ہلاک ہونے والے ایٹم بم کے ساتھیوں کے نام کچھ اس طرح تھے۔ جاوید احمد، نظیر اقبال اور حنیف ٹرانسپورٹر۔ نیچے ان چاروں کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ حنیف کی تصویر کو دیکھتے ہی میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ساجدہ کا شوہر حنیف فراڈیا ہی تھا۔

میں نے اخبار کی لوح پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا، وہ ایک معروف شام کے اخبار کا ضمیمہ تھا جو ہنگامی بنیاد پر شائع کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کے واقعات کی تفصیل میں آپ کے لئے کوئی دلچسپی کی بات نہیں ہو گی اس لئے میں بھی واقعات کو سمیٹتے ہوئے آپ کو اس پیچ در پیچ کہانی کے انجام سے آگاہ کرتا ہوں۔

حنیف کی موت کے بعد اس کے مال و دولت اور جائیداد کی قانونی حق دار اس کی بیوی ساجدہ اور بچوں کو قرار دیا گیا تھا۔ حنیف کے بینک اکاؤنٹ میں لگ بھگ دو لاکھ چالیس ہزار روپے کا سراغ ملا تھا۔ ایسے مواقع پر عموماً انسان خود غرض ہو جاتا ہے مگر حیرت انگیز طور پر ساجدہ نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔ چار متاثرین کا ''معاملہ'' اس کے علم میں تھا۔ میں نے تفصیلاً چاندنی کے بارے میں بھی اسے بتا دیا۔ وہ صابر و شاکر عورت کسی سمندر کی گہرائی اپنے دل میں رکھتی تھی اور اسی حساب سے اس کا دامن بھی طویل و عریض تھا۔ اس نازک مرحلے پر اس نے عجیب و غریب فیصلہ کیا۔

اس نے اپنی رضامندی اور خوشی سے چاروں متاثرین کو ان کی ڈوبی ہوئی رقم واپس کی۔ چاندنی کو اپنی چھوٹی بہن مان کر ویل فاؤنڈیشن سیکنڈری سکول والی عمارت اس کے نام لگا دی اور اپنے لئے صرف ایک منی بس رکھی۔ اس منی بس کے چاروں پہیوں کی گردش نے ایک سال کے اندر اندر ساجدہ کو دو منی بسوں کا مالک بنا دیا اور جب تک مجھے اس کے حالات کا علم ہوتا رہا، وہ پانچ منی بسوں کی مالک بن چکی تھی جو کراچی شہر کی مختلف سڑکوں پر اٹھارہ گھنٹے روزانہ چکرائی رہتی تھیں۔

ساجدہ کی اس بے بہا ترقی میں اس کے بندہ پرور عمل کا بھی دخل واضح ہے۔ جو شخص خدا کے بندوں کا خیال رکھتا ہے، خدا اسے ضرور نوازتا ہے، دیر اور سویر کی بات الگ ہے۔ خدا بندے پر نوازشات کرتے وقت اس کے ظرف کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

ایک وہ بھی بندہ خدا تھا جس نے دونوں ہاتھوں سے خدا کے بندوں کو لوٹا اور بالآخر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا۔ حرام موت مرنا اسی کو کہتے ہیں۔

تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حنیف کی موت بہت سے انسانوں کی زندگی سنوار گئی۔ مرگ مفید اسی کو کہتے ہیں!

☆......☆......☆